''چہارسُو''

..... مدینۃ الاولیا .....

(اُوچ شریف)

علم وادب ہو یا صحافت، تصوف ہو یا روحانیت، پبلشنگ ہو یا قلم قبیلے کی قیادت ایک نام اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ چہار سو ضوفشاں دکھائی دے گا۔ جی ہاں آپ درست سمجھے یہ صاحب تصوف وصاحب شریعت وطریقت پی ایچ ڈی کی دستارِ فضیلت کے حامل ''مردِ حر'' ڈاکٹر فہیم رضا کاظمی الچشتی جیسی قد آور شخصیت کا ہے جنہوں نے تصوف کی قبا پہنے شریعت وطریقت کی روشنی سے اپنے قلب وذہن کو اس طرح منور کر رکھا ہے کہ ان کے قرطاس کا ہر ہر لفظ عشق اللہ ورسولؐ اور اہلِ بیت اطہار کی محبت سے معمور ہر عاشق محمدؐ وآل محمدؐ کے ایمان کے لیے پیام راحت اور ایسا نغمہ سرمدی بن جاتا ہے کہ وہ خود بھی ''ھو'' کے نعرہ مستانہ میں کھو کر کشف کی راہوں کا راہی بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر فہیم کاظمی جیسے سپوت اپنی دھرتی، روایات، تاریخ اور ثقافت سے عشق کی حد تک محبت کی رعنائیوں کو نکھار دے کر دھرتی پہ امن، علم وآشتی اور انسانیت سے محبت کا قرض ادا کر رہے ہیں۔ ''مدینۃ الاولیاء اوچ شریف'' اسی قرض کی قسط کا حصہ ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ محمدؐ وآل محمدؐ اور روحانی بزرگوں کے تصدق سے تمام قسطوں کی بخیر وخوبی ادائیگی کے اہل ہو کے تصوف کے آسمان پر ضیا بار رہیں۔

..... ایم زید کنول

قیمت: ۶۰۰ روپے،، دستیابی: تہذیب انٹرنیشنل پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

..... رعنائی .....

خالد مسعود کا پہلا شعری مجموعہ ''رعنائی'' قدرے تاخیر سے شائع ہوا ہے لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس میں رعنائی موجود ہے۔ ان کی غزل کی جڑیں روایت سے نمو حاصل کرتی ہیں اس لیے ان میں تازگی اور شگفتگی ہے۔ خالد مسعود سے اگرچہ میری ایک بھی ملاقات نہیں اور نہ ہی اس سے قبل کوئی تعارف ہے لیکن ایک تخلیق کار کا سب سے اچھا تعارف اُس کی تخلیق ہوا کرتی ہے۔ اس شعری مجموعے کی وساطت سے میں نے خالد مسعود سے ملاقات کی ہے۔ اُس کے اندر کے موسموں کی مجھے خبر ہوئی ہے۔ شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے اور اس سفر میں قاری ہمیشہ شاعر کے ساتھ رہتا ہے۔ خالد مسعود نے غزل کو اہتمام اور سلیقے کے ساتھ لکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ روایتی غزل کی چاشنی اپنے اندر سموئے ہوئے اُن کی شاعری غزل سے محبت کرنے والوں کو ضرور پسند آئے گی۔ اُن کی شاعری پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ زندگی کا گہرا شعور اور تجربہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس کی جھلک اُن کی شاعری میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ میری تو خالد مسعود کے لیے یہی دعا ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

.....عطاء الحق قاسمی

قیمت: ۳۰۰، دستیابی: نستعلیق مطبوعات، اردو بازار، لاہور۔

..... روز بناتا ہوں پُل .....

پروفیسر ڈاکٹر عتیق احمد جیلانی کی شاعری کی عمر پینتالیس برسوں سے زیادہ ہے ان کا پہلا مجموعہ ۲۰۱۹ء میں حیدر آباد سندھ سے منظر عام پر آیا۔ غزل کا حسن اور کامیابی یہ ہے کہ اُس نے ماضی سے لے کر حال تک کے زمانے کے تقاضوں کو خوبی سے اپنایا اور نبھایا ہے اور اگر فنکار بڑا ہو اور فنی لوازمات سے مکمل آگاہی رکھتا ہو تو سونے پر سہاگے والی بات ہے۔ عتیق احمد جیلانی موجودہ عہد کی غزل کے امتزاج سے بھی واقف ہیں اُن کے کلام میں جدید غزل کے کئی اشعار مطالعے میں آتے ہیں مگر جس طرح اُن کی غزل، غزلِ قدیم کی داخلیت سے دور ہے اسی طرح اُن کی غزل، جدید غزل کی خارجیت سے محفوظ ہے اُن کی غزل میں تفکر بھی ہے اور تغزل بھی۔

روز بناتا ہوں پُل، دریا پار نہیں کرتا میں رستے اپنی خاطر ہموار نہیں کرتا

.....نوید سروش

قیمت: ۲۰۰، دستیابی: بلاک 350 ڈی، لطیف آباد نمبر 10، حیدر آباد۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۸،شمارہ:جولائی،اگست ۲۰۱۹ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرمسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِسالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:537/D-1‘ گلی نمبر18، ویسٹریج-III‘راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

عطرِ سخن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انوار شریف	۵
پیغمبری گھرانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق	۶
عروسِ جمیل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیصل عظیم	۷
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید	۱۳
آوارۂ شب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا	۲۱
کسی مے خوار کا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔افسر ماہ پوری	۲۵
کہنگی کھا چکی صحیفے کو۔۔۔۔۔۔پروفیسر ممتاز حسین	۲۶
تاروں کو چھونے کی ہوس۔۔۔۔۔۔۔محمود واجد	۲۹
''بے نشان'' آئینہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انور سدید	۳۲
شاعر آبلہ پا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اکرام بریلوی	۳۴
نشانِ بے نشانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حنیف فوق	۴۱
روح کی بے سمت راہیں۔۔۔۔۔۔محمد علی صدیقی	۴۴
زخم جتنے آشنائی کے لگے۔۔۔۔۔۔۔منظر علی خان	۴۷
اُم القریٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی	۵۱
ترقی پسند تحریک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاہین	۵۵

دلِ شادکام

نسیمِ سحر، اسد عباس خان	۵۷

افسانے

برگِ آوارہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انل ٹھکر	۵۸
اونچے نیچے لوگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا اصغر	۶۳
بازار کا بُت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔طاہرہ اقبال	۶۵
بامشقت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد بشیر مالیر کوٹلوی	۶۹
نمازِ قصر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد حامد سراج	۷۱
جشنِ بیقراری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید	۷۲

عیدِ خمستاں

شکیب جلالی، یونس شرر، ڈاکٹر ریاض احمد، اختر شاہجہاں پوری، آصف ثاقب، محمود شام، قیصر نجفی، نبیل احمد نبیل۔	۷۶

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ	۸۰

ابرِ نوبہار

ترجمانی کا فن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ظفر قریشی	۸۶

حادثوں کی داستان

رضیہ اسماعیل، عرش صہبائی، شگفتہ نازلی، عارف شفیق، سبھاش گپتا، وشال کھلر، اشرف جاوید، ثاقب تبسم، رفیع الدین ذکی، رئیس صدیقی، رومانہ رومی۔	۹۶

آئینۂ فن

پوسٹ ماڈرن درویش۔۔۔۔۔۔جمیل احمد عدیل	۱۰۰
افسانے کا درخشاں دور۔۔۔۔۔۔۔سیمیں کرن	۱۰۳

نشانِ راہ

ایک سپنے کا انت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مشرف عالم ذوقی	۱۰۶

وقت کی گردش

خلیل جبران، پروین شیر، علی محمد فرشی، جہانگیر اشرف، حافظ محمد احمد، محمد اقبال بھٹی۔	۱۰۷

زندگی نایاب ہے

ایملائی ڈوسس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم	۱۱۱

بساطِ بشاشت

مزاح کا ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔۔۔۔۔۔معین قریشی	۱۱۳

ایک صدی کا قصہ

مکیش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول	۱۱۵

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہہ الوقار	۱۱۹

— ☆ —

○●○

قرطاسِ اعزاز
شاہینؔ
کے نام

○

ہائے یہ بے سروسامانی و بے ترتیبی
زندگی کیا کسی مے خوار کا گھر ہے، اے دوست

تم تو وطن میں رہ کے بھی کہلائے اجنبی
اس اجنبی دیار میں کیوں آئے اجنبی

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں در نہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

شبابِ لالہ و نسریں فگار ہے ساقی
بہار اب کے فریبِ بہار ہے ساقی

غرق ہو جاتی ہے ساحل پہ بھی کشتی لیکن
ڈوبتوں کے لیے تنکے کا سہارا کافی

شب تاریک میں بھٹکے ہوئے راہی کے لیے
دُور آکاش پہ اک زرد ستارہ کافی

اس قدر عام ہوئی شہر میں خون پیرہنی
نظر آتے نہیں بے داغ لبادے اب تو

بدن اک سبق تھا حیات کا جسے سیکھ کر میں گزر گیا
کئی اور ایسے مقام تھے کہ سراغ جن کا لگائیے

وہ دن تھے مشقت کے، اب آوارۂ شب ہوں
شرطوں کا روادار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں

ملے تو گردِ سفر تھی بدن پہ دونوں کے
وہ گرد تجھ کو بھی زنجیر ہوگئی ہوگی

نہ صرف یہ کہ پڑا ہوگا کال نگری میں
حویلیاں بھی سِرے سے اجڑ چکی ہونگی

اپنا دکھ تو اکیلے جھیلنا ہوتا ہے
غم خواروں میں تھوڑا جی بہلا لیں گے

یہاں کوئی کسی کو جاننے کا دکھ نہیں سہتا
سو خود سے بھی مکر جانے کا وعدہ کرلیا میں نے

میں کیوں کرتا رہوں شاہین پھر قبلہ درست اپنا
کہ جب الزام سارا کج کلاہی پر لیا میں نے

ملتا ہے تو بڑھ جاتی ہے جینے کی کشش اور
وہ شخص کہ تصویر سے باہر ہے زیادہ

بڑی سُرخیوں کے وہی اہل ہیں
خبر جن کی رکھتے ہیں اخبار کم

شاید اس بہانے بن آئے بات اپنی
کچھ اور تیز ہو جا اے گردشِ زمانہ

دیکھی ہے اُس آنکھ سے لپٹی ہم نے اکثر گردِ ملال
گردش میں جھوٹے یہ قصے سارے جفا و جور کے ہیں

عطرِ سخن: انوار شریف (لاہور)

پیغمبری گھرانہ

محمد انعام الحق
(اسلام آباد)

نام: سید ولی عالم
ادبی نام: شاہین (۱۹۶۹ء سے پہلے شاہین غازی پوری)
والد کا نام: میر نوید علی
والدہ کا نام: بشیر النساء
پیدائش: ۱۱ر جنوری ۱۹۳۸ء (میٹرک کی سند کے مطابق) اصل تاریخ اندازاً دو برس بعد یعنی ۱۹۴۰ء کی رہی ہوگی۔ غازی پور، ضلع مونگیر، بہار، انڈیا
شریکِ حیات: روشن آرا (بنت سید عبدالرزّاق و عظیم النساء)
اولادیں: فیصل میر شاہین اور کیفی سید شاہین، صائمہ شاہین، نغمہ شاہین

یہ ایک الگ قصہ ہے۔ ہوا یوں کہ شاہین صاحب نے چار برس میں اسکول کی آٹھ جماعتیں مکمل کر لی تھیں۔ گیارہویں جماعت کے بعد بہار سیکنڈری اسکول اگزامی نیشن بورڈ کا صوبائی امتحان ہونا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے اوائل میں شاہین صاحب کم عمری کے باعث جوان کی شکل وصورت سے بھی ظاہر تھی۔ اُن کے ایک استاد نے شاہین صاحب کو آگاہ کیا کہ امتحان میں اُن کی شمولیت ممکن نہیں۔ شاہین صاحب نے رونا دھونا شروع کر دیا اس لئے بھی کہ وہ اپنی جماعت کے سب سے اچھے طالب علم تھے۔ استاد کو رحم آ گیا۔ چنانچہ وہ بولے کہ ایک ہی ''اُپائے'' ہے اور تھوڑی دیر حساب کتاب کرتے رہے، پھر تاریخِ پیدائش کے خانے میں خالی جگہ پر انہوں نے ۱۱ر جنوری ۱۹۳۸ء کی تاریخ لکھ دی۔

علمی گزرگاہیں:

لوئر پرائمری اسکول، غازی پور، مڈل اسکول، تاراپور، اسلامیہ ہائی اسکول، سمری بختیار پور، آدرش ودیالیہ، تاراپور (میٹرک)۔ بہار سیکنڈری اسکول بورڈ۔ ۱۹۵۳ء، ٹی این جے (اب ٹی این بی) کالج، بھاگل پور، (آئی ایس سی، بی ایس سی) ۱۹۵۷ء، پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اِسٹے ٹِس ٹِکس (Postgraduate Dept of Statistics) بھاگلپور، بہار یونیورسیٹی (ایم ایس سی۔ شماریات) ۱۹۶۰ء، کارلٹن یونیورسیٹی، آٹوا، کینیڈا (Carleton Univ. Ottawa, Canada)، ایم ایس سی، شماریات (M. Sc. Statistics) ۱۹۷۷ء

معاش:

لکچرر، شعبۂ شماریات، ماروا ڑی کالج، بھاگل پور۔ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۴ء
معاون ماہر شماریات، پاکستان ٹی بورڈ، ڈھاکا۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء
سربراہ، شعبۂ شماریات، آدم جی جوٹ ملز لمیٹیڈ، ڈھاکا۔ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۱ء
اسسٹنٹ ڈائرکٹر، مناپلی کنٹرول اتھارٹی، اسلام آباد۔ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۳ء
بعد ازاں بیس برس تک مرکزی حکومت کینیڈا میں مختلف منصبی فرائض انجام دئے۔ وزارتِ نقل وحمل (ٹرانسپورٹ کینیڈا) سے بحیثیت پالیسی ایڈوائزر (Policy Advisor) سبک دوشی حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء تا ۱۹۹۴ء

شعری مجموعے

رگِ ساز/ بے نشان/ دہلیز پر پھول/ کھلا دروازہ/ پھٹارہ/ شب نشین/ زیرِ داغ

زیرِ اشاعت

چند نثری تصانیف/ مشاہیر کے خطوط/ کلیات اور انتخاب/ ادارتی وابستگیاں
مدیر اردو کینیڈا (Urdu Canada انگریزی زبان کا رسالہ)
رکن، مجلسِ ادارت، انگریزی رسالہ پاسی بی لی ٹیز (Possibilitiis)

اعزازات وانعامات

دئے ہوئے عنوان ''دولت'' پر صوبائی سطح کے مقابلے میں اول آنے والی نظم پر صوبائی وزیر کے ہاتھوں وصول کردہ لی کپ (Lee Cup) انعام۔ ۱۹۵۴ء
الطاف حسین حالی عالمی اردو انعام۔ دہلی۔ ۱۹۸۸ء
گہوارۂ ادب انعام، گورنر سندھ، پاکستان۔ ۲۰۰۳ء
کینیڈا پاکستان ایسوسی ایشن انعام۔ آٹوا۔ ۲۰۰۶ء
اتر پردیش ہندی اردو ساہتیہ انعام، لکھنو۔ ۲۰۰۹ء
انڈین کلچرل سوسائٹی، دہلی۔ میر تقی میر انعام۔ ۲۰۰۹ء
سی پی اے انعام برائے غیر معمولی ادبی خدمات۔ آٹوا۔ ۲۰۱۵ء
نیشنل فیڈریشن آف پاکستانی کینیڈینز انعام برائے کمیونیٹی کی گراں بہا بے لوث خدمات۔ آٹوا۔ ۲۰۱۸ء

تحقیق

شاہین کی شاعری پر پی ایچ ڈی کا تحقیقاتی مقالہ
مئی ۲۰۱۷ء میں ہزاری باغ، جھارکھنڈ، ہندوستان، کی ونوبا بھاوے یونیورسیٹی نے محمد منصور عالم فخری کو اُن کے تھیسس ''شاہین کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔

تراجم:

Dreams and Destinations: Shaheen and his poetry, edited with an introduction by Nuzrat Yar Khan (ISBN 0-9692782-0-9).

شاہین کی چند نظموں کے ہسپانوی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مرتبہ:

Across Continents (articles on Urdu in Canada), edited by W. A. Shaheen, et al.

''عروسِ جمیل''

فیصل عظیم
(کینیڈا)

۳۔اپریل ۱۹۷۸ء، دہلی۔

محبّ گرامی قدر شاہین صاحب، تسلیم۔

الطاف نامہ فروری میں موصول ہوا تھا، اسی زمانے میں سویت یونین سے دعوت نامہ موصول ہوا اور میں ماسکوہ بین الاقوامی فورم برائے تخفیف اسلحہ میں شرکت کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں سے تاشقند، سمرقند، بخارا، فرمانہ۔۔۔سنٹرل ایشیا جا کر تو صدیوں پہلے کی ثقافت کے منظر آنکھوں میں گھوم گئے۔Dreams & Destinations نظرت یار خاں نے کیا خوب شائع کی ہے۔ان کا تعارف بھی دیکھا۔فاروق حسن صاحب کا مضمون اور صہبا صاحب کا مضمون دقیع ہیں۔سولہ سترہ حضرات کے تراجم اور اصل نظمیں غزلیں بھی۔ غالباً یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو ایک شاعر کے بارے میں کینیڈا سے شائع ہوئی ہے۔ طباعت اور پیشکش ایسی کہ عروسِ جمیل در لباسِ حریر کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔آپ کی شاعری کی داد پہلے دے چکا ہوں۔اس نے دردِ دل بھی بیان کیا ہے اور خوابوں کی زباں میں اظہار کا حق بھی ادا کیا ہے۔اب انگریزی والے اصحاب بھی لطف اندوز ہو سکیں گے۔سب ساتھیوں سے مبارک باد کہیے۔

آپ نے میرے پروگرام کے بارے میں معلوم فرمایا ہے۔شکاگو کی امیر خسرو کانفرنس ۲۸۔مئی کو ہے۔ میں اس لیے ۲۔جون سے ۹۔جون تک کا پروگرام رکھ رہا ہوں۔گیارہ کو لاس اینجلس والوں نے تاریخ مقرر کر دی ہے۔آپ اور بیدار بخت اور اشفاق صاحب جیسا چاہیں پروگرام طے کر دیں۔آپ سے ملاقات ضروری ہے۔Urdu Canada کے لیے ایک خاص مضمون بھی ساتھ لاؤں گا۔ یا تو آپ ٹورنٹو زحمت فرمائیں یا میں Ottawa حاضر ہو جاؤں گا۔ فاروق سے ملنے کو جی چاہتا ہے لیکن وہ تو مانٹریال میں ہیں۔میرا اسلام کہیے گا۔

میں وسط مئی کے لگ بھگ دہلی سے پہلے لندن جاؤں گا۔وہاں میرا قیام افتخار عارف کے یہاں ہوگا۔امید ہے کہ آپ کا خط مجھے اپریل ہی میں دہلی میں مل جائے گا۔کینیڈا کی ڈاک کا اندازہ ہے دس بارہ دن معمولی بات ہے۔

گوپی چند نارنگ

۳۔دسمبر ۱۹۹۲ء، لاہور۔

محبّ عزیز، سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔اس نوازش کا دلی شکریہ۔آپ کا چار سال کا چندہ فنون کے دفتر میں جمع کرا دیا ہے اور نوٹ بھی کرا دیا ہے کہ یہ چار سال پر محیط ہے۔ اگر بعض قریبی احباب میں سے چند حضرات کو آپ فنون کی خریداری پر آمادہ کر سکیں تو یہ فنون کو زندہ رکھنے کا ایک مثبت طریقہ ہوگا۔زحمت کی معذرت۔

آپ کا خوبصورت اور بھرپور کلام آئندہ فنون (فنون نمبر ۳۷) میں آ رہا ہے۔فنون نمبر ۳۶۔اختر حسین جعفری مرحوم کے لیے وقف ہے مگر نمبر ۳۷ بھی اس کے ساتھ ہی شائع ہوگا۔

آپ کا انگریزی مضمون بہت معلومات افزا ہے۔ میں نے یہاں ڈیلی ''نیوز'' والوں کو دیا ہے۔اگر چھاپ دیں تو سبحان اللہ ورنہ ''نیشن'' میں دینے کی کوشش کروں گا۔ایسے مضامین پاکستان میں شائع ہوتے رہیں تو ہم اپنے وطن سے دور بسنے والے ہموطنوں کے بارے میں باخبر رہتے اور خوش ہوتے ہیں۔

اوٹوا میں قیام کے دوران آپ نے جس محبت اور والہیت سے میری مدارت کی اور آپ کے پورے خاندان نے جس اپنائیت کے ساتھ خود کو میرے علاوہ دوسرے شعراء کی خاطر داری کے لیے وقف کر دیا وہ میری یادوں کا سرمایہ ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش، مطمئن اور آسودہ رکھے۔

احمد ندیم قاسمی

۱۴۔اپریل ۱۹۸۶ء، الٰہ آباد، بھارت۔

برادرم شاہین صاحب، السلام علیکم۔

آج آپ کا خط اور ''اردو کینیڈا'' کا پہلا شمارہ ملا۔اس کرم کے لیے ممنون ہوں۔ پرچہ بہت خوب صورت ہے۔مبارک ہو۔دعا ہے اس کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی اہم خدمات انجام پائیں۔

گستاخی نہ ہو تو یہ عرض کروں کہ پرچہ جس قدر خوبصورت ہے مشمولات اُس پائے کے نہیں ہیں۔سردار جعفری کا مضمون (انگریزی کے اغلاط کے علاوہ طرح طرح کے Half Truths اور Prejudices اور Uncritical بیانات سے بھرا ہوا ہے۔جن صاحب نے غالب پر لکھا ہے انہیں غالب کی شاعری اور زندگی کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں بلکہ بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔شاعری کے تراجم البتہ اچھے ہیں۔یقین ہے کہ اگلا پرچہ اور بھی بہتر ہوگا۔مجھ سے جو ہو سکا اس کے لیے کروں گا۔میں اگلے مہینے چند ہفتوں کے لیے India Poetry Festival کے سلسلے میں USA آ رہا ہوں۔ Canada آنے کا موقع شاید نہ مل سکے۔پھر بھی کوشش کروں گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

۱۰۔مئی ۱۹۸۶ء، کراچی۔

محترمی شاہین صاحب، سلام مسنون۔

''اردو کینیڈا'' کا پہلا شمارہ موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ زبان و ادب کو روشناس کرانے کے لیے یقیناً یہ ایک بہت موثر جریدہ ہے۔ میں اس رسالے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میرے لائق جو بھی خدمت ہو آپ بلا تکلف لکھئے۔ حال ہی میں میرے دو تنقیدی مضامین کے مجموعے ''نئی تنقید'' اور ''ادب کلچر اور مسائل'' شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ''ن۔م۔راشد۔ ایک مطالعہ'' کے نام سے بھی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔

نیا دور کے لیے بھی آپ لکھئے جب آپ ڈھاکہ میں تھے تو آپ کی تخلیقات نیا دور میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ''اردو کینیڈا'' دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ برسوں سے میری بھی یہ تمنا تھی۔

جمیل جالبی

۹۔جنوری ۱۹۹۳ء، سرگودھا۔

برادرم شاہین صاحب، السلام علیکم۔

آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپ نے اوراق کا جو چندہ بھیجا ہے وہ میں نے دفتر اوراق کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ آپ کی ''اوراق'' سے محبت ہے جس کے زیر اثر آپ نے یہ تکلف کیا ورنہ ''اوراق'' پر ویسے بھی آپ کا حق ہے۔

دہلی میں ملاقات بہت تشنہ رہی۔ آپ کی شخصیت اتنی دلکش ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کئی روز آپ کی معیت میں بسر کیے جائیں۔ پاکستان آنے کا کوئی پروگرام بنائیں اور میرے پاس ٹھہریں مجھے بہت خوشی ہوگی۔

پچھلے دنوں میں نے اپنی اردو نظم ''اک کتھا انوکھی'' کا خود ہی انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ نظم آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ اگر اچھی لگے تو اس پر ''اردو کینیڈا'' میں تبصرہ کر دیں اگر پوری نظم شائع کر دیں تو کیا بات ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ نظم ایسی ہے کہ دُور دُور تک پہنچنی چاہیے۔

اسلام آباد سے ادبیات پاکستان والوں نے بھی ایک انگریزی رسالہ شائع کیا ہے مگر اس پر ایک خاص ادبی گروپ کا قبضہ ہے لہٰذا یہ پاکستانی ادب کی پوری نمائندگی نہیں کر رہا۔ آپ کا پرچہ ایک غیر جانبدار ادبی مجلّہ ہے۔ لہٰذا لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر ہے۔

وزیر آغا

۲۸۔جنوری ۲۰۰۰ء، نئی دہلی۔

شاہین صاحب قبلہ۔ السلام علیکم۔

میں اُس وقت بھی آپ کا انتظار کرتا رہا جب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ نہیں آ رہے ہیں۔ سوچا تھا کہ شاید آخری وقت میں کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ آپ دہلی آ جائیں مگر میری قسمت میں آپ سے ملاقات نہیں تھی۔

آپ اپنا مقالہ ارسال فرما دیجیے۔ سیمینار میں اسّی مقالوں کی تلخیصیں پڑھی گئی تھیں۔ ان تلخیصوں پر جو بحث ہوئی تھی اُس کی روشنی میں مقالہ نگار اپنے مقالوں پر نظر ثانی کر کے ہمیں بھیجیں گے جنہیں ہم کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ مقالے دو یا تین جلدوں میں شائع ہوں گے۔

میری درخواست ہے کہ آپ یہ خیال رکھیں کہ آپ کے مقالے میں کینیڈا کے پورے ادبی منظر نامے کا احاطہ ہو جائے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ اردو شاعری، اردو نثر، مختلف موضوعات پر کتابیں، مشاعرے، سیمینار، اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کا انتظام۔ غرض ان تمام پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ معلومات ضرور فراہم کیجیے۔ میں نے آپ کا یہ کام بڑھا دیا ہے۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ آپ اپنے مقالے میں ان تمام چیزوں کا ضرور خیال رکھیں گے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز آپ کو سلام کہتے ہیں۔

میں نے آپ کے لیے اپنے گھر میں ایک کمرہ تیار کیا تھا۔ کوشش کی تھی کہ اُس کمرے میں تمام سہولیات فراہم ہو جائیں۔ یہ اُس کمرے کی بدنصیبی ہے کہ وہ آپ کے قدموں سے محروم رہا۔ میری بیوی پچھلے سال کینیڈا گئی تھیں وہاں انہوں نے کئی یونی ورسٹیوں میں لیکچر دیے تھے۔ اُن کا اصل مقصد کینیڈا کی عورتوں کی اسٹڈی تھا۔ تین مہینے وہاں رہیں۔ وہ آپ کو سلام کہتی ہیں۔

خلیق انجم

۲۹۔دسمبر ۱۹۸۶ء، ساؤتھ ایشیا۔

برادرم شاہین صاحب، تسلیمات۔

آج آپ کا خط اور ''اردو کینیڈا'' دونوں ملے۔ شکریہ۔ پڑھ کر افسوس ہوا کہ آپ سفر سے واپسی کے بعد علیل ہو گئے اور اس کی مسرت کہ اب بفضلِ خدا تندرست ہیں۔ آپ نے حسن منظر صاحب کا خاطر خواہ نوٹس نہ لیے جانے کا ذکر کیا ہے۔ میں اس سے بالکل متفق ہوں۔ بے پناہ ذہین آدمی ہیں اور ان کے یہاں تجربے کی وسعت کے ساتھ ساتھ اظہار کی جو شگفتگی ہے اس کی نظیر جدید اردو فکشن میں کم کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کے حوالے سے جو عدم التفات پایا جاتا ہے اس کے تدارک کی ایک سبیل ہے۔ سنیے:

ایک عرصہ ہوا میں جدید اردو افسانے کے انگریزی انتخاب کی طرف راغب ہوا تھا۔ چار پانچ ماہ ہوئے کتاب تیار کر لی تھی لیکن اردو کی چیزوں سے جو عام طور دلچسپی یہاں کے اشاعتی اداروں میں ملتی ہے اس سے حوصلہ جاتا رہا۔ اس اہتمام کے لیے میں نے حسن منظر کی کئی کہانیوں کا ترجمہ کیا تھا اور ایک کا فاروق حسن سے بھی کروایا تھا۔ جن کہانیوں کا ترجمہ ہو گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے (۱) بوندا باندی (۲) کالیا، دیوی کا گھرانہ (۳) بیچارے (۴) رہائی (۵) سفید آدمی کی دنیا۔

اگر آپ چاہیں تو یہ ''اردو کینیڈا'' کا ایک خاص نمبر حسن منظر پر نکالا جا سکتا ہے اور میں اسے گیسٹ ایڈیٹ کر سکتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو دو ایک ترجمے اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اور ان کہانیوں پر ایک مضمون محمد سلیم الرحمٰن سے لکھوایا جا سکتا ہے۔

دوسری تجویز یہ ہو سکتی ہے کہ اگر رسالہ کے علاوہ کتابوں کی اشاعت بھی آپ کے پروگرام میں شامل ہو تو اُن کے تراجم پر مشتمل ایک مختصی سی کتاب چھاپ دی جائے۔ بہرحال یہ دو تجاویز حاضر ہیں۔ آپ ان کے بارے میں غور کیجیے گا اور پھر مجھے بتائیے گا کہ آپ کی کیا صواب دید رہی۔

ایک شرط ہے: اگر یہ تجاویز آپ کے لیے قابل عمل ہوں تو مسودے کی Proof Reading میں ہی کروں گا۔

میں کوشش کروں گا کہ وقتاً فوقتاً اور چیزیں بھی آپ کو بھیجتا رہوں۔ پچھلے دنوں میرے ایک طالب علم نے میرے ساتھ انتظار حسین کے ناول ''بستی'' کے ایک جزو کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ حصہ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں بندروں کی حرکات کا بیان ہوا ہے۔ اور یہ ایسے میں مکمل بھی ہے۔ یعنی اسے ناول سے علیحدہ بھی چھاپا جا سکتا ہے۔ کبھی بھجواؤں گا۔

عمر میمن

۱۴۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء، نئی دہلی۔

برادر عزیز شاہین، خوش رہیے!

''اردو کینیڈا نمبر ۲'' تین چار دن پہلے ملا۔ آپ نے اپنی لگن، ذہانت اور ویژن سے دو شماروں میں ہی رسالے کو اتنا اچھا بنا دیا ہے کہ جو بھی اسے دیکھتا ہے بے اختیار تعریف کرنے لگتا ہے۔ مغرب کو اردو ادب سے متعارف کروانے اور بڑی سبک انگریزی میں اس کی ہمہ جہت ذمہ دارانہ پیش کش کے لیے ایک ایسے رسالے کی ایک مدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ خدا آپ کی اس ''دیوانگی'' کے اسباب بنائے رکھے اور آپ اسی مانند، اپنی یہ نہایت اہم خدمت انجام دیتے رہیں۔۔۔ میں ''انڈین لٹریچر'' کے ایڈیٹر سے آج کل ہی میں فون پر بات کروں گا۔ کرشنا جب سے لوٹی ہے آپ کے یہاں اپنے قیام کا کئی بار ذکر کر چکی ہے اور آپ کی اور بھابی کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتی۔ یہ خبر ہمارے لیے نہایت مسرت بخش ہے کہ آپ لوگ نومبر میں یہاں آ رہے ہیں۔ ضرور آیئے اور دہلی میں قیام کے دوران ہمارے ساتھ رہیے۔ اگر آپ اپنے پروگرام کی تفصیل لکھ بھیجیں تو میں بڑے شوق سے انتظار کروں گا۔

راجندر سنگھ بیدی کا آج پٹیالہ سے خط ملا ہے۔ انہیں بھی ''اردو کینیڈا'' مل گیا ہے۔ رسالے کے تعلق سے انہوں نے نہایت گرمجوش اور محبت آمیز رائے لکھی ہے۔ گذشتہ دو تین ماہ مجھ سے کوئی تخلیقی کام انجام نہ ہو پایا، ایک عجیب سی ذہنی انتشار کا احساس رہا۔ اب تین چار ہفتوں سے کہانیوں نے پھر تانک جھانک شروع کی ہے تو جان میں جان آئی ہے۔ ایک پوری کر چکا ہوں اور اسے کشور ناہید کی دعوت پر ''ماہِ نو'' کے لیے بھیجا ہے۔ اب ایک اور کے ساتھ بھی کواڑ شروع ہے چند دن میں ہو ہی جائے گی۔

جوگندر پال

۲۵۔ جنوری ۱۹۹۳ء، لاہور۔

برادرم شاہین صاحب، السلام علیکم۔

غیر متوقع طور پر آپ کا خط ملا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں یاد تو رکھا۔ آپ کی مصروفیات یقیناً بہت ہوں گی مگر انہیں اتنی بھی نہ بڑھائیں کہ محبت کے رشتے ہی فراموش ہو جائیں۔ دنیا جس قدر بڑی ہوتی جاتی ہے ذات اس قدر سکڑتی چلی جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ ذات مزید سکڑنے سے انکار کر دیتی ہے پھر دنیا ہی کو چھوٹا ہونا پڑتا ہے۔ شاید کوئی ایسا ہی لمحہ تھا جب آپ نے یہ خط لکھا تھا۔ سچی بات ہے میں تو مایوس ہو چلا تھا۔

آپ کی شخصیت، بھابی کی مہمان نوازی اور آپ کی لائبریری کوئی فراموش کرنے والی باتیں تو نہیں ہیں۔ کبھی موقع ہوا تو پھر حاضری ہوگی اور طویل ملاقاتیں بھی۔ آپ سے بہت کچھ سننا ابھی باقی ہے۔ اب تک تو آپ کا کتب خانہ مزید جامع ہو چکا ہوگا۔ بھابی کو میرا اسلام ضرور کہیے گا ایسی میزبان خاتون میں نے زندگی میں کم کم ہی دیکھی ہے۔

''رنگ غزل'' آپ نے ملاحظہ فرمایا ہم شاہین غازی پوری کو کیسے بھول سکتے تھے ان کا کلام تو ہمیں پسند تھا۔ مگر حسن اتفاق دیکھئے کہ ملاقات ڈبلیو اے شاہین سے ہوئی وہ شاہین غازی پوری کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔

شہزاد احمد

۱۶۔ مارچ ۱۹۸۹ء، دہلی۔

مکرمی شاہین صاحب، تسلیم و نیاز۔

عرصے سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ عالمی کانفرنس میں آپ سے ملاقات کی بہت امید تھی لیکن اس میں بھی آپ تشریف نہیں لائے۔ ان کانفرنسوں اور سیمیناروں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ خدا کرے کہ آپ سب لوگ بخیر و عافیت ہوں۔

''اردو کینیڈا'' کے لیے ریکھا اسلم صاحبہ کا ایک مضمون بھیج رہا ہوں یہ آج کل بڑا کام کر رہی ہیں اور ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی میں ادبیات انگریزی کی پروفیسر ہیں۔ ان کی زبان یوں تو مراٹھی ہے لیکن اردو سے انہیں بڑا لگاؤ ہے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ مراٹھی کے افسانے اور شاعری کا ترجمہ انگریزی میں کریں۔ اس وقت یہ میرے مضامین کا ترجمہ کر رہی ہیں۔ تنقید والا مضمون جو میں نے آپ کو دیا تھا اُس کا ترجمہ مکمل کر چکی ہیں۔ انشاء اللہ وہ بھی

آپ کو بھیج دوں گا تا کہ اگر وہاں اسے کسی نے نہ کیا ہو تو اسی مضمون کو آپ استعمال کر لیجیے گا۔ لیکن اب اس سلسلے میں مطلع کریں۔

منسلکہ مضمون اردو اور ہندی کے لسانی رشتوں پر ہے اور بہت اہم ہے۔ اس سے بہت سی نئی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ آپ کے Readers کے لیے بھی بہت دلچسپ ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے قریبی اشاعت میں شائع کریں گے۔ میں ایک بات اور چاہتا تھا کہ اگر آپ انہیں اس کی اشاعت کی منظوری کی اطلاع دے دیں کہ کس شمارے میں شائع کر رہے ہیں تو ممنون ہوں گا۔

شارب ردولوی

۲۰۔اپریل ۱۹۸۶ء، اسلام آباد۔

محبی شاہین، السلام علیکم۔

کل آپ کے خط مورخہ ۹۔اپریل کے ساتھ آپ کے رسالے کا پہلا پرچہ ملا۔ پہلے پرچے کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ مورخہ ۱۷۔اپریل کو پنڈی میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ایک شاندار شام منائی گئی۔ اس دن جب میں آغا صاحب سے ان کے ہوٹل میں ملا تو انہوں نے مجھے آپ کا پرچہ دکھایا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے نام بھی یہ پرچہ آ رہا ہوگا۔ وہاں ڈاکٹر انور سدید اور جمیل آزر (یہ دونوں حضرات وزیر آغا سکول کے اراکین ہیں اور انگریزی میں بھی لکھتے ہیں) بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سمیت سب نے اس پرچے کی تعریف کی۔

جب آپ نے مجھے خط لکھا کہ آپ فلاں تاریخ کو ہندوستان سے کراچی پہنچ رہے ہیں تو میں نے اس تاریخ سے کوئی ہفتہ بھر پہلے صہبا لکھنوی کی معرفت آپ کے نام اپنے تین انگریزی مضامین بھیج دیے جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

1. Iqbal and Radhakridman
2. The glorafication of man in Iqbal's Poetry.
3. Urdu leterature.

پہلے دو مضامین یہاں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود آپ کے رسالے میں ان کے شائع ہونے کا جواز موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کو رسالے کے ذریعے ان مضامین کو زیادہ تر نئے قارئین ملیں گے۔ پرانے قارئین ممکن ہے بالکل نہ ملیں۔ ''اردو لٹریچر'' اردو ادب کی ابتدا سے لے کر ۱۹۸۳ء تک کا جائزہ ہے۔ فل اسکیپ سائز کے ۵۰ صفحات ٹائپ شدہ وغیر مطبوعہ۔

صہبا نے مجھے آج تک ان مضامین کی رسید نہیں بھیجی۔ اب آپ صہبا صاحب کو براہِ راست لکھیں کہ وہ آپ کے نام پر ارسال کردہ پیکٹ جلد سے جلد بھیج دیں مجھے خوشی ہوگی اگر یہ مضامین دوسرے تیسرے پرچے میں آ جائیں۔

مغربی ممالک میں اردو ادب کو Progeet کرنے کی دو ہی اہم صورتیں ہیں (۱) اردو ادب کے شہکاروں کے زیادہ سے زیادہ ترجمے پیش کیے جائیں اور (۲) اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی مضامین شائع کیے جائیں۔

جولائی میں ہندوستان اور پاکستان آنے کی اطلاع ضرور دیجیے گا۔

صہبا صاحب کی طرف سے میری چیزیں مل جائیں تو اس کی اطلاع بھی۔ صہبا نے میری کتاب ''اردو ادب کے مغربی دریچے'' نہ جانے کس طرح آپ کے نام بھیجی جو نہ پہنچ سکی۔

نظیر صدیقی

۲۸۔فروری ۲۰۰۵ء، بھارت۔

شاہین صاحب، سلامِ شوق۔

آپ اور میں تو اپنے اپنے مجموعوں سے ہی قریب اور بغل گیر ہیں۔ دونوں پر کسی رسالے نے یکمشت تبصرہ کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں لیکن محسوس ہوتا ہے ابھی کل کی بات ہے۔

آپ نے اپنا نیا مجموعۂ غزلیات ''دہلیز پر پھول'' بھیج کر (بتوسط زین الدین احمد صاحب) بڑی نوازش فرمائی۔ اسے محبت اور شوق کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔ ممکن ہوا تو AIR سے تبصرہ بھی کروں گا۔ شکریہ اور مبارکباد۔

مظفر حنفی

۲۶۔مئی ۱۹۹۹ء، بھوپال۔

شاہین صاحب، سلام۔

ہنوز آپ سے ملاقات کی یادیں تازہ ہیں۔ اگرچہ دل کے حوصلے نہیں نکلے کہ وقت کم تھا۔ سوچا تھا اس بار اوٹاوہ میں کافی دن رہیں گے خوب باتیں ہوں گی لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ بہرحال پھر کبھی سہی۔ یار زندہ صحبت باقی۔

یہاں آنے کے کچھ دن بعد ہی شوق صاحب کو خط لکھ دیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا آپ کو بھی الگ سے خط لکھ رہا ہوں۔ مگر یہاں تمازت کا یہ عالم ہے کہ کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا۔ زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۴۴ ڈگری ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کیا حالت ہوگی۔ ابھی تک انصاری صاب کو بھی خط نہیں لکھا ہے۔ آج کل میں اُن سے بھی بہ زبانِ قلم باتیں کروں گا۔

یہاں پہنچا تو صاحبزادے کی معرفت ارسال کردہ آپ کا مکتوب اور ''محفل'' پر دو شمارے بھی ملے۔ باقی آپ کے یہاں دیکھے تھے۔ آپ لوگ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ہندوستان پاکستان سے دور اردو کی بستیاں بسا رکھی ہیں۔ بڑی طرح دار بستیاں ہیں۔ یہ اردو کی جہانگیری کا سلسلہ کتنا دراز ہوگا۔ جی چاہتا ہے کہ Urdu Canada پر منظر عام پر آئے۔ لیکن مجھے احساس ہے کہ وہاں آپ کتنی مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر بھی میرا تقاضہ ہے کہ ادھر بھی توجہ دیں۔ یہ بھی ضروری ہے۔

آفاق احمد

۲۶۔اگست ۱۹۹۳ء،لندن۔

پیارے شاہین، بھئی معاف کردو۔

خط ملا تھا (اس کو چار مہینے ہوئے) جواب نہیں لکھا۔تم نے اپنے بارے میں بہت سی چیزیں بھیجی تھیں پڑھ لی تھیں مگر واہ رے کاہلی کے جواب نہیں لکھا۔اس عرصے میں تم نے اشفاق چچا سے شکایت کی انہوں نے ڈانٹ کا خط لکھا۔وہ میرے خاندان میں واحد بزرگ رہ گئے ہیں کہ ابّا کا اور بڑے چچا کا انتقال ہو چکا ہے۔اس لیے بس انہی سے ڈرتا ہوں۔انہوں نے لکھا تھا کہ تم لوگ اس Summer وغیرہ میں مجھے بلانا بھی چاہتے ہو۔مجھے ایک مہینے یا دو مہینے کا نوٹس دے دو۔آجاؤں گا۔افسوس کہ تم سے ملاقات نہیں ہے۔امید ہے تم مجھے پسند کرو گے۔چچا سے کہہ دینا کہ میں نے تین مہینے پہلے ہی تمہیں خط لکھا دیا تھا تاکہ وہ مزید ناراض نہ ہوں۔یہ بات بھولنا نہیں۔ظاہر ہے میں چچا کے گھر ہی قیام کروں گا۔ٹکٹ تم لوگ بھیج دو۔

یار رسالہ بہت عمدہ نکالا ہے۔جی خوش ہو گیا۔مگر صرف ترقی پسندی پر ہی مضمون وغیرہ مت چھاپنا۔دائرہ خیال محدود مت کرنا ہر مکتبہ خیال کے لوگوں کی چیزیں اور Daring چیزیں آنی چاہئیں۔میں نے تقریباً دس انگریزی نظمیں لکھی ہیں جو ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔اگر تم چاہو تو اکٹھی چھاپ دو اور مجھے دس صفحے دو۔فاروق میرا یار ہے اور اس نے میرے مضمون ''حسن کوزر گر'' کا ترجمہ کر کے نعیم کو دے دیا ہے۔جو نعیم کے رسالے میں آ رہا ہے۔مگر میں چاہتا ہوں کہ تم میرے تخلیقی ادب والے مضمون ''فیض، میرا جی، راشد'' کا ترجمہ اگلے شمارے میں چھاپو اور فاروق سے بہتر کوئی نہیں جو اس کا ترجمہ کر سکے۔تم اس سے کہہ دو۔میں بھی لکھ دوں گا تمہارے خط کے بعد۔اور میری انگریزی نظمیں چاہئیں تو فوراً لکھ دو۔بہت زور دار اور ہنگامہ خیز چیزیں ہیں۔یہاں انگریز شاعروں سے خوب خوب بنتی اور بگڑتی ہے۔تمہاری شاعری پر رائے کناڈا آ کر دوں گا۔

ساقی فاروقی

۲۵۔اگست ۱۹۹۴ء، دہلی۔

محبی شاہین صاحب، سلام خلوص۔

زمانہ بیت گیا۔اب تو یاد بھی نہیں آتا آپ سے آخری بار خط و کتابت کب ہوئی۔آپ کے صاحبزادے کشمیر آئے تھے اور آپ کا ارسال کردہ گراں قدر تحفہ ''بے نشان'' لے کر آئے تھے۔پھر ۸۲ء کے اوائل میں Urdu Canada کا پہلا شمارہ ملا۔اس کی رسید میں نے فوری طور پر روانہ کر دی تھی۔پھر کچھ پتہ نہیں چلا ''اردو کینیڈا'' کے شائع ہونے کی اطلاع ملتی رہی مگر میری نظر سے کوئی اور شمارہ نہیں گزرا۔میری کوتاہی کہ میں نے خط لکھ کر شکایت نہ کی۔۸۶ء، ۸۷ء اور ۸۸ء میری منصبی ذمہ داریوں کے بڑے Hectic اور مسائل سے بھرپور سال تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد دوسرے مسائل پیدا ہوئے اور سب سے بڑا مسئلہ ۹۰ء کے اوائل میں ''خلد سے آدم کا نکلنا'' تھا۔خط میں تفصیل لکھوں تو پھر خط انہیں باتوں سے بھر جائے۔بہر حال، قریباً ایک سال سے صورت حال کچھ بہتر ہے۔ویسے صحت خراب ہی رہتی ہے۔وزن بہت کم ہو گیا ہے۔۹۱ء کے اگست میں کولہے کی ہڈی ٹوٹی تھی۔پٹنہ میں آپریشن ہوا Prosthesis لگایا گیا۔اس کے سہارے چل رہا ہوں۔آپریشن کامیاب ہوا۔۹۲ء میں شمس الزماں مرحوم کے ساتھ ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔بڑے اہتمام کیے اور بہت خرچ کر کے انہوں نے آپریشن کروایا جو ناکام ہوا۔دوبارہ آپریشن کرانا پڑا اور اس کے بعد تو پیچیدگیاں بڑھتی ہی گئیں۔آخری دنوں میں بھی بیساکھی کے سہارے وہ میرے یہاں کبھی کبھی آ جاتے تھے۔میرے پاس سواری کی مجبوری ہے، اس لیے میری جانب سے کوتاہی ہوتی تھی مگر وہ بیماری کے عالم میں میری خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ان سے آپ کا اکثر ذکر ہوتا۔آپ نے cirecis کے علاج کے سلسلے میں جو ان کی امداد کی اس کا برابر تذکرہ کرتے۔آپ سے کبھی کبھی فون پر رابطہ ہوتا اس سے بھی آگاہ کرتے رہتے۔بڑی صعوبتوں اور بڑی محبت کے آدمی تھے۔کہا جاتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض اٹھایا۔

غالباً ۹۱ء میں آپ دہلی آئے تھے۔یا شاید ۹۲ء کے اوائل میں۔میں ان دنوں دربھنگے میں تھا۔دل مسوس کر رہ گیا۔ٹی وی پر آپ سے گوپی چند نارنگ کا لیا ہوا انٹرویو دیکھا تھا۔اس سے پہلے ''اوراق'' میں ''بے نشان'' پر انور سدید کا مضمون بھی دیکھا تھا۔آپ کا کلام وقتاً فوقتاً دونوں اطراف کے رسائل میں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوتی رہتی ہے۔

میری (یعنی میری بیوی کی) بھتیجی نیّرہ Dollard , Dos, Raebee میں رہتی ہیں۔ڈھاکہ میں آپ کی بیگم سے متعارف رہ چکی ہیں۔ان کے شوہر یعنی میرے داماد ابوالبرکات کا مٹھی شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہیں۔میں نے ان کی معرفت اپنی چار کتابیں آپ کے لیے بھجوائی ہیں۔ان کی رسید اور اپنے تاثرات سے آگاہ فرمائیں گے تو شکر گزار ہوں گا۔

مظہر امام

۲۳۔دسمبر ۲۰۰۵ء، دہلی۔

برادرم شاہین صاحب، سالِ نو مبارک۔

آپ کا تازہ کلام اور خط ملا۔بے حد شکر گزار ہوں۔کئی مہینوں سے انتظار تھا۔''دہلیز پر پھول'' سے کچھ غزلیں میں نے لی ہیں اور تازہ موصولہ کلام شامل کر کے ایک گوشہ ''شاہین نامہ'' کے نام سے ''نیا سفر'' میں دے رہا ہوں۔آپ کا خط اور میرا ایک نوٹ بھی شامل ہوگا۔مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ کچھ عرصہ سے آپ ہندوستان کے ادبی افق سے تقریباً غائب ہو گئے ہیں۔حال ہی میں

رباب اشرفی کے سہ ماہی پرچہ ''مباحثہ'' میں ایک اچھا مضمون آپ کی شاعری پر ضرور آیا ہے۔ ورنہ یاروں نے تو بھلا ہی دیا تھا۔ شاید اس عرصہ میں پاکستانی پرچوں میں آپ زیادہ شائع ہوئے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کے اس نئے مجموعے پر ایک دو جامع تبصرے شائع ہوں۔ بہرحال آپ رابطہ رکھیے۔ اور اپنا تازہ کلام ضرور بھیجتے رہیے۔

قمر رئیس

۱۱۔جنوری ۲۰۰۵ء، کراچی۔

مکرمی شاہین صاحب، السلام علیکم۔

آپ کا ۳۱۔اکتوبر ۲۰۰۴ء کا خط مجھے مل گیا ہے۔ اس سے پہلے آپ کے حوالے سے یہ خبر ملی کہ آپ ایک حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اور آپ کو چوٹ آئی ہے۔ خدا کرے کہ اب آپ پوری طرح صحت مند ہوں۔ اپنی خیریت سے ضرور مطلع فرمایئے گا۔

دنیا زاد نمبر 13 آپ کو علیحدہ سے پوسٹ کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ کی کئی نظمیں شامل ہیں۔ اس رسالے کے بارے میں آپ کی رائے/ تاثرات/مشورے کا انتظار رہے گا۔

مجھے آپ کی کتاب کی اشاعت سے ضرور دلچسپی ہو گی کہ میں ایک مدت سے آپ کی شاعری پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ دو سو صفحات تک نظموں کی کتاب کی لاگت میرے اندازے سے کچھ اس طرح ہو گی:

۲۰۰ صفحات

۸۰ گرام امپورٹڈ آفسٹ پیپر

ہارڈ بائنڈنگ

رنگین سرورق۔

تعداد اشاعت۔ ۵۰۰

اس پر فی کاپی لاگت ۹۰ روپے کے قریب آئے گی۔ اگر ۱۰۰۰ کاپیاں شائع کی جائیں تو رقم کچھ کم ہو جائے گی۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

آصف فرخی

۱۴۔جولائی ۱۹۸۲ء، کینیڈا۔

شاہین بھائی، تسلیمات۔

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ اردو انٹرنیشنل کا پہلا شمارہ چھپ گیا ہے جو اگست، ستمبر، اکتوبر کے مہینے کا ہے۔ میں رسالے کی پانچ کاپیاں آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ توقع کرتا ہوں کہ اپنا رسالہ سمجھتے ہوئے اس کی سرکولیشن میں مدد کریں گے۔ اگر مزید خریدار بن جائیں تو مجھے فون کر کے کاپیاں منگا لیں۔ اس سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی کتاب کا ایک مختصر سا اشتہار بنا کر بھیج دیں تا کہ دوسرے شمارے میں اس کو چھاپ دیا جائے۔

اگر ہو سکے تو آٹوا کے علاوہ دوسری جگہوں کے لوگوں کے پتے وغیرہ عنایت کر دیں تا کہ اُن کو رسالے کا خریدار بنایا جا سکے۔ یقیناً آپ کی نظروں میں ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو ادب سے شغف رکھتے ہوں اور ایک آدھ میگزین خرید سکنے کی پوزیشن میں بھی ہوں۔ رسالے کے سلسلے میں ''آٹوا'' کو سنبھالنا آپ کا کام ہے؟ مجھے آپ سے بڑی توقع ہے۔

ابرار صاحب نے رسالے کے لیے کچھ نہیں بھیجا حالانکہ میں نے اُن کو کئی بار یاد دلایا۔ اگر ملاقات ہو تو ان سے میرا سلام کہیں۔

اشفاق احمد

مئی ۱۹۹۴ء، کینیڈا۔

جناب شاہین صاحب، آداب۔

غائبانہ تعارف کی کچھ شرائط ہیں جن پر آپ پورے اترتے ہیں۔ لہٰذا آپ کا مجھ سے غائبانہ تعارف تھا ملاقات مشاعرہ میں ہو گئی۔ عزت افزائی کا بے حد شکریہ۔

میں ''بے نشان'' سینکڑوں مرتبہ پڑھ چکی ہوں ''تحفہ شاعر'' بھی نظر سے گزری۔ کیا تعریف کروں۔ سورج کو چراغ دکھا کے فائدہ بس یہ ہی کہ:

ہزار شعر لکھے یوں تو لکھنے والوں نے
کس کس نے دل تسلا سے باتیں کیں

آپ جیسے شاعر نہ ہوتے تو ہم جیسوں کے غم و خوشی کو زباں کہاں سے ملتی۔ بس پڑھتے ہیں اور داد دیتے ہیں اور دن رات دعا مانگتے ہیں ان سب کی زندگیوں کی جو دیکھتے بھی ہیں، محسوس بھی کرتے ہیں، سوچتے بھی ہیں۔۔۔ اور اپنے ان جذبوں کو زبان بھی دینا جانتے ہیں۔

''اردو کینیڈا'' بھی اس کی ایک مثال ہے۔ یہاں بھی آپ نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ یہ وقت کی ایک اہم ترین ضرورت تھی۔ ہماری آئندہ نسلوں کے لیے جو یہاں پل بڑھ رہی ہیں یہ کتاب ایک نئی سرمایہ ہو گی۔ میں نے کنگشن پبلک لائبریری کو اس کی کچھ جلدیں منگانے کا مشورہ دیا ہے۔ کل یعنی جمعہ ۲۔ مئی کنگشن میں یوم اقبال کے سلسلہ میں ایک سیمینار ہے جس کی صدارت پاکستان کے کونسلیٹ کر رہے ہیں اس کا انتظام میں نے ہی کیا ہے۔ ''اردو کینیڈا'' کو کنگشن سے متعارف کرا دوں گی۔ مجھے یقین ہے اس تخلیق کا شایانِ شان استقبال ہوا ہو گا۔ آپ اور روشن آراء صاحبہ یقیناً بہت مبارک کے مستحق ہیں۔

نسیم سید

براہِ راست

تخلیق کیا ہے؟ انسانی جذبات و احساسات، تجربات ومشاہدات کا برنگِ دیگر اظہار کو تخلیق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جس تخلیق کار کے فنّی سفر میں تجربات و مشاہدات اور زندگی کے نشیب وفراز کا جس قدر دخل ہوگا تخلیق میں اتنا ہی درد اور گہرائی ہوگی۔ شاہین صاحب اردو شاعری کے ہمارے خیال میں وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے بچپن سے لے کر سن رسیدگی تک زندگی کے گوں نا گوں تجربات کے ساتھ ایک نہیں، دو نہیں، تین ہجرتوں کا عذاب جھیل کر اردو شاعری کے زخیرے کو نئے احساس، نئے تجربات اور نئے درد سے آشنا کیا ہے۔ اُن کی لَے مدھم مگر دردسَوا ہے جسے وہ غزلوں، نظموں اور گیتوں کے ذریعے ہمیں اور آپ کو ایمانداری سے سونپ رہے ہیں۔ زیرِ نظر محفل ہم نے شاہین صاحب کی شخصیت وفن کے تمام تجربات ومشاہدات کو تلاش، کھنگال، کھروچ کر پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ کامیابی کا دعویٰ نہ پہلے کیا نہ آج کرنے کی پوزیشن میں ہیں کیونکہ ہمیشہ کی مانند اس ذمہ داری کا بار آپ کے کاندھوں پر ہے۔

گلزار جاوید

☆ اپنے بچپن اور اس دور کے غازی پور سے قارئین کا تفصیلی تعارف کرایئے۔

☆☆ میرا غازی پور ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں واقع ایک گاؤں ہے جہاں کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ یہ سنی العقیدہ لوگ تھے لیکن محرم میں تعزیہ داری اور ماتم بھی کرتے تھے۔ جن میں میں اپنے لڑکپن کے دوران بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ لٹھ بازی اور تیغ زنی کے ساتھ نقارے بھی بجائے جاتے تھے۔ امام باڑے کے گرد تعزیے کے ساتھ مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ تین محلوں (ندی پار، بچلہ ٹولہ، اور ابراہیم پور) کے الگ الگ تعزیے بنتے تھے اور ان کی اونچائی صیغہء راز میں رکھی جاتی تھی۔ بستی کے شمال مشرقی کنارے پر انصاری برادران اور ملکی محلے میں کچھ احمدی فرقے کے گھرانے آباد تھے۔

گاؤں کے وسط میں ایک مسجد تھی جس کے دروازے کے سامنے ایک کنواں تھا جہاں بطور خاص جمعہ کے دن نہانے والوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ ایک نہایت متقی، نفیس اور شفیق بزرگ مولوی محمد حنیف صاحب مسجد کے امام تھے۔ پورے گاؤں کے علاج معالجے کے لئے حکیم عبدالجلیل صاحب کی خدمات کا سہارا میسر تھا جو جڑی بوٹیوں اور جوشاندے سے سب کا علاج کرتے تھے۔ مشرقی کنارے پر عیدگاہ تھی جس سے لگی ہوئی پرائمری اسکول کی عمارت تھی۔ عیدگاہ اور اسکول اس سڑک سے متصل تھے جو سلطان گنج سے تاراپور تک جاتی تھی۔ سلطان گنج دریائے گنگا کے کنارے واقع ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ یہاں سے جنوب کی طرف بارہ کیلومیٹر کے فاصلے پر اثر گنج، پھر اسی ترتیب سے لکھن پور، رَن گاؤں، غازی پور اور تاراپور کی آبادیاں ہیں۔

☆ برصغیر میں دو طرح کے مسلمان بستے ہیں۔ ایک وہ جن کے آباء سمرقند، بخارا، ترکی، عرب، ایران، اور افغانستان سے آکر آباد ہوئے۔ دوسرے وہ جنہوں نے صوفیائے کرام کی تعلیمات کے زیر اثر اسلام قبول کیا۔ آپ کے خاندان کا سلسلہ اور غازی پور میں آباد ہونے کی کہانی قارئین دلچسپی سے سننا چاہیں گے۔

☆☆ ہمارے گاؤں کی کوئی مستند یا غیر مستند تاریخ کہیں موجود نہیں۔ کم از کم میں لاعلم ہوں۔ پڑھے لکھے لوگ وہاں بہت کم تھے۔ کسی خاندان میں شجرے کا وجود نہیں ملتا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے آباء واجداد سب اپنے نام کے ساتھ ''سید'' یا ''میر'' لگاتے تھے۔ میرے والد جن کا نام میر نوید علی تھا اپنے محلے اور اطراف وجوانب میں ''میر صاحب'' کہلاتے تھے۔

☆ کچھ یادیں زمانہء طالب علمی کی بھی یقیناً دلچسپ ہونگی جن میں اساتذہ اور ہم جماعتوں کا ذکر لازمی امر ہے؟

☆☆ غازی پور پرائمری اسکول میں چار اساتذہ تھے۔ مولوی اصغر حسین، مولوی عابد حسین، مولوی عبدالرزاق، اور مولوی عبدالشکور۔ اول الذکر ہیڈ ماسٹر تھے۔ عابد حسین صاحب علم الحساب میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ سائنس، ریاضیات، اور بعد میں شماریات سے میری دلچسپی (یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا) میں شاید ان کی دی ہوئی بنیادی تربیت کام آئی ہو۔

مولوی عبدالرزاق بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ جاڑے کے دنوں میں باہر باغ میں بیٹھ کر پڑھایا کرتے تھے۔ وہ بیڑی سے شوق رکھتے تھے۔ لیکن بیڑی سلگانے کے لئے ماچس کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ ایک بٹوے میں وہ کوئلے کا برادہ رکھتے تھے۔ اور جیب میں ایک محدب شیشہ۔ بیڑی کے پیندے پر برادہ رکھ کر وہ شیشے سے سورج کی روشنی کو اس پر مرتکز کرتے تھے۔ ایک آدھ منٹ میں دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ سوچتا ہوں آج کی لیزر ٹیکنالوجی (Laser Technology) ہمارے مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم کے بیڑی سلگانے کی ترقی یافتہ شکل تو نہیں؟

ابتدائی تعلیمی سطح پر میں نے چار بار چھلانگیں لگائیں اس طرح کہ

ایک برس میں دو جماعتیں ختم کر لیتا تھا۔ یہ ایک اسکول میں رہ کر ممکن نہیں تھا۔ کئی اسکول بدلے جس کی ابتدا نومبر سن انیس سو چھیالیس (۱۹۴۶ء) کے ہولناک ہندو مسلم فسادات سے ہوئی جس میں میری والدہ اور چھوٹے بھائی شہید ہو گئے۔ گھر نذر آتش کر دیا گیا اور والد کا کاروبار بھی انہی سانحوں کا حصہ بن گیا۔ اس دورِ ابتلا کی سخت آزمائشوں کے باوجود میں اندازاً تیرہ برس کی عمر میں میٹرک سے فارغ ہو گیا۔ بیس برس کا ہوا تو شماریات میں ایم ایس سی کر چکا تھا۔ یونیورسیٹی میں اول پوزیشن آئی تھی اور بھاگل پور مارواڑی کالج کے شعبہء شماریات میں لکچرر لگ گیا۔ میں اچھا طالب علم تھا۔ ٹیوشن پڑھا پڑھا کر گزارا کیا۔ کتابیں خریدنے کی سکت نہیں تھی چنانچہ میرا سارا انحصار اپنے کلاس نوٹس پر تھا۔

☆ ایک مذہبی گھرانے کے کم عمر بچے میں شاعری کے جراثیم کب اور کس طور دریافت ہوئے اور آپ کے اہل خانہ نے اس پر کیا ردِّعمل ظاہر کیا؟

☆☆ مولانا اسماعیل میرٹھی کے قاعدوں میں شامل نظمیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا/رب کا شکر ادا کر بھائی/نہر پر چل رہی ہے پن چکی/ایک لڑکی بگھارتی ہے دال۔ یہ اور اس قبیل کی نظمیں اور مفرد اشعار میرے تخیل کو مہمیز کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسکول کے باہر ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ کر میں اچانک گنگنانے لگا:

اسکول چمکتا چم چم چم مرا نام ولی عالم

پھر اس طرح کے الٹے سیدھے مصرعے ترتیب پانے لگے۔

☆ آپ ہمیں اس احساس کی بابت کچھ بتلایئے جب آپ نے چودہ پندرہ برس کی عمر میں پہلی نظم ''یتیم کی عید'' تحریر کی تھی۔

☆☆ ہائی اسکول میں ہی تھا کہ شہر بھاگل پور جانے کا اتفاق ہوا جہاں ایک کتاب کی دکان پر 'بانو' نامی اردو رسالہ نظر آیا جو دلی سے نکلتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کوئی رسالہ دیکھا نہیں تھا۔ گاؤں پہنچ کر میں نے رسالے کی مدیرہ زینب انور کے نام دو تخلیقات روانہ کیں اور دونوں چھپ گئیں۔ ایک خط آیا کہ بانو کا ایک خاص شمارہ عید نمبر کے نام سے شائع ہو رہا ہے جس کے لئے زینب انور صاحبہ نے گزارش کی تھی کہ میں ایک نظم لکھوں۔ اپنے گھر میں ہم تین افراد ہوتے تھے۔ میرے والد، میں اور میری چھوٹی بہن۔ ہمیں اپنی یتیمی کا احساس تو تھا ہی، عید کے دن اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ گھر ویران محسوس ہوتا، رشتے دار بھی ایسے نہیں تھے جو ہماری محرومی کا کسی طرح، میٹھے بول سے ہی سہی، کچھ مداوا کرتے۔ چنانچہ میں نے اسی دن نظم 'یتیم کی عید' لکھ ڈالی جو بانو عید نمبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں پورے صفحے پر میرے ادبی نام ''شاہین غازی پوری'' کے تحت شائع ہوئی۔ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ برس کی رہی ہوگی۔ نظم 'یتیم کی عید' کا پہلا بند یوں تھا:

جلوہ افگن ہلال ہوتا ہے
عید کل ہے خیال ہوتا ہے
زندگی اُف یتیم بچے کی
ایک دن ایک سال ہوتا ہے

نظم کی اشاعت سے مجھے جتنی خوشی ہوئی اتنی خوشی مجھے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مہینے بھر رسالے کو ساتھ ساتھ لئے پھرا۔ کوئی شخص ایسا نہیں ملا جسے وہ نظم دکھاتا یا جس سے داد طلب کرتا۔ شہر جاتے ہوئے بس پر اپنے گاؤں کے اردو میں ایم اے کے سند یافتہ ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جو کٹیہار، پورنیہ کے علاقے کے کسی کالج میں اردو پڑھاتے تھے۔ میں نے بڑے اشتیاق سے بانو میں چھپی اپنی نظم انہیں دکھائی۔

☆ اس تاثر کی بابت آپ کیا کہنا پسند کریں گے کہ آپ نے احساس محرومی دور کرنے کی غرض سے شاعری کا سہارا لیا۔ وقت اور مسلسل مشق نے آپ کے اندر کے شاعر کو بہت بعد میں دریافت کیا۔

☆☆ آپ کے اس سوال میں کئی جہتیں یکجا ہو گئی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ ایسا تاثر کہاں سے قائم ہوا کہ میں نے احساس محرومی دور کرنے کی غرض سے شاعری کا سہارا لیا۔ دوئم یہ کہ احساس محرومی دور کرنے کی غرض سے شاعری کا سہارا لینا ہی کیوں ضروری ٹھہرا؟ آپ مچھلیاں پکڑ سکتے ہیں۔ صبح شام ورزش کر سکتے ہیں۔ شاعری تو اسی وقت تک شاعری ہوتی ہے جب وہ سانس لینے کی مانند اندر کی ضرورت بن جائے۔ خارجی عوامل بہانے یا تحریک فراہم کر سکتے ہیں لیکن وہ شعری اساس کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ تو عطیہء خداوندی ہے جسے صیقل کرنے کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے۔ علامہ رضا علی وحشت نے کیا خوب کہا ہے:

فروغِ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لئے

☆ شاعری بالخصوص غزل خالصتاً تکنیکی کام ہے جبکہ کافی غور و خوص کے بعد بھی آپ کے ہاں استاد نام کی کوئی شے دور دور تک دکھلائی نہیں دیتی؟

☆☆ غزل ان معنوں میں تکنیکی ہے کہ اس صنف سے ہیئت کی پابندی مربوط ہے، چنانچہ ردیف قافیہ، مطلع مقطع، بحر اور وزن، اور کسی حد تک لفظیات کے مزاج کے اعتبار سے تمام قیود کی پاسداری لازمی قرار پاتی ہے۔ اور یہیں جانگدازی کے مراحل شروع ہوتے ہیں۔ اچھا شاعر انہی پابندیوں کے بیچ آزادی حاصل کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فنکاری کا ابتدائی مرحلہ صناعی کا ہے لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ فن کے اجزائے ترکیبی میں لہو کی گردش کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ پورا جسم اور دماغ فن کی تخلیق میں شامل ہوتے ہیں۔ لہو ٹانگوں میں ہو یا دماغ کے اندر ہپو کیمپس (hippocampus) میں فن کی اصل نشو و نما اسی کی مرہونِ منت ہے۔ اسے آسانی کے لئے خونِ جگر کہہ لیں۔ اچھا شعر پوری زندگی مانگتا ہے۔ غزل جتنی آسان نظر آتی ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ یہ بات دوسری اصناف پر بھی صادق آتی ہے۔

☆ آپ کی شاعری پر بے زمینی اور بے نشانی کا لیبل لگانے سے قبل آپ کی پہلی ہجرت سے آگاہی ضروری ہے؟ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے

دوسری ہجرت کی کہانی بھی بیان فرمادیجیے۔

☆☆ لیبل چسپاں کرنا تخلیق کار کو محدود کردینے کے مترادف ہے۔اسپین کے شاعر فیدریکو گارسیا لورکا (Federico Garcia Lorca : 1899-1936) نے خانہ بدوشوں پر The Gypsy Ballads کے عنوان کے تحت اٹھارہ بے حد خوبصورت نظمیں لکھی تھیں۔بعض سہل طلب نقاد اسے خانہ بدوشوں کا شاعر کہنے لگے۔لورکا کو یہ بات سخت ناگوار محسوس ہوئی۔کچھ ایسی ہی بات فلسطینی شاعر محمود درویش نے اپنی نظم ''لکھ لو میں ایک عرب ہوں'' کے حوالے سے کہی تھی کہ لوگوں نے مجھے اس نظم کے چوکھٹے میں محدود کر رکھا ہے ہے جسے میں مسترد کرتا ہوں۔دراصل دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے اپنے موضوع سے اخلاص رکھتے ہوئے فن کے جملہ تقاضے پورے کئے ہیں یا نہیں۔

بے زمینی، بے نشانی، بے گھری، جیسے لیبل لگا کر پوری شاعری کو کسی ایک چوکھٹے میں سمونے کی کوشش تن آسانی کے سوا کچھ اور نہیں۔جز و کُل پر محیط کر دینا موضوعاتی تنوع کو بیک جنبشِ قلم رد کرنے کے مترادف ہے۔ہجرت ایک اضافی تصور ہے۔

آپ اپنے وطن میں رہ کر بھی اجنبی اور مہاجر کہلا سکتے ہیں۔تقسیم ہند سے قبل شمالی ہند سے دکن میں روزگار ڈھونڈنے والوں نے ہجرت کے دکھ جھیلے تھے۔انہیں وہاں غیر ملکی کہا جاتا تھا۔

نقل مکانی کے جو بھی اسباب ہوں، ترکِ سکونت سے گوناگوں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔اور یہ مسائل بیشتر آفاقی ہوتے ہیں۔فنکار ان مسائل کو پڑاؤ جان کر آگے بڑھتا جاتا ہے۔

ہجرت کی ابتدا عام طور سے ابتلا اور آزمائش سے ہوتی ہے جس کا سلسلہ ہجرت کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں ایک عرصے تک جاری رہتا ہے۔کبھی کبھی ایک ہجرت دوسری ہجرتوں کا پیش خیمہ بھی بن جاتی ہے۔بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاری، برصغیر کی تقسیم، قتل و غارت گری اور وحشت و بربریت کی ہولناکی، اور نئی حد بندیوں کے آر پار انتقال آبادی نے ایک ایسا بحران پیدا کیا جس کی مثال تاریخ میں کم کم ملے گی۔

صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں واقع میرا گاؤں غازی پور نومبر ۱۹۴۶ء میں ہندو مسلم فسادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔میری والدہ اور چھوٹا بھائی شہیدوں میں شامل ہوئے۔ہمارا گھر جلا دیا گیا۔میرے والد کے روزگار کے وسائل ختم کر دئے گئے۔میں اس وقت اپنے گاؤں غازیپور کے پرائمری اسکول میں پہلی جماعت کا طالب علم تھا اور میری عمر چھ سات سال کی تھی۔فسادات کے سبب تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ہجرت کے مارے لوگوں کے درد و ابتلا کی حکایت کو بعض اوقات صحیح تناظر میں نہیں دیکھا جاتا، یہاں تک کہ انہیں سگِ زمانہ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔لیکن کتے تو ہر گلی کوچے میں ہوتے ہیں۔اس کے لئے ہجرت کوئی لازمی شرط نہیں۔

عذابِ نقلِ مکانی تو اک بہانہ ہے
سگِ زمانہ جہاں ہے سگِ زمانہ ہے

☆ سید ولی عالم نے ''شاہین غازیپوری'' کا تخلص کس تحریک اور رہنمائی پر اختیار کیا اور پھر اسے ترک کر کے صرف ''شاہین'' تک کیوں محدود ہو گئے؟

☆☆ میں نے ہائی اسکول کے دوران (غالباً ۱۹۵۱ء میں) دو روپے بھیج کر نسیم بک ڈپو لکھنو سے بذریعہ ڈاک اقبال کی کتاب ''بالِ جبریل'' منگوائی تھی۔اسی کتاب سے جو اس وقت مجھے خاصی مشکل معلوم ہوئی تھی میں پہلی بار لفظ ''شاہین'' سے متعارف ہوا اور اسے اپنے نام کا حصہ بنا لیا۔اور اپنے گاؤں کے لاحقے سمیت ''شاہین غازی پوری'' بن گیا۔

میرا پہلا شعری مجموعہ ''رگِ ساز'' اسی نام کے تحت ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔برصغیر میں تین غازیپور ہیں۔یوپی، بہار، اور بنگال میں۔

اول الذکر زیادہ مشہور ہے۔آخر الذکر تینوں میں کم۔کچھ لوگ مجھے غازی آبادی بھی لکھ دیتے تھے۔بار بار کی وضاحت سے بچنے کے لئے میں نے اپنے آپ کو سمیٹ کر یک لفظی نام ''شاہین'' تک محدود کر لیا۔

☆ جس قدر ہمہ رنگ زندگی آپ نے گزاری ہے بہت کم تخلیق کاروں کو اس طرح کے مواقع میسر ہوتے ہیں۔اول اپنی زندگی کے بارے میں آپ کا تاثر دوم تخلیق کے حوالے سے آپ کس طرح کی زندگی اور ماحول کو سازگار تصور کرتے ہیں؟

☆☆ بیس اکیس برس کی عمر تک میں نے بہت کٹھن زندگی گزاری۔ ریاضی اور سائنس کا طالب علم تھا۔مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔نصابی کتابیں خریدنے کی قطعاً سکت نہیں تھی۔میرا گزارا کلاس نوٹس پر تھا۔صبح شام ٹیوشن پڑھاتا تھا۔لیکن میں غبی طالب علم نہیں تھا۔۱۹۶۰ء میں بہار یونیورسیٹی سے شماریات (Statistics) کے مضمون میں ایم ایس سی کیا اور یونیورسیٹی میں اول آیا۔تھوڑے ہی دن بعد لکچرر شپ مل گئی۔اس دوران شعر گوئی بھی جاری رہی۔ متعدد ادبی جرائد میں میری نظمیں غزلیں چھپتی رہیں۔رسالہ ''آجکل'' دہلی (ادارت: جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد) کے عرش ملسیانی نے اپنے دو خاص نمبروں کے لئے خط لکھ کر مجھ سے فرمائشی نظمیں لکھوائیں۔حال میں ڈاکٹر بیدار بخت نے اسی رسالے کے موسیقی نمبر کے چند صفحات کی نقل مجھے بھیجی۔ اس میں میری وہ نظم ''موسیقی'' شامل تھی جس کے لئے خط بھیج کر ملسیانی مرحوم نے نظم لکھنے کی فرمائش کی تھی۔اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک سولہ سترہ سال کے لڑکے سے یہ فرمائش کر رہے ہیں تو وہ کئی بار سوچتے۔یہ نظم میرے پہلے مجموعے میں بھی شامل ہے۔میں اپنی زندگی سے بڑی حد تک مطمئن ہوں۔

☆ کل وقتی، جز وقتی، پیشہ ور، غیر پیشہ ور شاعر کی تخصیص اور شاعری کے کس اسکول آف تھاٹ میں یقین رکھتے ہیں نیز آپ کا شمار کس صف میں کیا جانا چاہیے؟

☆☆ میں غیر پیشہ ور جز وقتی شاعر ہوں، اگر چہ جز وقتی کام سے یہ تصور وابستہ ہے کہ ہفتے میں چالیس گھنٹوں کے بجائے کم وقت مثلاً بیس گھنٹے ہی سہی لیکن مستقل ہر ہفتے بیس گھنٹے کام کرنا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ذہن اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چوبیس گھنٹے مصروف رہتا ہے اور ہفتوں، بعض اوقات مہینوں، کوئی نتیجہ شعر کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔

ایذرا پاؤنڈ (Ezra Pound: 1885-1972) نے اپنی ایک نظم میں اس علت کی اس طرح شکایت کی ہے کہ میں کسی تمباکو کی دکان کا مالک ہوتا تو بہتر تھا، یہ شعر گوئی کا عارضہ تو کسی پل چین نہیں دیتا۔

O God, O Venus, O Mercury, patron of thieves,
Lend me a little tobacco shop,
or install me in any profession
Save this damned profession of writing,
where one needs one's brains all the time.

☆ مطالعے کی صورتِ حال آپ کے ہاں کیا ہے۔ مثلاً آپ کس قسم کی کتابیں پڑھنا اور کس وقت میں پڑھنا پسند کرتے ہیں اور آپ کے پسندیدہ تخلیق کار کون ہیں اور آپ کی زندگی میں اُن کے اثرات کس رنگ میں ظاہر ہوئے ہیں؟

☆☆ ایک وقت میں مختلف چیزیں پڑھنے کا عادی ہوں۔ میرے سرہانے کئی اردو اور انگریزی کی کتابیں اور رسالے ہوتے ہیں۔ آج ۹ رجنوری ۲۰۱۹ء بدھ کے دن میرے بستر کی ایک جانب جو مطبوعات پڑی ہیں ان کی تفصیل یوں ہے:

اردو رسالے:

امروز علیگڑھ، اردو ادب نئی دہلی، روشنائی کراچی، چہار سو راولپنڈی، استفسار جے پور، اثبات ممبئی، آمد پٹنہ۔

اردو کتابیں:

محبت، جلاوطنی، اور حراست کی نظمیں (ناظم حکمت، ترجمہ فاروق حسن)، بے انت سفر (افسانے، شاہد کامرانی)، حسرت موہانی (خلیق انجم)، مزید حماقتیں (شفیق الرحمن)، انتخابِ ناسخ (رشید حسن خاں)، کثرتِ تعبیر (ابوالکلام قاسمی)، لغزشِ رفتارِ خامہ (بیدار بخت)، آئینے کا آدمی (صبا اکرام)، جنت جہنم اور دوسرے افسانے (اے خیام)، نساخ (ڈاکٹر محمد صدر الحق)

انگریزی رسالے:

The Times Literary Magazine, The New Yorker, Harper's Magazine, South Asian Ensemble, Queen's Quarterly, Arc Poetry Magazine, The New York Review of Books, Granta 117,

انگریزی کتابیں:

The Classical Moment (Views from Seven Literatures), A Distant Episode (Selected Stories by Paul Bowles), Words, Words, and Words (Dr. Khalid Sohail & Sain Sucha), Collected Poems 1920-1954 (Eugenio Montale),

کتابوں، رسائل، اور اخبارات کا مطالعہ میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

میرے ذاتی کتب خانے میں اپنی پسند کی تقریباً سولہ ہزار (16,000) کتابیں ہیں جن میں اردو، انگریزی، ہسپانوی، اطالوی، جرمن، فرانسیسی، روسی، عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، اور لاطینی ادب سے متعلق کتابوں کے علاوہ فلسفہ، تاریخ، بشریات، لسانیات، سوانح، مذاہب، سائنس، ریاضی اور شماریات، اور دیگر مضامین پر بھی خاصا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پڑھنے لکھنے کے لئے مجھے صبح کا وقت زیادہ موزوں لگتا ہے۔ لیکن یہ محض ایک ترجیحی عمل ہے۔

رہی بات میرے پسندیدہ تخلیق کار کی سو وہ اتنے ہیں کہ ان کی فہرست سازی کے لئے خاصا وقت چاہیے۔ میں اپنے اگلوں کے کاندھوں پر سوار ہوں، میرے قد میں اُن سب کا قد شامل ہے۔ اثرات کے ضمن میں بس اتنی احتیاط لازم ہے کہ آوازوں کی یلغار میں اپنی آواز کھونے نہ پائے۔

☆ ایک تخلیق کار کا کسی نظریہ یا حادثہ کا اسیر ہوجانا یا اس کے خول میں خود کو بند کر لینا اس کی تخلیق کو نوحہ نہیں بنا دیتا؟

☆☆ کسی عائد کردہ نظریے یا خول میں گرفتار شخص اپنے تعصبات سے پاک نہیں رہ سکتا۔ اگر فنکار کے نظریے کی تشکیل میں اس کے اپنے فنی عرض البلد اور طول البلد کا غلبہ نظر آئے تو اس صورت میں ادب کی تخلیق ایک فطری عمل بن جائے گا جس میں کسی قسم کی ریا کاری شامل نہیں ہوگی۔

☆ آپ کے یہاں خاص طرح کی بے چینی، بیزاری، بلکہ اکتاہٹ محسوس کرنے والے کس حد تک درست ہیں؟

☆☆ پڑھنے والا بھی اپنے آپ کو خول میں بند رکھ کر مطالبہ کرے کہ اسے صرف ''ادبِ کثیف'' چاہیے، ادبِ لطیف نہیں تو وہ اپنے طور پر حق بجانب ہوگا۔ اچھا ادب تناؤ اور کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔

میں اپنی ایک مختصر نظم سے اقتباس پیش کرتا ہوں کہ اس میں لفظ ''بیزار'' بھی موجود ہے:

ایک کانسی کے برتن سے
لٹکی ہوئی بیل
اک لمس کا سا مکمل سکوت
اور کلائی پہ بیٹھے ہوئے
ایک شکرے کی مانند
بیزار دل!

(کہرآلود صبح۔۔۔ پُھنارہ)

یہ آئے دن کی ایک کیفیت کا تخلیقی اظہار ہے۔

جس طرح زنجیر کی مضبوطی کمزور کڑیوں کے ادراک کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح بے چینی، بے زاری، اور اکتاہٹ ہمیں توانائی کے فقدان کا احساس دلاتی ہے۔ اور ہمارے ہاں اس جنس کی ارزانی ہے۔ اس سے ہم پہلو تہی کیوں کریں؟ اداس ہونا غیر فطری نہیں، لیکن اداسی اور مایوسی دونوں الگ شے ہیں۔

☆ آپ کے کلام میں کتبوں، قبروں، گورکنوں، اور کفن کی تکرار کس امر کی غمّاز ہیں؟

☆☆ میں شماریات کا آدمی آپ کے سوال کو اک اور روشنی میں دیکھتا ہوں۔ ایک گوشوارہ بنائیں اور دیکھیں کہ کون سا لفظ کسی شاعر کے ہاں کتنی بار آیا ہے۔ میرے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں، ساتواں سالِ رواں میں ان شاءاللہ منظرِ عام پر آجائے گا۔ ان چار لفظوں کو ڈھونڈ نکالنا اور گوشوارۂ تکرار (frequency table) تیار کرنا مشکل کام ہے۔ آسانی کے لئے کسی ایک ہی مجموعے کا انتخاب کیجیے۔ پھر ان چار لفظوں میں سے ہر ایک کی کم از کم پانچ سات مثالیں تو فراہم کریں۔ یہ نہ آپ کر پائیں گے نہ میں۔ کیوں کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ اگر بفرضِ محال تکرار کی بات درست ہو تو بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ موت زندگی کا حصہ ہے۔ سارا قصہ تخلیقی اظہار کا ہے۔ ''بے نشاں'' میں شامل ایک پوری نظم ''کتبہ'' درج ذیل ہے:

سیہ پٹّیاں باندھے سب لوگ چُپ تھے
کسی اجنبی نے یہ پوچھا
''یہ کس کا جنازہ ہے؟''
مٹّی لگی انگلیاں
خون آلودہ بوسیدہ پیراہنوں میں
دھڑکتے دِلوں کی طرف اُٹھ گئیں
دستِ رعشہ زدہ کو سہارا دئے
ایک لاٹھی نے تن کر کہا
''یہ جنازہ ہمارا ہے''
پھر ماتا سے بھری ایک بوڑھی کھنکتی صدا گونج اُٹھی
''یہ میرا لہو ہے''
کوئی بنتِ مہتاب بولی
''یہی میری کرنوں کی قوت ہے''
اور پاس ہی اک چہکتے لہو نے بتایا
''یہ لاشہ بشارت ہے اُن موسموں کی
جو آئے نہیں ہیں
مگر جن کی خوشبو کی آہٹ قریب آچکی ہے
لہو سے ہمارا ہے رشتہ وہی جو ازل سے ابد کا
ہماری چمکتی نگہدار آنکھیں ہیں کتبہ لحد کا''

دو سو سے زیادہ صفحوں پر مشتمل اس کتاب میں مجھے ایک اور جگہ لفظ 'کتبہ' نظر آیا، غزل کے ایک شعر میں:

کتبے سارے ایک ہیں قبرستانوں کے
بستی اک بے چہرہ فصل کی کھیتی ہے

دراصل اس طرح کی تعمیم پسندی ہمارے ہاں سکّہ ءرائج الوقت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس سے ادب کا بھلا نہیں ہوتا۔ خاص طور سے اگر لفظ کا تعلق موت سے ہو تو خاکم بدہن کیا یہ کلمہ ءکفر کے مترادف قرار دیا جائے گا؟

☆ وہ کون سے خواب ہیں جن کے ٹوٹنے کا آپ کو غم ہے، نیز یہ کہ اب تک آپ اپنے خوابوں کی کس حد تک تعبیر پانے میں کامیاب ہو سکے ہیں؟

☆☆ آرزو کی شدّت خواب کا تعین کرتی ہے۔ میرے سارے خواب ایک عام آدمی کے خواب تھے۔ اور ٹوٹنے والے خواب میں نے پالے ہی نہیں۔ چنانچہ میں ناکامِ آرزو ہوں نہ زندگی سے گلہ گزار۔

☆ آپ کی بے زمینی کا احساس ہر آن نئے پن کے عمل سے گزر کر کیا کچھ ثابت کرنا چاہتا ہے؟

☆☆ مجھے کینیڈا میں رہتے ہوئے پینتالیس (۴۵) برس ہو گئے۔ برِّصغیر سے یہاں آکر بود و باش کرنے والوں کے ابتدائی مسائل سے میں بھی دوچار ہوا۔ اب حال یہ ہے کہ میرا اور میرے بیوی بچوں کا حال اور مستقبل اسی سرزمین سے وابستہ ہے۔ یہاں کی مٹی میں ہماری جڑیں گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ اور بدن مٹی کا ٹھہرا اور مٹی ایک ہوتی ہے جہاں بھی ٹِک گئے مٹی سے یارانہ ضروری تھا اس عمل میں بُت شکنی کے مراحل بھی آتے ہیں:

چلے ہو جانبِ کعبہ جو یوں شاہینؔ ، یا وحشت!
تمہیں پہلے تو خود اپنے ہی بُت ڈھانا ضروری تھا

یہ زندگی کا ایک ارتقائی عمل ہے جس میں ہمیں کچھ ثابت کرنے کی مہلت ہے نہ احتیاج۔

☆ آپ کی شاعری میں جا بجا جس گھر کی تلاش کا ذکر ہے آخر وہ گھر ہے کہاں؟

☆☆ ایک حسرتِ تعمیر ہے جو بین السطور میں کہیں دفن ہے۔

بحر کی اِس نمکین ہوا نے
کر ڈالی کیا صورت گھر کی

سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی
ہمارے گھر سے یہ پیغمبری نہ جائے گی

رہ کر جن انتہاؤں میں اپنی گزر گئی
اس طرح جینے والے تو جاں بر ہی کم ہوئے

☆ اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ آپ نے اپنی شاعری میں داخلی احساسات کو اپنے گردوپیش کی نسبت زیادہ ترجیح دی ہے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ میں جواب دینے والا کون؟

☆ تیسری دنیا کے لوگوں کی اکثریت ترقی یافتہ ممالک میں محفوظ مستقبل کے خواب دیکھا کرتی ہے جبکہ آپ وہاں کا باقاعدہ شہری ہونے کے باوجود عدم تحفظ کا شکار ہیں؟

☆☆ میں یہاں کا شہری ہوں لیکن کسی عدم تحفظ کا شکار نہیں۔ بلکہ میں نے رضاکارانہ طور پر اداروں کی سطح پر رنگ اور نسل کے قضیوں میں عملی حصہ بھی لیا۔ کئی سال تک National Capital Alliance on Race Relations (NCARR) کا معتمد عمومی اور اس کی ثقافتی کمیٹی کا صدر نشین بھی رہا۔ کینیڈا میں لکھنے والوں کی سب سے بڑی انجمن رائٹرس یونین آف کینیڈا (The Writers' Union of Canada) کی نسلی معاملات کی کمیٹی (Race Issues Committee) کا چار بار سربراہ بھی منتخب ہوا۔

☆ ''محبت'' کو اردو شاعری کی بنیاد کہنے والے اس لطیف احساس کی کمی آپ کے ہاں کیوں محسوس کرتے ہیں؟

☆☆ شاعر کے لئے اپنا مقدمہ لڑنا سخت مشکل کام ہے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں۔ لیکن میرے ہاں مذکورہ لطیف احساس کی شکل کچھ یوں ہے:

برف چپ چاپ گری ہوگی سرِ منزلِ شب
صبح کی آنکھ میں افسانے کہاں سے آئے

پھر ہے اُن آنکھوں کے نیلم میں اک انجانی لکیر
جھیل پر جو تیرتا رہتا تھا بادل چھٹ گیا

ایک کیفے میں بہت دن پہ ملے تھے ہم تم
اور کچھ یوں کہ کسی کو نہ گلہ تھا کوئی

چاند کو تقسیم کرتا اک پرندہ اُڑ گیا
فاصلوں کی آگ میں جلنے لگا سارا بدن

تو ٹھہرتا نہیں میرے لئے پھر ضد کیسی
قید اِس ہم سفری کی بھی اُٹھا دے اب تو

پیڑ نے سائے کے حرفوں میں لکھا تھا جس کو
ڈوبتے چاند وہ تحریر مٹا دے اب تو

روح بد مست ہے رادھا کی طرح
کوئی ملبوس اُٹھا لے جائے

☆ آج کل اردو شاعری میں تجربات کا بڑا غلغلہ ہے۔ آپ نے روایتی شاعری سے ہٹ کر کبھی کوئی تجربہ نہیں کیا؟

☆☆ تجربہ صرف تجربے کی خاطر نہیں کیا۔ ایک نظم سانیٹ کی صنف میں، ایک ٹرزا ریما (Terza Rima) میں، ایک آزاد غزل میں، اور ایک اکیسی میں اور بس۔ ''اکیسی'' میری اپنی کاوش تھی۔ آزاد غزل مظہر امام کے نام لکھی تھی۔ میری اپنی نظموں میں ہیئتی تجربے کی مثالوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

☆ اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور مغرب کے قیام نے کبھی آپ کو انگریزی شاعری اور ادب کی جانب متوجہ نہیں کیا؟

☆☆ ایک بار ٹورنٹو میں سکونت پذیر عزیز دوست بیدار بخت کی نوازش کے طفیل جدید نظم کی آبرو جناب اختر الایمان (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۶ء) نے یہاں آٹوا میں ہمیں میزبانی کا شرف بخشا۔ بے حد یادگار صحبت رہی۔ ان سے میں نے کچھ سوالات کئے جن میں سے ایک یہ تھا کہ اتنے بڑے شاعر اور انعام یافتہ مکالمہ نگار ہونے اور فلمی دنیا سے طویل تعلق رکھنے کے باوجود آپ نے کبھی کسی فلم کے لئے گیت کیوں نہیں لکھا۔ جواباً انہوں نے کہا کہ جو کام مجھے نہیں آتا اس میں اپنی ٹانگ کیوں اُڑاؤں۔

سو یہاں بھی یہی قصہ ہے۔ شعر گوئی اردو میں ہی سروکار رکھا۔ انگریزی میں مضامین لکھے۔ اردو نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا۔ کینیڈین انسائکلو پیڈیا میں بھی لکھا۔ ریڈیو کارلٹن یونیورسیٹی کے لئے ایک سو صفحے کا ادبی مسودہ تیار کیا جو پانچ قسطوں میں نشر ہوا۔ موقع ملا تو اسے کتابی شکل دوں گا۔

اپنے انگریزی رسالے اردو کینیڈا (Urdu Canada) کی ادارت کے علاوہ ایک اور انگریزی رسالے Possibilitiis کی مجلسِ ادارت میں شامل رہا۔ انگریزی میں ایک کتاب Across Continents مرتب کر چکا ہوں۔ ایک اور کتاب زیرِ ترتیب ہے۔

☆ ویسے تو زیرِ نظر اشاعت میں اردو ادب کے نہایت بلند قامت اہلِ قلم نے آپ کے فن کی نسبت بہت کچھ کہا اور سنا ہے۔ آپ ہمیں یہ بتائیے کہ ناقدین کی نسبت آپ کے احساسات بالخصوص اپنے فن کی روشنی میں کیا ہیں؟

☆☆ یونانی اساطیر میں ایک کردار پروکرسٹس (Procrustes) نامی گزرا ہے جو ایک چھوٹا موٹا زمیندار تھا۔ وہ گاہے بگاہے اپنے علاقے میں آئے ہوئے کسی ایک مسافر کو اُٹھوا لیا کرتا تھا اور اس کی بڑی خاطر مدارات کرتا۔ اس کے لئے کھانے پینے کا بہت پُرتکلف اہتمام کرتا۔ مہمان کی شب خوابی کے لئے اُس نے ایک خاص بستر رکھ چھوڑا تھا۔ مسافر اگر لمبے قد کا ہوا تو اس کے پاؤں کاٹ دیتا تھا، اور کوتاہ قامت مسافر کو کھینچ کھانچ کر بستر کے برابر کر دیتا۔ پروکرسٹس کی اس روش کا اطلاق ہمارے بعض نقاد شعر و ادب پر بھی کرتے ہیں۔ ایک رائے پہلے سے قائم کر لی جاتی ہے اور شاعر یا ادیب کو اسی خانے میں فِٹ کر دیتے ہیں خواہ اس کوشش میں فن کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو جائے۔

☆ ہندوستانی، پاکستانی ادب کی تخصیص کرنے والوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں نیز یہ کہ اس طرح کے تجزیوں اور تحقیق سے آپ کے خیال میں کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟

☆☆ ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ اور آزاد مملکت ہیں۔ اُن کے

امتیازات، خصوصیات، اور تشخص، جو اُن میں سے ہر ایک کے جغرافیائی خطوں، قومی و علاقائی زبانوں، رسوم و رواج، دین و مذہب، اور تہذیبی و ثقافتی شناخت سے منسلک ہیں، انہیں آزادانہ طور پر وحدت عطا کرتے ہیں۔ ان میں مشترک عناصر بھی ہیں جن کا ادراک عالمِ انسانیت کے آفاقی تصور کا اسمِ اعظم ہے۔

انگلستان، امریکہ، کینیڈا، اور آسٹریلیا میں بہت ساری باتیں مشترک ہونے کے باوجود ان کا ادب الگ الگ ہے، ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا ادب کی روح کے منافی ہے۔

☆ اردو کے رسم الخط کی نسبت چلنے والی بحث پر آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

☆☆ زبان کی اولین شناخت اس کا رسم الخط ہے۔ رسم الخط کو ختم کر دیں زبان ختم ہو جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے ماضی کا سارا ادب تاریخ کے کباڑ خانوں میں دفن ہو جائے گا۔ چنانچہ اردو رسم الخط کو رومن یا دیوناگری شکل دینے کی ساری کوششیں سیاسی، متعصّبانہ، اور مذموم ہیں۔

☆ پنجاب سے ہجرت کرنے والے اردو ادیبوں کے بعد ہندوستان میں اردو زبان و ادب کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ پاکستان سے وہ اردو ادیب جو ہندوستان میں شرنارتھی بن کر وہاں جا آباد ہوئے ان کی اکثریت نے اپنا ادبی و لسانی تشخص برقرار رکھا لیکن دھیرے دھیرے وہاں کی اردو مخالف سیاسی ریشہ دوانیوں اور نتیجے میں روزگار کے وسائل میں کمی نے انہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ وہ ہندی کی طرف راغب ہونے لگے جہاں مالی منفعت کے امکانات زیادہ تھے۔ ان کی تعداد گھٹتی گئی اور اب اِس گنتی کے لئے ایک ہاتھ کی انگلیاں کافی ہونگی۔ اُن کی آئندہ نسلیں اردو زبان و ادب سے دور تر ہی نہیں، نابلد ہو گئیں۔ موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر، ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے مستقبل کا انحصار پاکستان سے آئے ہوئے اردو ادیبوں سے کسی طور وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ ان کے ماضی کے کارنامے اردو ادب کی تاریخ کا وقیع حصہ ہیں۔

☆ ہم اکثر سنتے آئے ہیں کہ برطانیہ میں فلاں علاقہ پاکستان کے لوگوں سے بھرا ہے، امریکہ میں فلاں شہر بھارتیوں سے منسوب ہے۔ کینیڈا میں صورتِ حال بالخصوص اردو زبان و ادب کے حوالے سے کس طرح کی ہے اور اس سے کس طرح کی خوش امیدی باندھی جا سکتی ہے؟

☆☆ کینیڈا کی تازہ ترین یعنی ۲۰۱۶ء کی مردم شماری (2016 Census of Canada) کے مطابق، تارکینِ وطن کے گھروں میں بولی جانے والی زبانوں میں اردو کا نمبر نواں (۹) ہے۔ اردو بولنے والوں کی مجموعی تعداد دو لاکھ چوسٹھ ہزار پانچ سو پانچ (۲،۶۴،۵۰۵) ہے۔ چند دیگر زبانوں کی درجہ بندی یوں ہے:

۱۔ چینی، مینڈرین
۲۔ چینی، کینٹونیز
۳۔ پنجابی
۶۔ عربی
۹۔ اردو
۱۰۔ فارسی
۱۱۔ ہندی
۱۲۔ تامل
۱۳۔ گجراتی

کینیڈا میں اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی آبادی ٹورنٹو میں ہے۔ کینیڈا میں اردو دانوں کی ایک چوتھائی ملین سے زیادہ آبادی اتنی کچھ کم بھی نہیں، بلکہ یہ کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں کی پوری آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ تاہم جب تک اس مملکت میں جہاں کی قومی زبان اردو ہے وہیں اسے مناسب مقام حاصل نہیں تو باہر کی طرف خوش امیدی کی نظر سے دیکھنا ایک دیوانے کے خواب کے سوا کچھ نہیں۔

☆ آپ کے خیال میں اردو زبان و ادب کا عالمی زبان و ادب میں شمار کس نوعیت کا ہے اور مستقبل کس امر کی نشاندہی کر رہا ہے؟

☆☆ عالمی زبان و ادب کے تناظر میں بات کرنے سے پہلے اپنے گھر کو ٹھیک کرنا ضروری ہے۔ ابتدائی، وسطانی، اور ثانوی اسکولوں، کالجوں، سرکاری و غیر سرکاری محکموں، اداروں، بازاروں، صنعت و تجارت، لین دین، اور اشتہاروں میں اردو کو رائج کریں، یہی وہ کھیتی ہے جہاں عالمی پیمانے کی فصل اُگتی ہے۔

ماضی قریب میں بگر انعام کی مختصر فہرست میں انتظار حسین کے نام کی شمولیت، ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ میں قرۃ العین حیدر اور ن م راشد کے بارے میں تحریریں اس بات کی گواہی ہیں کہ یہ مٹی بنجر نہیں۔

☆ آج کل دنیا میں جو سیاسی، سماجی، اور معاشی کشاکش نظر آتی ہے اس کا انجام آپ کے خیال میں کیا نظر آتا ہے؟

☆☆ ہر شخص کو آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہو اور اس حق کے تحت اسے ساری متعلقہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔

ایک نرا شاعر اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے؟ لیکن یہ خوش گمانی بھی بڑی چیز ہے کہ: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

☆ مغرب میں مقیم تارکین وطن اس صورتِ حال سے کس طرح متاثر ہو سکتے ہیں اور اُس کا تدارک آپ کے خیال میں کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ متاثر تو سب ہوتے ہیں۔ البتہ دور رہ کر معاملات کی سنگینی کا بہتر اندازہ ہوتا ہے۔ بڑی بڑی محرومیوں کا تدارک بڑی منصوبہ بندیوں اور وسائل کی فراہمی سے ہی ممکن ہے۔ تارکین وطن اپنے اپنے طور پر مسئلہ آموزی میں ممکنہ حد تک حصہ بھی لیتے ہیں۔

☆ سنا ہے بھارت میں یونیورسیٹی کی سطح پر آپ کا کلام پڑھایا جاتا ہے۔ کیا آپ ہمارے قارئین کو اس کی تفصیل کے ساتھ مزید پیش رفت سے بھی آگاہ کر سکتے ہیں؟

☆☆ ۱۹۸۴ء میں مکتبہ افکار کراچی نے میرا مجموعہ ''بے نشان'' چھاپا تھا جس کی پورے برصغیر میں پذیرائی ہوئی۔ دس برس بعد ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی نے اس کا ہندوستانی ایڈیشن شائع کیا۔ پروفیسر وہاب اشرفی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھے بتایا کہ میری یہ کتاب ایم اے جدید اردو ادب کے طلبہ کو رانچی یونیورسیٹی اور وِنوبا بھاوے یونیورسیٹی میں پڑھائی جاتی ہے۔ مجھے آج تک ان دونوں یونیورسیٹیوں میں سے کسی ایک میں بھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس خبر سے خوشی ضرور ہوئی۔ چند برس قبل اچانک ایک دن ایک خاتون پروفیسر کا فون آیا جنہیں میری تلاش تھی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں وہی شخص ہوں۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ ڈاکٹر نگار سلطانہ ہیں، نیز یہ کہ ایک ریسرچ اسکالر اُن کی نگرانی میں میری شاعری پر پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں اور کچھ تفصیلات درکار ہیں۔ انہوں نے مسرت انگیز لہجے میں بتایا کہ وہ ایک مدت تک میری شاعری اپنی یونیورسیٹی میں پڑھاتی رہی ہیں۔

(غالباً) جون ۲۰۱۷ء کے اوائل میں ڈاکٹر ہمایون اشرف کی طرف سے میرے نام بذریعہ ای میل اطلاع آئی کہ ۲۷ر مئی ۲۰۱۷ء کو وِنوبا بھاوے یونیورسیٹی ہزاری باغ، جھارکھنڈ، نے منصور عالم فخری کو اُن کی تھیسس ''شاہین کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حقدار ٹھہرایا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے پروفیسر مولا بخش اور رانچی یونیورسیٹی کے ڈاکٹر منظر حسین مقالے کے بیرونی ممتحن تھے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے خط کے ساتھ مذکورہ پی ایچ ڈی کی سند کی اور ایک اردو اخبار کے تراشے کی عکسی نقلیں منسلک تھیں۔ مجھے ان پانچوں میں کسی سے ملاقات کا اب تک شرف حاصل نہیں ہوا۔

☆ چار ہجرتیں آپ کی چار قیام گاہوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ ہمیں اپنے پسندیدہ مقام اور اس کی وجہ تسمیہ بتلائیے۔

☆☆ بھاگل پور، ڈھاکہ، اسلام آباد، اور گذشتہ پینتالیس برس سے آٹوا (کینیڈا) میں سکونت اُن فیصلوں کا نتیجہ رہی ہے جو ہم نے غیر معاشی تحفظات کے تحت کئے تھے۔ اب نظر دوڑاتا ہوں ہوں تو یہ فیصلے کچھ غلط بھی نہیں دکھائی دیتے۔ کینیڈا تقریباً نصف صدی سے ہماری پناہ گاہ اور وطن ہے۔ ہمارے بچوں کا مستقبل بھی اسی سرزمین سے وابستہ ہے۔

☆ اردو ادب اور شاعری سے آپ کو اپنی ذات اور فن کی نسبت کس قسم کی امیدیں اور اُن کے پورے ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟

☆☆ میں نے اردو ادب اور شاعری سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کی تھیں۔ آج تک جس ستائش یا صلے سے نوازا گیا ہوں اس میں میری کسی کوشش کو دخل نہیں رہا ہے۔ جو کچھ ملا ہے بِن مانگے ملا ہے۔ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہوگا۔

☆ آپ کے گھر آنگن میں اردو زبان و ادب اور شاعری کا پودا کب تک لہلہانے کا امکان ہے؟

☆☆ ہمارے چاروں بچے یہیں پلے بڑھے۔ ہماری کوشش رہی کہ گھر پر سب اردو بولیں۔ کچھ عرصے وہ اردو کے اتواری مدرسے بھی جاتے رہے۔ انہوں نے اردو کی فلمیں اور ڈرامے بھی دیکھے۔ اپنے اپنے گھروں میں جا آباد ہونے سے پہلے ہمارے ہاں آنے والے برصغیر کے درجنوں ادیبوں شاعروں کی خاطر مدارات میں عملی طور پر حصہ بھی لیا۔ لیکن خدا لگتی یہ ہے کہ اردو کو یہاں کے معاشی، معاشرتی، اور ثقافتی مطالبوں میں بہت کم دخل ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، انجینیرنگ، ریاضیات اور کھیل کود کے علاوہ ہمارے بچوں کے بچے ٹالسٹائی کے ناول 'اینا کیرینینا' اور لی ہارپر کے 'ٹو کل اے موکنگ برڈ' پر اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہیں یا اسکول میں کھیلے جانے والے کسی ڈرامے پر اخبار کے لئے تبصرہ لکھتے ہیں تو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اور بس۔ تیسری نسل ہماری نہیں، ہمارے بچوں کی ذمہ داری ہے۔

☆ ایک قلم کار کی کامیابی اور ناکامی کا آپ کے نزدیک معیار کیا ہے۔ اپنی بابت اس حوالے سے کیا کہنا چاہیں گے اور مستقبل کے حوالے سے کیا توقعات باندھنا پسند کریں گے۔

☆☆ ایک تخلیق کار کا فن کے تئیں اخلاص ہی اس کی کسوٹی ہے۔ میں اپنے آپ کو اسی روشنی میں دیکھتا ہوں۔

- بقیہ -

''بے نشان'' آئینہ

شاہین کی شاعری میں اس قسم کی نظمیں جگنوؤں کی طرح چمکتی ہیں اور تاریک فضا میں ایک روشنی سی بکھیر دیتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شاہین زندگی کے گھمسان میں اور ہجرت در ہجرت کے تجربے میں ٹکڑے ٹکڑے ہی نہیں ہوئے بلکہ ان کے ہاں مجتمع ہونے کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ ان دونوں زاویوں کو ان کے حقیقی تجربے کی حیثیت حاصل ہے اور وہ مجھے ایسے سچے شاعر نظر آتے ہیں جو دل کی ہر لرزش کو شاعری کا پیکر عطا کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کے اس فن کی ایک جہت ان کی غزل بھی ہے لیکن اس جہت پر پوری نظر ڈالنے کے لیے مجھے کچھ عرصہ شاہین کی غزل کے ساتھ مزید رہنے کی ضرورت ہے۔

''آوارۂ شب''

(شاہین صاحب کا رنگِ سخن)

فاری شا (راولپنڈی)

وہ دن تھے مشقت کے، اب آوارۂ شب ہوں
شرطوں کا روادار نہ پہلے تھا نہ اب ہوں

دستار ہی رکھتا ہوں نہ مرہونِ عنب ہوں
سودا جو مرے سر میں ہے خود اس کا سبب ہوں

دنیا مرے خوابوں کی ہے پاتال سے گہری
بے وزن خلاباز کی تنہائیِ شب ہوں

آزردہ رہا میں تو بہت خوش تھے مرے لوگ
اب خوش ہوں تو کتنوں کی اداسی کا سبب ہوں

اک زخمِ دل و دیدہ ہی سرمایہ ہے میرا
ہؤ تک جو نہ کر پائے وہ درویشِ ادب ہوں

اک اور تناظر سے ہے نظارے کی تثلیث
خود اپنی ہی آنکھوں سے فقط دیکھتا کب ہوں

..... ○ .....

☆

ہتھیلیوں میں دعائیں اکڑ چکی ہونگی
جو صورتیں تھیں وہ کب کی بگڑ چکی ہونگی

مرے کفن میں جو رہتی تھیں رات بھر ملبوس
زمین میں وہ چڑیلیں بھی گڑ چکی ہونگی

نہ صرف یہ کہ پڑا ہوگا کال نگری میں
حویلیاں بھی سِرے سے اجڑ چکی ہونگی

وہ کج کلاہیاں پردردۂ سموم و صبا
نہ جانے کتنے دلوں کو جکڑ چکی ہونگی

ہر ایک شخص یہاں اجنبی ہی رہتا ہے
تہیں کچھ اور بھی چہرے پہ پڑ چکی ہونگی

وہ خود کلامیاں یک طرفہ بھی سلامت ہیں
لڑائیاں جو بہت خود سے لڑ چکی ہونگی

ہمیشہ وقت کو اصرار تھا کہ میں کیوں ہوں
پر اب تو وقت کی سانسیں اکھڑ چکی ہونگی

○

☆

آگ پرانی یادوں کی دہکا لیں گے
سرد رُتوں میں اپنے دکھ کا مزہ لیں گے

بے سر و سامانی کا اب جو عالم ہے
اپنے آگے بھی دامن پھیلا لیں گے

کتنے جتنوں بعد ہنر یہ سیکھا ہے
گھر کے گلدانوں میں درد چھپا لیں گے

اپنا دکھ تو اکیلے جھیلنا ہوتا ہے
غم خواروں میں تھوڑا جی بہلا لیں گے

ہم تم بھی تو گردش میں ہیں زمین کے ساتھ
دوڑ میں سب سے آگے رہ کر کیا لیں گے

خود سے گزر جانے کا یہ دن بھاری ہے
آج تو ہم تم سے بھی کوئی وعدہ لیں گے

اتنے بوجھ اٹھائے ہیں شاہین جہاں
ہنستے بولتے اب اک اور اٹھا لیں گے

○

☆

باغ کی حرمت اپنی حرمت باغ اپنے یا اور کے ہیں
پتھر سے پھل توڑنے والے خود پتھر کے دَور کے ہیں

اب ہے بدن پر خاک کی چادر آٹوا ہو یا قطب شمال
پاٹلی پتر کے باسی ٹھہرے ہم نہ کسی لاہور کے ہیں

دیکھی ہے اُس آنکھ سے لپٹی ہم نے اکثر گردِ ملال
گردش میں جھوٹے یہ قصے سارے جفا و جور کے ہیں

دنیا گھوم کے لَوٹ آئے ہیں ڈھونڈیں اور ٹھکانے کیا
اچھے برے یہ لوگ ہیں جیسے سارے اپنے طور کے ہیں

کیسے کیسے کھینچ رکھے ہیں اپنے گرد یہ سارے حصار
میزیں سب لوہے کی ہیں گلدان مگر بلور کے ہیں

..... ○ .....

☆

جسے وہ ڈھونڈ کے دلگیر ہو گئی ہوگی
پرانی کتنی وہ تصویر ہو گئی ہوگی

اُس ایک حرف کو جو درد کی امانت تھا
زباں تک آنے میں تاخیر ہوگئی ہوگی

ملے تو گردِ سفر تھی بدن پہ دونوں کے
وہ گرد تجھ کو بھی زنجیر ہوگئی ہوگی

کسی کا کون یہاں انتظار کرتا ہے
ہوائے شام عناں گیر ہوگئی ہوگی

وہ داستاں کہ مرے روز و شب کا حاصل تھی
لرزتے ہاتھ کی تحریر ہو گئی ہوگی

جو تو نے ڈالی تھی اک روز بے خیالی میں
اُس اک نگاہ کی تشہیر ہو گئی ہوگی

پھرے ہیں ہم بھی کمنڈل لئے کبھی شاہینؔ
عجیب عمر تھی تقصیر ہوگئی ہوگی

○

☆

اندر مر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں
سال گزر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں

دبے ہوئے اک اَن دیکھے بوجھ تلے
بوجھ اتر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں

شام کی محفل کی گرمی وہ ساتھ لئے
لَوٹ کے گھر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں

دیتے ہوئے دعائیں سب کو گلیوں بیچ
کاسہ بھر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں

کھڑے قطار میں اپنی باری آنے تک
وقت گزر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں

شام کو اک خیمے سے لگے الاؤ کے پاس
جسم ٹھہر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں

ایک خلش شاہین چھپائے سینے میں
زخم تو بھر جاتا ہے ہم رہ جاتے ہیں

○

☆

یہ کیسا بے سبب اک بوجھ سا دل پر لیا میں نے
اُسے جانا نہیں آموختہ بس کر لیا میں نے

جہاں بھی جاؤں میرا چاند میرے ساتھ چلتا تھا
بس اتنی بات تھی جس کا بھروسا کر لیا میں نے

یہاں گنجان آبادی ہے پر ہمسائگی کم ہے
سو اپنے دل کو روزن کی کرن سے بھر لیا میں نے

یہاں کوئی کسی کو جاننے کا دکھ نہیں سہتا
سو خود سے بھی مکر جانے کا وعدہ کرلیا میں نے

تساہل تھا مرا یا دردِ دل کی بے کرانی تھی
کہ اوروں کی انا کا بوجھ اپنے سر لیا میں نے

میں کیوں کرتا رہوں شاہین پھر قبلہ درست اپنا
کہ جب الزام سارا کج کلاہی پر لیا میں نے

..... ○ .....

ہم سے کوئی کم تر ہے نہ بر تر ہے زیادہ
ترے غم کی ضرورت پڑ گئی ہے

لیکن جو برابر ہے برابر ہے زیادہ
کہ اب جینے کی عادت پڑ گئی ہے

دنیا کی نظر تاج و قبا پر ہے زیادہ
یہ دل تو اب بھی ہے انمول لیکن

لیکن ترا برباد تونگر ہے زیادہ
ذرا گردِ قدامت پڑ گئی ہے

اتنا تو نہ گہرا تھا سکوتِ سرِ ساحل
دعائے خیر و برکت کون مانگے

سر مارتی موجوں میں سمندر ہے زیادہ
گنہگاروں کی قلت پڑ گئی ہے

یہ سرحدیں، لپٹی ہوئی بانہوں کے ہیولے،
کٹھن ہے بے گھری کا کام کتنا

کہتی ہیں کہ جو قہر ہے باہر ہے زیادہ
گلے کیسی مشقت پڑ گئی ہے

ہم دیکھتے رہتے ہیں مگر دیکھتے کب ہیں
ملے تھے جانے ہم کس طور اب کے

دل راکھ ہے یا بوجھ پلک پر ہے زیادہ
گرہ سی وقتِ رخصت پڑ گئی ہے

اب اس کو ہوا چاہے جہاں شوق سے لے جائے
بسنتی چاندنی میں زرد کچھ اور

بادل مری دھرتی سے بھی بنجر ہے زیادہ
شبِ ہجراں کی رنگت پڑ گئی ہے

ملتا ہے تو بڑھ جاتی ہے جینے کی کشش اور
ستارے اب ہمیں ڈھونڈیں تو کیسے

وہ شخص کہ تصویر سے باہر ہے زیادہ
در و دیوار پر چھت پڑ گئی ہے

اٹھ پاتے نہیں جن کے قدم بھی مرے آگے
یہ قصہ پاک ہو جاتا تو اچھا

کہتے ہیں وہ کاندھے پہ مرے سر ہے زیادہ
قیامت بیچ مہلت پڑ گئی ہے

کرنا نہ پڑے پھر اسی دشمن سے لڑائی
افق بڑھتا چلا جاتا ہے آگے

کچھ شور سا اب کے مرے اندر ہے زیادہ
بہت مہنگی مسرّت پڑ گئی ہے

ڈالی تھی نظر اس نے اچٹتی سی سرِ شام
بہاراں ہے نئی آنکھوں کا موسم

دیکھا ہے کہ وہ آنکھ منور ہے زیادہ
نشے کی اب ہمیں لت پڑ گئی ہے

چھت کا اگلا سرا ٹپکتا تھا
دل مرا کان میں دھڑکتا تھا
کوئی افتاد آپڑی ہوگی
بولنے میں بہت اٹکتا تھا
تھا وہ حلقہ بگوشِ بے ہنراں
وہ جو اپنے ہنر میں یکتا تھا
تا رہے حرفِ آخر اُس کی بات
بات کو بیچ سے اُچکتا تھا
'پھر ملیں گے' یقین سے لیکن
عمر ایسی تھی کہہ نہ سکتا تھا
دور رہنا جو چاہتا بھی نہ تھا
پاس آتے ہوئے جھجکتا تھا
تھا نہ یادوں کا حرف سے پیوند
لکھ کے میں خود کو بھول سکتا تھا
آگہی میں سرور تھا ایسا
سرِ منزل بھی دل بھٹکتا تھا
روح تھی سرد تن دہکتا تھا
آنچ کس کی تھی کون پکتا تھا
پاس لاٹھی تھی میرے بابا کی
پیچ و خم میں کہاں اٹکتا تھا
ذہن لہروں میں ڈوبتا ہوا سا
میں مگر تیرتا تھرکتا تھا
ڈالیاں جھڑ چکی تھیں پتوں سے
اک پرندہ مگر چہکتا تھا
آنکھ اپنی دکھاتا سورج کو
ایک ذرّہ کہیں چمکتا تھا
خط تو رکھ لیتا، کھولتا نہ سہی
اتنی زحمت تو کر ہی سکتا تھا
دور سے ہی دریچہ کھولتے ہیں
پہلے چہرہ وہاں جھلکتا تھا
چاندنی بھی فسانہ بُنتی تھی
سر سے بادل بھی کم سرکتا تھا
یوں اچانک نہ ڈوبتا تھا دل
زخم بھی دھیرے دھیرے پکتا تھا
خود ہی بن بن گیا کھلونا میں
کوئی بچہ اگر بلکتا تھا
دل شکستہ سہی پر اے دنیا
میں ترا غم سنبھال سکتا تھا
لے چلا تھا وہ اپنے ساتھ مجھے
خود جو ہر گام پر بہکتا تھا
جانور چونک اُٹھے ترائی کے
کوئی پتھر کہیں لڑھکتا تھا
چاند سا دشت میں چمکتا تھا
تن سلگتا تھا درد پکتا تھا
رُک کے تنہائی میں سسکتا تھا
سایا تھک جائے میں نہ تھکتا تھا
میں قفس میں تھا، آشیاں پھر بھی
غیر کی آنکھ میں کھٹکتا تھا
تھا غلط فہمیوں کا بوجھ اتنا
رشتہ ء حرف ٹوٹ سکتا تھا
کسی کاندھے نے آسرا نہ دیا
دھیان پہروں پڑا سسکتا تھا
اک عجب رات تھی اماوس کی
جانے کس چاند کو وہ تکتا تھا
ٹوٹ کر گر پڑے گا اب جیسے
پیڑ آندھی میں یوں لچکتا تھا
شہر کا نام وہ نہ شہر ہے وہ
نام وہ جس پہ دل دھڑکتا تھا
اُٹھ رہا تھا مری غزل سے دھواں
دور بادل کہیں کڑکتا تھا
اپنی نا ذمہ داریاں تھیں وہ
کب کوئی اس طرح چھلکتا تھا
عذرِ ناطاقتی بھی عجلت بھی
ہانپتا تھا مگر لپکتا تھا
ختم شاہین پر تھی کج کُلہی
سادگی میں بھی اپنی یکتا تھا

''کسی مے خوار کا گھر''

افسر ماہ پوری

(●)

ہائے یہ بے سروسامانی و بے ترتیبی
زندگی کیا کسی مے خوار کا گھر ہے، اے دوست

مجھے علم نہیں کہ شاہین نے اپنے دوست سے جو سوال کیا ہے اس کا کیا جواب دیا گیا لیکن اگر وہ مجھ سے یہ سوال کرتے تو جواباً یہ عرض کرتا کہ اگر وہ زندگی جس کی تصویر کشی شاہین نے اپنے اس شعر میں نہایت موثر طور پر کی ہے، انہیں مل جاتی تو اس کی بے سروسامانی پر ''سروسامانی'' اور اس کی بے ترتیبی، ترتیب میں منتقل ہو جاتی اور اگر وہ خراباتی بھی ہوتے تو بھی ان کا گھر نوک پلک سے درست اور نہایت سلیقے سے آراستہ و پیراستہ نظر آتا کیونکہ مذاق و مزاج کی جو شائستگی و پاکیزگی انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے وہ بدنظمی و بے ترتیبی کی ہرگز متحمل نہیں ہوسکتی اور ان کی سیرت و شخصیت کا یہ ایسا مابہ الامتیاز پہلو ہے جو ان کے ہم عمر و ہم عصر شعراء میں تقریباً مفقود ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ نہ تو ان کی زندگی، سیاسی و معاشی حالات و حوادث کے باوصف کبھی انتشار و اختلال کا شکار ہوسکی اور نہ ان کی شاعری میں کبھی بدنظمی و بے ترتیبی راہ پاسکی۔

سقوط سے پہلے ڈھاکا اردو کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ سابق مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ہونے کے ناتے اس شہر کی اہمیت و وسعت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ چنانچہ شعروادب کی سرگرمیاں بھی اسی شہر میں سب سے نمایاں تھیں۔ ایک ادنیٰ اردو کا کارپرداز ہونے کے باعث راقم کے مراسم ہر عمر اور ہر مکتب فکر و فن کے شعرا سے قائم تھے۔ لیکن جواں سال و جواں فکر شعرا میں شاہین اپنی زندگی اور اپنی شاعری دونوں میں جس قدر سنجیدہ نظر آئے اس قدر کوئی اور نظر نہ آیا اور یہی سبب ہے کہ وہ زندگی اور شاعری دونوں میں بلند سے بلند تر مراتب حاصل کرتے گئے اور انہوں نے اپنی مثال سے یہ ثابت کردیا کہ محنت و ریاضت چاہے زندگی میں ہو یا شاعری میں، رائیگاں نہیں جاتی۔ چنانچہ اسی محنت و ریاضت کی بدولت آج شاہین اپنے فکر و فن کے جس بلند زینے پر دکھائی دیتے ہیں وہاں وہ اپنے ہم عصر و ہم عمر شاعروں خصوصاً جدید شعراء میں کچھ زیادہ ہی قد آور و سربلند نظر آتے ہیں۔

شاہین کے دوست احباب اور ملنے ملانے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ طبعاً کم گو اور متین واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو زیادہ زحمت نہیں دیتے۔ اس کمی کی ان کے ہونٹ مسکرا کر تلافی کرتے ہیں اور جب ان کے ہونٹ مسکراتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ذہانت و شرافت کی روشنی چمکنے لگتی ہے۔ وہ ہر نقطۂ نظر سے عملی آدمی ہیں۔ وہ بولتے کم اور کام زیادہ کرتے ہیں۔ یہی انداز ان کی شاعری کا ہے۔ ان کی زبان جس قدر کم بولتی ہے ان کی شاعری اسی قدر زیادہ بولتی ہے مگر نہایت مدھم، دل نشیں اور روح پرور انداز سے۔ اس لیے شاہین سے ملنے اور ملتے رہنے پر بھی اتنے سمجھ میں نہیں آتے جتنی اُن کی شاعری انہیں تفصیل سے سمجھاتی ہے۔ چنانچہ انہیں اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کو غایت توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور ان کی شاعری کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کا گہرا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہر چند شاہین نے اپنا شعری سفر کلاسیکی رنگِ سخن سے کیا اور وہ اس رنگِ سخن سے خاصی مدت تک وابستہ رہے، لیکن اس رنگ میں بھی ان کی جدت و جودت کے نقوش جا بجا جھانکتے تھے اور ان کی فکری تازگی و تازہ کاری کا احساس چند شعروں کے مطالعے ہی سے ہوجاتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ ایک مخصوص و منفرد لب و لہجے کے شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری میں جلد اپنا مقام بنالیں گے جس کی سب سے روشن و محکم دلیل ان کا اولیں شعری مجموعہ ''رگِ ساز'' ہے جو ۱۹۶۷ء میں ڈھاکا سے اشاعت پذیر ہوکر دنیائے شعر و ادب میں خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ ''رگِ ساز'' ڈھاکے سے اس طباعتی حسن و خوبی کے ساتھ شائع ہوا جس کی نظیر اس سے پہلے موجود نہ تھی چنانچہ مشرقی پاکستان اور ملک کے اس حصے میں یہ مجموعہ کافی مقبول ہوا اور جدید شاعرانہ آوازوں میں ان کی آواز بھی اپنی انفرادی گونج برقرار رکھے ہوئے شامل ہوگئی۔

شاہین تدبر و تفکر کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک وہبی فنکار ہونے کی حیثیت سے اردو شاعری میں جو نت نئے اسلوبی، ہیتی اور فنی تجربے تدریجی وسعت و اہمیت حاصل کرتے جارہے تھے، ان سے وہ غافل نہ تھے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ وہ اپنا سابقہ رنگِ سخن ترک کرنے اور شاعری کی نئی ہیئت و صحت اختیار کرنے لگے۔ چنانچہ چند سالوں کے بعد جدید شاعری ہی ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ''بے نشاں'' (جو حال ہی میں شائع ہوا ہے) تک پہنچتے پہنچتے ان کی اور ان کی شاعری کی نشانی بن گئی اور جدید شعرا میں وہ اپنے اعتدال و توازن کی وجہ سے الگ جانے پہچانے جانے لگے اور ان کی یہ پہچان بڑی ریاضت و مشقت کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ شاہین نے جدید رنگ سخن انفرادی طور پر ہی قبول نہیں کیا بلکہ اسے تنظیمی نہج پر بھی فروغ دیا۔ محمود پور، ڈھاکا میں جو جدید مصنفوں اور فنکاروں کی انجمن برسرِ عمل تھی وہ انہی کی مساعی جمیلہ کی مرہونِ منت تھی۔ جن جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں نے ان کے ساتھ مسلسل تعاون کیا اور اس انجمن کو سقوطِ ڈھاکا تک فعال رکھا ان میں پروفیسر محمود واجد، صبا اکرام، انیس صدیقی، ہلال جعفری اور شاہد کامرانی قابلِ ذکر ہیں۔ صبا اکرام نے معتمد کی حیثیت سے اس سلسلے میں بہت کام کیا۔ صبا اکرام کا پہلا مجموعہ کلام ''سورج کی صلیب'' پہلے ہی شائع ہوچکا ہے۔

شاہین کسی گروہی مکتب فکر و فن سے کبھی منسلک نہیں رہے۔ البتہ جدید شاعری کو حسن، توازن اور تاثیر و تاثر کے ساتھ پیش کرنے میں وہ پیش پیش رہے ہیں۔ جدید شاعری سے یہ شکایت ہے کہ وہ سمجھ میں نہیں آتی لیکن شاہین کی شاعری

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجیے

"کہنگی کھا چکی صحیفے کو"

پروفیسر ممتاز حسین

(•)

ولی عالم شاہین پہلے مشرقی پاکستان میں رہتے تھے جواب بنگلہ دیش ہے۔ وہ بہار سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے لیکن وہاں کے مقامی لوگ انہیں پاکستانی قومیت اور بنگالی سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی بہاری ہی کہتے تھے۔اس لیے وہ کبھی کبھی یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوتے:

تم تو وطن میں رہ کے بھی کہلائے اجنبی
اس اجنبی دیار میں کیوں آئے اجنبی

اس کشت وخون کے زمانے میں جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہو گیا۔ وہ تہہ تیغ فریاد ہی کرتے رہے،ہم مسلمان ہونے کے ناتے تمہارے بھائی ہیں۔ایک اُمت کے ہیں،ایک پیغمبرؐ اور ایک کتاب کے ماننے والے ہیں۔لیکن چھری چلتی رہی اور جب وہ رگ گردن میں اُتر آئی تو وہ کہنے پر مجبور ہوئے:

کہنگی کھا چکی صحیفے کو

چنانچہ شاہین کی شاعری میں بے گھری کے غم کے علاوہ ایک بڑا غم اس بات کا بھی ہے کہ زمین سے تو اُن کی نسبت گئی ہی تھی آسمان سے بھی جاتی رہی:

ہر ایک سمت جب اس کو پکارنا ٹھہرا
وہ پھر مری رگِ جاں سے قریب کیا ٹھہرا

قبائلی دور میں کسی قبیلے سے نسبت ہوتی، جاگیردارانہ نظام میں کسی شہر سے نسبت ہوتی، ماڈرن نیشنلزم کے دور میں کسی ملک سے نسبت ہوتی ہے لیکن یہ ساری نسبتیں بڑی سطحی سی ہیں۔ایک پہچان تو ہو جاتی ہے لیکن اس سے زندگی کی معنویت کی تشریح نہیں ہوتی ہے اور نہ اس سوال کا جواب ملتا ہے۔ میں کون ہوں اے ہم نفساں؟ مری خاک اور آگ کس جہاں سے ہے۔اس موقع پر ہمارے متصوف شعرا اپنی پہچان یوں کراتے:

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

اور جن کو اس کبریائی کا یارانہ تھا اور خدائی کو دردِسر تصور کر کے مقامِ بندگی پر فخر کرتے اُن کے لیے بھی میر صاحب ایک شعر کہہ گئے ہیں:

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

بہرحال عبدہٗ اور انا الحق کا جھگڑا بہت پرانا ہے۔ جب سے اہلِ دنیا میں اس خیالی نے جدید تحقیقات کی روشنی میں اپنی جگہ بنائی ہے کہ زندگی میں ایک وحدت اور ارتقا ہے، آدمی اپنی زندگی کے مبداء کے لیے اوپر دیکھنے کے بجائے زمین پر دیکھنے لگا ہے۔میر بہت پہلے کہہ گئے تھے:

پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور بیدلؔ نے تو کھلے بندوں آدمی کا حیوانی باپ بندر کو ٹھہرایا ہے

چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہمارے متصوف شعرا نے بشمول اقبالؔ زندگی کو جاوداں ٹھہرایا ہے اور ارتقائے حسن کا آئینہ نقابِ روئے یار میں رکھا ہے اور اس تصور سے درگزرے ہیں کہ کوئی اس خاک دان کی حیات سے ماورا بھی کوئی جاودانی ہے۔ میر نے تو چشمۂ آبِ بقا کو خاک سے پاٹ دیا اور غالب نے خضر کو منہ چھپائے پھرتے رہنے کا طعنہ دیا:

نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

اور اپنی عارضی زندگی کو حقیقی زندگی قرار دیا۔ یہ عارضی زندگی ایک فرد کی ہے نہ کہ قوتِ حیات یا نوعِ انسانی کی۔لیکن اس سے زیادہ اہم ایک تبدیلی اس نقطۂ نگاہ میں پیدا ہوئی جو اخلاق کو دیکھنے اور سمجھنے اور برتنے کا ہے۔

اخلاق کی طرف ایک رویہ یہ ہے کہ وہ آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں اخلاق اور نیکی کے ساتھ زندگی بسر کرو گے تو عاقبت میں یعنی دوسری دنیا میں جہاں نہ تو کوئی حرکت نہ تغیر نہ تبدیلی ہوگی بلکہ ایک ساکت لمحہ از کراں تا بے کراں ہوگا۔ ہمیں اس کا اجر ملے گا۔حور ملے گی، قصور ملیں گے۔ غالب نے اسے زاہد کا اجر بتایا اور اقبال نے بت و بت خانہ کہہ کر اس پر ایسی ضرب لگائی کہ محمود غزنوی نے سومنات کے بُت پر بھی نہ لگائی ہوگی:

حرف با اہلِ زمین رندانہ گفت
حور و جنت رابت بت خانہ گفت

انسان کا اخلاق مقصود بالذات ہے۔ وہ نہ تو کوئی سکہ مبادلۂ شے کا ہے اور نہ مقصود بالغیر ہے۔جس طرح کسی پھول میں خوشبو، پھول کی خاصیت ہوتی ہے اور جب وہ خوشبو جاتی رہتی ہے تو وہ پھول بے معنی ہو جاتا ہے۔اسی طرح انسان کا اخلاق اس کا جوہر ہے۔اخلاق کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں لیکن اخلاق کی بنیاد باقی رہتی ہے۔ انسان کی تلاش اُسی وقت شروع ہوتی ہے جب کہ اس سے اس کا یہ جوہر جاتا رہتا ہے۔آدمی کا یہ اخلاق کسی تاجرانہ قدر کا نہیں ہوتا ہے کہ اس سے حور وقصور خریدے جائیں بلکہ اس کی اس شناخت کا ہوتا ہے کہ وہ حیوان محض نہیں ہے۔ایک باشعور با اخلاق معاشرتی آدمی ہے۔

انسان کو حیوان محض سے ممیز کئی صورتوں سے کیا گیا ہے اس کی ایک تعریف تو یہ ہے کہ آدمی حیوان ناطق ہے اور دوسری تعریف یہ ہے کہ وہ ایک معاشرتی حیوان ہے۔ان دونوں تعریفوں میں حیوان ناطق کا حوالہ تو اکثر دیا جاتا ہے لیکن اس کے معاشرتی حیوان ہونے کی وضاحت کم کی گئی ہے۔اسے بالعموم ایک فرد کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور اس رشتے سے کم دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایک رکن ایک معاشرے کا بھی ہوتا ہے اور یہ کہ انسان نے نطق اور شعور کی دولت بھی

معاشرتی زندگی ہی میں حاصل کی ہے۔

انسان اپنا رزق آپ پیدا کرتا ہے اس کے برعکس حیوان اپنا رزق پیدا نہیں کرتا ہے۔ آدمی کی سماجی زندگی کا راز اس کی اسی زندگی میں پنہاں ہے جو تعاون اور تقسیمِ کار کی حامل ہے۔ آدمی جہاں تک فطرت سے جزوی طور پر اس طرح جدا ہوا کہ وہ اپنا رزق خود پیدا کرنے لگے وہاں وہ وافر پیداوار، اوقات، فرصت، تقسیم کار، تبادلے کی قدر کے وجود میں آنے سے اپنے کو معاشرے میں رہتے ہوئے جزوی طور پر اپنے معاشرے سے جدا دیکھنے لگا۔ اس میں ایک ''میں'' کا احساس اپنے تخلیقی عمل اور صنعت کاری کا احساس، اپنی فکر اپنے تخیل کا احساس، اپنی خلوت کا احساس۔ مختصر یہ کہ انفرادی آزادی کا احساس پیدا ہوا۔ اس انفرادی آزادی نے اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں اہم ترین خدمت انجام دی ہے۔ چنانچہ کسی بھی معاشرے کا اصلی مقصد باصلاحیت افراد کا پیدا کرنا ہے، ایسا ماحول اور ایسے مواقع فراہم کرنا ہے جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے جوہر ذاتی کو ابھار سکے، اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکے اور اس کا اظہار کر سکے۔ اس سلسلے میں افراد کو بھی بہت سی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن ان ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے معاشرے کے اس مقصد پر حرف نہیں آتا ہے کہ اس کا مقصد انسان پیدا کرنا ہے۔ آدمی کو انسان بنانا ہے۔

قدیم ادوار میں باوجود اس بات کے کہ معاشرہ کم ترقی یافتہ تھا۔ معاشرے کا مقصد دولت پیدا کرنا نہ تھا بلکہ آدمی کو انسان بنانا تھا۔ لیکن جوں جوں معاشرہ دولت آفرینی کی راہ پر چل پڑا اور نظام زر کی حکمرانی میں آدمی ایک شے منجملہ اسباب سے حیات بن گیا محنت ایک قابلِ خرید اور قابل فروخت بازار کی جنس بن گئی۔ اس کا نظامِ تعلیم بھی دولت آفرینی کے مقصد کے تابع ہو گیا۔ وہ انسان باقی ہی نہیں رہا۔ نہ تو وہ خود مقصود بالذات رہا اور نہ اس کا اخلاق مقصود بالذات رہا۔ بلکہ ہر شے نظامِ زر کے تابع ہو گئی۔ اس صورتِ حال سے مٹھی بھر افراد نے فائدہ تو ضرور اٹھایا لیکن بھاری اکثریت آدمیوں کی انسان سے محنت کی ایک حاصل شے میں تبدیل ہوتی گئی اُسے آپ حیوان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا نوحہ ہمارے شعرا کرتے آئے ہیں:

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

رومی نے کہا تھا:

از دام و در ملولم و انسانم آرزو است

وہی آرزو اس دور کے باشعور شاعر کی ہے اور وہی آرزو شاہین کی بھی ہے۔ مگر ان کے حوالے مختلف ہیں۔ وہ گفتگو دورِ حاضر کے محاوروں میں کرتے ہیں:

تعاقب کر رہے ہیں لوگ اپنا
کشاکش میں شناسائی پڑی ہے

ریزوں میں بٹ گیا ہوں میں شاہین ہر طرف
پہچان لے مجھے مرے بکھرے نشان سے

کتنے سارے ایک ہی قبرستانوں کے
بستی، اک بے چہرہ فصل کی کھیتی ہے

اب تو ہستی کا مقدر ہیں تہی مائیگیاں
ذہن اور جیب کا رشتہ بھی بڑا ہو جیسے

زندگی کچھ حساب کم و بیش ہی نہیں ہے بلکہ ایک کیفیت کا بھی نام ہے۔ زندہ رہنے زندگی کرنے اور زندگی برتنے کی کیفیت۔ اسی کیفیت کی بنیاد پر خوب و ناخوب، خوبصورت اور بدصورت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ آج جب کہ سارے انسانی رشتے، نہایت تیز رفتاری کے ساتھ، سرمائے کی حکمرانی میں زر کے رشتوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں اور استحصال کی قوت، انسانوں کو اشیاء میں تبدیل کرتی جا رہی ہے پورا معاشرہ ایک پتھر معاشرے میں تبدیل ہو چکا ہے اور ہر فرد و بشر سنگ دل ہونے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے۔ اس معاشرے میں اور اس حالت میں کیا کوئی محبت کے گیت گائے گا۔ چنانچہ میں نے یہ دیکھا کہ شاہین کی شاعری میں محبت کی گفتگو بہت کم ہے۔ اس لیے نہیں کہ آرزوئے محبت نہیں بلکہ اس لیے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا کہ اس سنگ دل نظم میں جس میں صرف سکۂ زر رقص کناں ہو، بھلا کیا محبت کی گفتگو ہو سکتی ہے۔ ہاں کچھ غمِ دوراں کی بات ہو سکتی ہے جس میں کبھی کبھار محبت کی گفتگو بھی در آتی ہے۔

شاہین کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ جہاں شخصیت کسی مرکزیت کے بغیر ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتی ہے وہاں آدمی اَنا کے دام میں گرفتار ہو کر ایک بے رحم درندہ بن جاتا ہے۔ فرد کی نسبت معاشرے سے ہے اور اگر اس کا شعورِ ذات شعور غیر کے درد کا حامل نہیں ہے پروردۂ نوائے چمن نہیں ہے تو وہ شعورِ انسانی نہیں ہے بلکہ نفس کاری کا ایک آلۂ کار ہے:

میں کہ شاہین ہوں خود اپنی انا کا گھایل
کوئی بڑھ کر مرے نرغے سے نکالے مجھ کو

اَنا کے نرغے سے نکلنے کا راستہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اسے شعور غیر سے رشتہ دیا جائے اور اسے درد مشترک کا حامل بنایا جائے۔ شاہین کی شاعری اس کی طرف بھرپور اشارہ کرتی ہے۔ چنانچہ موجودہ ادب میں خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں، انسان کی اس بے وقعتی اور تہی مائیگی کا غم واندوہ عمومیت کے ساتھ ملتا ہے۔ دورِ حاضر کی تہذیب کے متعدد روگ سماجی اور نفسی ہیں۔ ان میں منجملہ اور بیماریوں کے اپنی شناخت کا مسئلہ خاصا اہم ہو چکا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ قبیلے سے قوم اور پھر ملت کی طرف لوگوں کا سفر شناخت کی جستجو میں تھا۔ اب مشرق میں وطن کی طرف اور مغرب میں کسی طرف بھی نہیں، صرف اپنی انا کی طرف۔ اپنے نفس کی طرف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ عالمی شعریت کا درد ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پیمانِ وفا بھی ہیچ ہے۔ اگر کوئی عقلی اصول کوئی میٹا فزیکل اصول زندگی میں نہیں ہے تو پھر ایک پیمانِ وفا ہی سہی، کوئی نہ کوئی مکرزی نقطہ شخصیت میں پیدا کرنا پڑتا ہے جس سے

شخصیت کی شیرازہ بندی ہو سکے۔ وہ نقطہ نہ ہو تو پھر شخصیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ مگر اس سے کچھ کم اہم اس بات کا جائزہ لینا نہیں ہے۔ ہمارے سماجی رشتے جو رشتۂ زر اور رشتۂ استحصال میں تبدیل ہو گئے ہیں انہیں انسانی رشتوں میں تبدیل کرنا ہے اور چونکہ اب ہم ماضی کی طرف لوٹ نہیں سکتے ہیں۔ اب ہم اس انسانیت کو صرف مستقبل میں معاشرے کی نئی تشکیل ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس باب میں یہ بھی سوچنا ہے کہ ہم جو ایک متحرک وجود ہیں بنتے رہنا ہمارا مقدر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں ماضی کھا جائے اور ہم اپنے مستقبل کی تعمیر میں ناکام رہ جائیں۔

بہرحال بات آگے نکل گئی شاہین کی شاعری فکر انگیز ہے۔ تہہ حرف کچھ سوچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں فکر شعر سے زیادہ فکر زیست ہے مگر وہ فکر سمٹی ہوئی ہے، اس میں جو تشکیلی قوت ہے وہ ان کے جمالیاتی احساس سے بہرہ ور ہے ان کی ایک چھوٹی سی نظم ''رقصِ حیات'' ملاحظہ ہو:

بار بار اک چڑیا
تیر بن کے اڑتی ہے
بیچ کھا کے مڑتی ہے
میگھنا کے پانی میں
ڈبکیاں لگاتی ہے
اور پھر لبِ ساحل
بال و پر سکھاتی ہے
بار بار اک چڑیا
میگھنا کے پانی میں

شاہین کا یہ شعری ڈکشن بڑا منفرد ہے ان کی زبان سادگی اور قوت کی زبان ہے۔ پوری نظم ایک ایسی امیجری بناتی ہے جو قوتِ حیات کی غمازی کرتی ہے۔ ان کا یہ منفرد اسلوب سادگی زبان کے ساتھ ان کے سارے کلام میں ملے گا۔ وہ شعری ڈکشن کی تلاش میں نہیں رہتے ہیں نہ خواہ مخواہ استعاروں کے پیچھے بھاگتے ہیں بلکہ روزانہ زندگی کی گفتگو میں وارد ہونے والے الفاظ سے چند ایسے الفاظ چُن لیتے ہیں جو ان کے جذبے اور خیال کا اظہار قوت اور توانائی کے ساتھ کر سکیں۔ ان کے یہاں نہ تو الفاظ کی بہتات ہے اور نہ بے بضاعتی زبان ہے۔ ان کی شاعری میں زبان، حقیقی زبان روزانہ زندگی میں استعمال ہونے والی زبان نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ استعمال ہوتی ہے ان کے کلام میں وہ ابہام بھی نہیں ہے جسے جدیدیت کا طرۂ امتیاز بنا لیا گیا ہے۔ شاہین کے اس طرز کلام سے بڑی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ہم بڑے زمانے کے بعد اس خیال سے آزاد ہوئے ہیں کہ شاعری کی کوئی مخصوص زبان ہوتی ہے۔

جدا ز قربتِ جاناں، رہا ز جاں شدہ ام نشانِ ما ہمی باشد کہ بے نشاں شدہ ام

اس قسم کی شاعری حیرت زار کی شاعری ہوتی ہے۔ وہ حیرت نہیں جس کا تعلق ہماری کلاسیکی شاعری میں آئینے اور رُخِ جاناں کے معاملے سے ہے یعنی۔۔۔ گر یہی حیرت رہی تو آئینہ بن جائیں گے۔۔۔ یہ حیرت کی ایک اور بلند تر جہت ہے اور جب شاعر شدتِ احساس کی کسی سنگلاخ منزل سے گزرتا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اس کی شاعری میں تذبذب، تامّل، تفکر کی رنگت جھلکنے لگتی ہے کیونکہ اسے اپنے وجود پر شبہ ہو جاتا ہے کہ آیا وہ وہی ہے جو تھا۔ اس مجموعے کا نام ''بے نشاں'' اسی گم شدگی وجود کا ترجمان ہے۔ تصوف میں بھی عارف کو حیرت کا مقام طے کرنا پڑتا ہے اور اس مقام سے گزر کر ہی وہ حقیقت مطلقہ کے اعیان و تجلیات کی شناخت کے قابل ہوتا ہے۔ اس عہد کی شاعری کا بنیادی رجحان ہجرت، بے زمینی اور بے نشانی کا رجحان ہے۔ یہ رجحان صرف انہی حساس اور تخلیقی کرب سے بھرپور شعراء میں نہیں پایا جاتا جو عملاً ترک وطن کے روحانی تجربے سے گزرے ہیں بلکہ دنیا بھر کے تخلیق کار یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مہاجر اور بے وطن ہیں۔ اس کے اسباب ظاہر ہیں وہ صدی جو ۱۹۰۱ء کو طلوع ہوئی تھی اور جس کا انتظام و اہتمام بڑے ذوق و شوق سے کیا گیا تھا وہ صدی بھولی بسری دنیا ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ہم اجنبی دور سے نکل کر خلائی دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ نوع انسانی کی ہجرت ہے ایک مقامِ فکر سے دوسرے مقامِ فکر کی طرف۔۔۔ ایک صدی سے دوسری صدی کی طرف۔۔۔ ایک عہد سے دوسرے عہد کی طرف! زلزلہ پیما آلے کی طرح شاعر کا ذہن دنیا کا سب سے زیادہ عجیب و غریب حسّاس آلہ ہے۔ اس عہد کے تمام شاعر (یہاں شاعر کا مطلب شاعر ہی ہے، صرف صاحبِ طبع موزوں ہی نہیں ہے) اس کرب میں شریک خواہ ارضی طور پر انہیں اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن ہم سب کی طرح شاہین کا معاملہ عجیب ہے یعنی ہمارا شمار تارکینِ وطن میں ہوتا ہے اور سچ مچ میں اپنی بے نشانی کا احساس ہے اور شدید احساس۔ اس احساس کو جمالیاتی حسن کے ساتھ نظم کرنا اور مرثیہ گوئی اور نوحہ خوانی کی سطح سے بلند کر کے احساس ہجرت کو ایک دلکش، خوبصورت اور مؤثر نظم پارے کی حیثیت دینا ہر سخنور کے بس میں نہیں۔ اس مجموعے کی پہلی نظم ہی سے شاعر کے طرز فکر اور زاویۂ احساس کا اندازہ ہو جاتا ہے مثلاً قریۂ جاں کی اک نظم۔۔۔ خود قریۂ جاں کی ترکیب ہی روح کو اداس اور سرگشتہ کر دیتی ہے:

گھر سے نکلا تو کئی بار خیال آیا تھا جستجو ہے تو پریشاں نظری بھی ہو گی
ہر کھلی آنکھ میں رسوائیاں منڈلاتی ہیں باعثِ دربدری دیدہ وری بھی ہو گی

رئیس امروہی

''تاروں کو چھونے کی ہوس''

محمود واجد

(●)

چند سال ہوئے عظیم آباد کی ایک نجی ادبی نشست میں جذبی بڑے طمطراق سے فرمارہے تھے:

''اردو شاعروں میں اب کوئی سپارک نہیں رہا!''

اُن کی مراد دراصل علی گڑھ کے اُس دور سے تھی جب مجاز، جاں نثار اختر، جذبی، سردار جعفری وغیرہ طالب علم تھے اور سبھی ایک سے ایک نکلتے ہوئے تھے۔ ذکر مجاز کا نکل آیا اس لیے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ''اسپارک'' والی بات البتہ غور طلب ہے۔ سوال یہ ہے کہ مومن سے لے کر مجاز تک اگر یہ ''شعلہ سا'' والا حادثہ پیش آتا رہا تو آج اچانک یہ سلسلہ بند کیسے ہو گیا یا پھر اردو شاعری اگر واقعی بانجھ ہوگئی ہے تو اس بانجھ پن کا علاج ہونا چاہیے نہ کہ اُس کا رونا!

اوروں کو تو جانے دیجئے خود پیشہ ور نقادوں کے قلم میں کتنی بار جنبش پیدا ہوئی اور اُن کی دوربیں نگاہوں نے کتنی راکھ کریدی کہ ایک چنگاری نہ مل سکی بھائی میرے!

''شعلہ'' ہر دور میں رہا ہے۔ شعلوں کا اجتماع البتہ وقت وقت کی بات ہے۔ آج کے بدلتے ہوئے صنعتی نظام اور بڑھتی ہوئی مشغولیت سے زندگی کی بنیادی قدریں ہی متزلزل ہو رہی ہیں پھر ادبی قدروں کا احترام کہاں تک ممکن ہے۔ خیر ہٹائیے یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مجھے کہنا محض یہ ہے کہ اردو کے اس تیرہ و تار ماحول میں چراغ کی دھیمی لَویں تیز کرنی چاہئیں تا کہ اندھیرے کی قبا پھیل نہ سکے!

ہر چند اردو زبان کے گنے چنے اسکول رہے ہیں لیکن چراغ کہیں بھی جلے، ضیائیں گوشہ گوشہ کو منور کر ڈالتی ہیں۔ اور آج بھی تمام اختلافات کے باوجود یہ حقیقت کھلی کتاب کی طرح واضح ہے کہ بہار کا معاملہ اردو زبان و ادب کے سلسلے میں محض ''زیرِ لب'' تک نہیں رہا بلکہ ببانگِ دہل تک پہنچ گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زبان و ادب علاقوں کے محتاج نہیں لیکن علاقے اسی فضیلت سے یاد کیے جاتے رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے! کسی عظیم شخصیت پر دنیا جتنا زیادہ فخر کر سکتی ہے اُس سے زیادہ فخر کا مستحق اُس کا ملک اُس کا وطن اُس کی ماں ہے!!

شاہین بہار کی نئی نسل کا نمائندہ شاعر ہے۔ شاہین تخلیق، نام سید ولی عالم، ادبی دنیا میں شاہین غازی پوری، والد میر نوید علی مرحوم، وطن غازی پور (مونگیر) ریاست بہار، پیدائش ۱۹۳۸ء، تعلیم ایم ایس سی (گولڈ میڈلسٹ) سکونت حال، بھاگل پور (بہار)۔ اب ایک شعر سنیے:

ہائے یہ بے سرو سامانی و بے ترتیبی
زندگی کیا کسی مے خوار کا گھر ہے اے دوست

کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ شاعر کا اُس وقت کا کلام ہے جب اس نے عمرِ عزیز کی وہ منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں جب ''فکرِ رسا'' اور ''دیدۂ بینا'' والی بات کسی طرح صادق آتی ہو۔ یہ وہ شاعر ہے جس نے نہ فراق و فیض کی صحبتیں اُٹھائیں۔ نہ جوش و مجاز کا ہم پیالہ رہا۔ نہ ادبی فضا، نہ ماحول! اور یہی چیزیں بڑا ادیب بناتی ہیں اپنے ارضِ وطن میں اپنی ماں اور سگے بھائی کو فرقہ وارانہ فسادات کی نذر کر کے شہر آیا ہوا گیارہ بارہ سالہ کا لڑکا، اُس کے کیا احساسات ہوں گے اگر وہ یہ کہے:

شبابِ لالہ و نسریں فگار ہے ساقی
بہار اب کے فریبِ بہار ہے ساقی

تو آپ اُس کے ضبط و تحمل کی صحیح داد دے سکیں گے؟ شاید نہیں! فسادات کے پہلے کا شاعر اقبال کا ہمنوا تھا مگر وہ بھی کس طرح:

غرق ہو جاتی ہے ساحل پہ بھی کشتی لیکن
ڈوبتوں کے لیے تنکے کا سہارا کافی
شب تاریک میں بھٹکے ہوئے راہی کے لیے
دُور آکاش پہ اک زرد ستارہ کافی

پھر اس میں کتنے رنگ مل گئے جوش، مجاز، جذبی، ساحر اور کتنے ہی اور قوسِ قزح کے رنگوں کو سمیٹنے والا دریا پہاڑوں، چٹانوں، میدانوں، ڈھلوانوں سے گزرتا ہوا بڑھتا ہی گیا۔ اُس کا فطری جوش اور ولولہ اس کی سنجیدگی اور ٹھہراؤ، اُس کی خاموشی اور متانت سنگ میل بنتی گئی۔ اور آج وہ اس مقام پر ہے جہاں بے اختیار کہتا ہے:

میں اُس بستی میں آوارہ ہوں اب تک
جہاں کی رہ گذر بھی سو گئی ہے

پرویز شاہدی اس شعر پر اُچھل پڑے۔ فیض نے اُس کا یہ شعر سُنا تو بے قابو ہو گئے:

جانے کیوں شب کو جلاتا ہے بجھاتا ہے چراغ
ایک دیوانہ کہ بربادِ نظر ہے اے دوست

عرصہ ہوا میں نے بھاگل پور میں نوجوانوں کی ایک انجمن قائم کی تھی جس کا مقصد ادب کی سنجیدہ اور ٹھوس خدمت تھا اس کے لیے مجھے ابھرتے فنکاروں کی تلاش تھی۔ شاہین اسی دریافت کا نتیجہ ہیں۔ میں نے ان کا یہ شعر سنا تو خود اُن سے ملنے گیا:

ہے گلستاں میں خراماں شمیم آوارہ
خدا کرے اُسے کانٹوں سے پیار ہو جائے

اُس دن سے شاہین میرے دوست بن گئے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا ہے کہ کوئی ایسا شعر جو انہوں نے کہا ہو اور سب سے پہلے مجھے نہ سنایا ہو۔ پھر ہم ساتھ ساتھ

رہے، ادبی محفلوں میں گئے، مشاعروں میں شریک ہوئے، ساتھ بیٹھ کر غزلیں کہیں، ایک ساتھ پرچوں میں تخلیقات بھیجیں، شاہین خالص اور مکمل شاعر تھے میں تھوڑا تھوڑا سب کچھ تھا۔ اور اسی لیے شاید کچھ مکمل نہیں تھا۔ میں کئی لحاظ سے اُن سے بہت سینئر تھا لیکن اُن کی ذہنی سطح نے مجھے اُن کے برابر کھڑا کر دیا بلکہ میرا قد بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بہرحال ہم دونوں کا غم مشترک تھا۔ غمِ دوراں کے شکار دونوں ہی تھے!

چھپنا چھپانا اگر مستند ہونے کی علامت ہے تو بھی شاہین ہندو پاک کے تقریباً سبھی قابلِ ذکر معیاری رسائل میں آ چکے ہیں۔ پھر بھی بھیڑ بھاڑ سے گریز نام ونمود سے بے نیازی، تصنع اور ریاکاری سے وہ سینکڑوں میل دُور ہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے!

شعر کی زبان کے سلسلے میں مجھے ذاتی طور پر شاہین سے شکایت رہی ہے۔ اس لیے کہ اُردو زبان کے موجودہ مسائل میں ایک مسئلہ مشکل پسندی کا بھی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ایک طرف اگر وہ پُر وقار الفاظ استعمال کرتے ہیں تو دوسری طرف گنگا جمنی رنگ نے کچھ اور ہی نکھار پیدا کر رکھا ہے۔۔۔!

''ایک رات'' شاہین کی وہ رات تھی جب چاند ستاروں کی بے حسی کا شکوہ دامن گیر تھا۔ پھر وہ رات آئی کہ کسی نرگسِ غبار آگیں میں کھو کر رات کی گمبھیر خموشی میں ستاروں کی چاپ سننے لگے:

تصورات میں کتنا سکون ملتا ہے
غمِ حیات سے بے گانہ ہو گیا ہوں میں

یا یہ کہ

کب کوئی جی سکا ہے بے آس بے سہارے
ہر چیز ڈھونڈتی ہے جینے کا اک بہانہ

پھر بے نام خلاء اور زندگی جینے پر الزام نظر آنے لگی لیکن:

جب بھی طوفاں میں لرزتا ہے سفینہ کوئی
بانہہ پھیلائے تری یاد چلی آتی ہے

اور ''چاندرات'' آ گئی:

رات کی بے کراں فضاؤں کو
نغمہ و ساز دے رہا ہے کوئی
نیل کی خوابناک وادی سے
شاید آواز دے رہا ہے کوئی

لیکن واہ رے وضع داری کہ مجھے بھی اس کا علم نہ ہو سکا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ میں علیل ہوا اور وہ میری عیادت کو آئے۔ اُن دنوں وہ بہت مشغول تھے۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا یونہی ذکر نکل آیا۔ اور ذکر، ذکرِ خوباں ہو تو کیا کہنا! لیکن بات اب اہم موڑ پر پہنچ چکی تھی، جانے کون سا احساس اُن کے ذہن میں رینگ آیا۔ انہوں نے صاف لفظوں میں مشورہ طلب کیا۔ پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ اب تک خیال سے دل ونگاہ روشن تھی اب ان کا گھر روشن ہو گیا۔ تلاش مکمل ہو گئی اور کربناک حال بھولا بسرا ماضی بن گیا۔۔۔!

شاہین نے فنِ شاعری کا باضابطہ طور پر مطالعہ نہیں کیا اور نہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ لیکن بحر و وزن پر قدرت جو انہیں حاصل ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ پھر نظم و غزل کہنے کا یکساں ملکہ۔۔۔ کہاں ملتی ہیں یہ چیزیں ایک ساتھ غزل اور نظم کا مزاج کس قدر مختلف ہے یہ ہر اہلِ نظر پر ظاہر ہے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک اچھا غزل گو اچھی نظم نہیں کہہ پاتا لیکن شاہین کے یہاں یہ بات نہیں۔ موضوع اور ہیئت کا تنوع تو ہے ہی۔۔۔ پابند، آزاد اور معریٰ نظمیں وہ یکساں کمال سے کہتے ہیں۔ اچھے قطعات بھی کہے، بچوں کے لیے پیاری پیاری نظمیں بھی کہیں اور کئی انگریزی نظموں کے خوبصورت منظوم تراجم بھی۔

مختصر ترین خوبصورت نظمیں کہہ کر شاہین نے اردو ادب میں ایک طرح کا اضافہ کیا ہے۔ چند نمونے دیکھئے اور فیصلہ کیجیے۔

''سنگدل''

پتھر جیسا دل رکھتے ہو
دیکھو ندی کے اُس پار
پتھر پر بھی پھول کھلے ہیں

''رشتہ''

ہے تیری یاد کا یوں میرے دل سے رشتہ اب
کہ جیسے شام کو سنسان سے بیاباں میں
کوئی مسافر خستہ نماز پڑھتا ہے

''دائرہ''

پچھلے پہر کے بھید بھرے سناٹے میں
جیسے ہی کچھ پیلے پتّے ٹوٹ گرے
ٹہنی سے اک چنچل کونپل پھوٹ پڑی

''بھیک''

ہاتھ پھیلا نہ چاند کے آگے
اک بھکاری سے کیا ملے گا تجھے
ایک دو پل کی روشنی کے سوا

ایسی بیسیوں عظیم نظمیں اُنہوں نے کہی ہیں۔۔۔ فطرت کے حسن اور قدرتی مناظر پر ''سوال'' ''کسے خبر'' اور ''سرِ شام'' اُن کی خوبصورت نظمیں ہیں۔ اُن کی پسندیدہ نظم ''دوراتیں'' ہے۔ زمانہ طالب علمی کی مشہور نظم ''دولت'' ہے جو کالج کے انعامی مقابلہ میں کافی مقبول ہوئی اور اس کا ایک بند زبان زد ہو کر رہ گیا ہے۔

چھین لی جاتی ہے دو شیزۂ رعنا کی حیا
ہے تصرف میں مرے سینکڑوں پریوں کا سہاگ
مفلسی میری نگاہوں کی غضبناک کرن
اُپسراؤں کے تقدس کو لگا دیتی ہے آگ

میرے نزدیک سب سے پیاری نظم ''انقلاب'' ہے جس میں کہیں بھی انقلاب کا سطحی اور عام تصور نہیں مگر اتنی روانی، جوش اور عظمت ہے کہ دل کھنچ جاتا ہے۔ابتدائی اُٹھان ملاحظہ ہو:

بہار جا چکی تھی اور خزاں بدوش رات تھی
ہر ایک شئے اسیر گیسوئے غمِ حیات تھی
شکستہ پر تھا جبرئیل ہنس رہا تھا اہرمن
زمانہ خود ہی سی رہا تھا اپنے واسطے کفن

اسی طرح ''موسیقی''، ''مجاز'' اور ''خوابِ صنم'' (گوتم بدھ) بڑی موثر نظم ہیں۔''الوداع ارضِ وطن'' طویل مگر تاثراتی اور واقعاتی نظم ہے۔

شاہین کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ساتھ بڑی بے دردی سے پیش آتے ہیں سینکڑوں نظمیں اور غزلیں کہیں، مگر منتخب طور پر اُس کا ایک چوتھائی بھی اُن کے پاس نہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں اُن کی یہ خوبی اُن کی نظموں کو ایک دن ادبِ عالیہ میں جگہ دلوائے گی۔تخلیقی جوہر کے ساتھ نقد و نظر بھی بڑی بات ہے۔

شاہین کی غزلوں میں جو داخلیت اور کلاسیکل رچاؤ ہے وہ اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔آپ اُن میں ڈوب جائیں گے۔

مری چاہت پہ نہ الزام لگاؤ لوگو!
کچھ سمجھ کر ہی اُٹھاتا ہے کوئی بارِ گراں
ہائے وہ تاروں کو چھونے کی ہوس
اب تو دھندلا سی گئیں پرچھائیاں

یا پھر یہ تلخ حقیقت کہ:

بسا اوقات میری سادگی بھی
مری راہوں میں کانٹے بو گئی ہے

شاہین یہ عنایتِ دوراں تو دیکھئے
آنگن میں ایک پھول ہے سو وہ بھی زرد ہے

بڑی فیاض ہے شاہینؔ دنیا
دیئے وہ غم کہ میں سر دُھن رہا ہوں

احسان اُٹھا کے ہر کسی کا
بڑھتا ہی گیا وبال جی کا

شاہین حرکت و عمل کا پیامبر ہے

مجھے حیات کی یہ سادگی پسند نہیں
چمن نہیں نہ سہی خارزار تو ہوتا

پھول ہی پھول دکھتے ہیں کراں تا بہ کراں
شعلہ زارِ غم ہستی سے گزر کر دیکھو

سادگی و پُرکاری اُن کے شعروں کی جان ہے:

شکست دل کا یہ اک لازمی نتیجہ ہے
حضور آپ جسے سادگی سمجھتے ہیں

دیکھا آپ نے۔۔۔موضوع، مواد، اسلوب، زبان۔۔۔کتنی ہمہ گیری، کتنا جذب، کیسی تاثیر، کیسا تنوع ملتا ہے۔بحیثیت انسان آپ اُن سے مل کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوں گے۔وجہ؟ غیر معمولی احتیاط، بے پناہ رکھ رکھاؤ اور جچی تُلی نگاہ ہے۔لیکن ایک بار آپ کے دوست بن گئے تو خلوص کا پیکر نظر آئیں گے مگر طبیعت کا بھاری پن پھر بھی کم نہیں ہوگا۔بحیثیت فنکار اتنی ساری خوبیوں کے باوجود ابھی کئی باتوں کی ضرورت ہے۔ابھی اُن کی آواز منفرد آواز نہیں بن سکی ہے، ابھی اُن کا لب و لہجہ جانا پہچانا ہوا نہیں ہے۔اس کے لیے ادبی ریاضت کی ضرورت ہے ان کے پاس وقت ہے، اور ہماری توقعات مستقبل میں اُن سے بہت کچھ ہیں اور وہ بھی شاید تیار بیٹھے ہیں بشرطیکہ:

اک دل ہے اور سارے زمانے کا درد ہے
دو گونہ اُس پہ لطف کہ ماحول سرد ہے

والی بات نہ رہ جائے۔۔۔!!

شاہین کے یہاں ماضی کی بعض قدروں اور جذبوں سے والہانہ لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔ان کی تصویروں میں حال کی نفرتوں اور خباثتوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر ایسی فضا جنم لیتی ہے جس میں پیار کی ٹھنڈک اور خلوص کی چاشنی ہے یوں اُن کے یہاں بھی شہزاد احمد کی طرح روحانی تحریک نئے سرے سے جنم لیتی ہے۔لیکن یہ جنم ایسے پہلو سے سامنے آتا ہے جس میں نہ تو تمام تر رومان ہے اور نہ تمام تر خارج کا کرب بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ایسی فضا وجود میں آتی ہے جس میں حرکت کرتا وجود ظاہری اور داخلی دونوں آنکھوں سے دو مختلف جذبوں کو گرفت میں لے کر ایک Normal انسان کی تصویر پیش کرتا ہے جسے کچھ دکھ بھی ہیں لیکن ساتھ ہی کچھ مسرتیں بھی۔

رشید امجد

''بے نشان'' آئینہ

انور سدید

(●)

شاہین نے اپنی شاعری کی دوسری کتاب ''بے نشان'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

''شاعری خلاء میں جنم نہیں لیتی اور نہ یہ ہفتہ کے سات دنوں میں سے اس ایک یا دو دن کا سودا ہے جب دنیا کے کام کاج نمٹانے کے لیے گھر سے باہر نکلنا لازمی نہیں ہوتا۔ یہ تو زندگی بھر کا عطیہ ہے۔ اس کی تخلیق گوشت اور لہو سے ہوتی ہے۔ شاعر اپنے جذبات سے وجود، اشیاء، مناظر اور محسوسات کے خاکوں میں نیا رنگ بھرتا ہے جس کے سبب حقیقت ایک جیتی جاگتی مٹھی بھر خاک میں بدل جاتی ہے۔ مٹھی بھر خاک جو شاعر کا دل ہے۔ اسی طرح ایک نئی حقیقت روپ دھارتی ہے جو اتنی ہی سچی ہوتی ہے جتنی پہلی حقیقت تھی۔''

شاہین کی شاعری پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پہلے انہوں نے اپنی زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا اور جب کرب کی کیفیت ناقابلِ برداشت ہوگئی تو انہوں نے اس کرب کو مجسم کرنے کے لیے شاعری اختیار کرلی۔ شاہین کے ہاں زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا عمل ہفتہ وار تعطیل کے ایک یا دو دنوں میں سرانجام نہیں پایا۔ یہ عمل ان کے ہاں اس وقت سے جاری ہے جب ان کے دماغ نے شعور کی پہلی کرن بیدار ہوتے دیکھی تھی اور آنکھ نے پھول کی نوزمیدہ پتی کو دیکھ کر شاہین کے دل سے اس کی خوبصورتی اور رعنائی کی شہادت طلب کی تھی۔ وہ اس وقت بھی ٹکڑے ہوئے جب انہوں نے غازی پور سے ڈھاکہ کے لیے رختِ سفر باندھ لیا تھا۔ پھر جب مشرقی پاکستان پر ابتلائے بادل چھاگئے تو شاہین نے ایک بار پھر ڈھاکہ کے ساتھ اپنے ٹوٹنے کا عمل بھی دیکھا۔ وہ دوسری ہجرت میں اپنے ذہن و دل کے باقی ماندہ ٹکڑوں کو لے کر لاہور آ گئے۔ ایک شام میں نے انہیں نیشنل بک کونسل کے جلسے میں دیکھا تو انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ کیونکہ مجھے اپنی زندگی میں جبری ہجرت کا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن میں شاہین کو پہچان نہ سکا۔ ان کی زندگی کے کچھ ٹکڑے غازی پور میں اور کچھ ڈھاکہ میں رہ گئے تھے لیکن جب انہوں نے بتایا کہ اب وہ رزقِ حیات کی تلاش میں کینیڈا جا رہے ہیں تو ان کے چہرے پر مجھے شدید کرب نظر آیا۔ یہ کرب مجھے اس تصویر میں بھی دکھائی دیا جو انہوں نے مجھے آٹوا سے بھیجی تھی۔ میں نے ایک سوال کو لفظوں میں ڈھالنے کی کوشش کی اور پوچھا ''شاہین، آپ زندہ کیسے رہیں گے؟'' بولے ''شاعری مجھے زندہ تو نہیں رکھ سکتی لیکن مجھے سانس لینے کی مہلت ضرور دے گی'' چنانچہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا عمل پھر جاری ہوگیا اور اب ان کی نئی کتاب میرے سامنے ہے۔ بلاشبہ وہ وہ میرے سامنے اپنا حقیقی اور سچا باطن آشکار کر رہے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاہین اس شکستگی کے عمل سے اب بھی مسلسل گزر رہے ہیں۔ شاعری ان کی زندگی کا سانس ہے اس کی تخلیق وہ اپنے گوشت اور لہو سے کرتے ہیں۔ یہ ان کے سانس لینے کی مہلت ہے اور شاید اس لیے انہوں نے اسے زندگی بھر کا عطیہ شمار کیا ہے وہ اس سے گلوں میں رنگ بھی بھرتے ہیں۔ بادِ نوبہار بھی چلاتے ہیں۔ حقیقت سے ایک نئی حقیقت بھی پیدا کرتے ہیں اور پھر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ انہوں نے جو حقیقت تخلیق کی ہے وہ بھی اتنی ہی سچی ہے جتنی پہلی حقیقت سچی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غازی پور سے ڈھاکہ۔ ڈھاکہ سے لاہور اور لاہور سے آٹوا تک شاہین نے ہجرت کی تو انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بہت سے خوابوں کو اپنی آنکھوں سے مسمار ہوتے دیکھا۔ محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ ''شاہین کی شاعری کا بنیادی محور ''بے زمینی'' اور ''بے نشانی'' کا غم ہے۔'' اس کے برعکس مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ شاہین کو اپنی زندگی اور اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کا غم زیادہ ہے۔ بے شک انہیں ''بے زمینی'' اور ''بے نشانی'' کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس احساس کے عقب میں بھی یہ المیہ موجود ہے کہ وہ جس غیر ملکی زمین پر اب سانس لے رہے ہیں وہ نہ تو ان کی زندگی کے ٹکڑوں کو جوڑ سکتی ہے اور نہ ان کے خواب سازی کے عمل کو استوار کر سکتی ہے۔ انہیں اپنے خیالات محبوس محسوس ہوتے ہیں۔ سوچیں گرہوں کی قیدی نظر آتی ہیں اور صبح دم جب کوہِ ندا کا بلاوا آتا ہے اور ایک نئی زنجیر سامنے نظر آتی ہے تو وہ بلبلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

اب مری سوچوں میں گرہیں/ اب مری سانسیں وبال/ اب مری دھوپوں میں گرہیں/ اب مرے سائے بھی جال/ اب مرے اطراف گرہوں کا طلسم/ شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح جکڑا ہوا گرہوں میں جسم

(پچھلے برس کی آخری نظم)

یہ بکھرے ہوئے جال نیلی رگوں کے/ رگیں/ جیسے نقشے پہ پھیلی ہوئی ندیوں کی لکیریں۔ رگیں میری دنیا/ رگیں میرا عقبیٰ/ رگیں اپنے ہی خون میں تربہ تر

(مصلوب)

خوں چشیدہ زبانوں سے/ روحوں کے بے پیرہن/ زخم کھائے ہوئے نیم جاں۔ سوم رس کی نشیلی گھپاؤں میں/ روپوش ہوتے گئے۔ اور چاروں طرف/ ان کے ماں جایوں کے خواب/ نیزوں پہ لٹکے رہے۔

(سلسلے خواب کے)

شاہین کی شاعری میں دوسرا المیہ اس بات سے بھی پیدا ہوا کہ اپنی زمین سے کٹ جانے کے بعد وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ فطرت سے ان کا دائمی رشتہ کٹ گیا ہے۔ ایک کاسموپالیٹن انسان بن جانے کے باوجود اس احساس نے بھی ان کے حزن کو دبیز کر دیا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شاہین نے اپنے ماضی میں جو کچھ دیکھا تھا وہ اسے اپنے لوحِ دل سے مٹا نہیں سکے پھر جب وہ عالمی شہری بنے اور ان کے مشاہدے میں وسعت آئی تو انہیں پوری دنیا میں ہونے والے مظالم، ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک عام

پاکستانی شاعر کی نسبت شاہین نے دوہرا کرب برداشت کیا۔انہوں نے پاکستانی شعراء کے ساتھ اپنے معاشرے کا غم برداشت کیا۔لیکن ایک کاسموپالیٹن انسان کی حیثیت میں وہ پوری دنیا کے غم میں بھی شریک نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں وہ موضوعات بھی اُبھرے ہیں جنہیں ہجرت کے تجربات نے جنم دیا تھا اوران کی توجہ عالمی موضوعات نے بھی کھینچی ہے۔دونوں صورتوں میں شاہین کے ہاں المیہ صورت نمایاں نظر آتی ہے مثال کے طور پر ان کی نظم ''آئینہ کنچن اور آئتیں'' کی یہ سطریں ملاحظہ کیجیے جن میں دنیاج پور (مشرقی پاکستان) کی کنچن ندی کے کنارے ہونے والی بربریت کے احساس کو نظم بند کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔

ہر طرف بکھری ہوئی ہیں آئینے کی کرچیاں/ ایک ریزہ بھی جہاں ہے/ آئینہ موجود ہے/ گھپ اندھیرا/ اور زہریلی ہواؤں کی گھنی آبادی۔۔۔

سسکیاں کچھ اور بھی بے رحم ہوتی جارہی ہیں/ آ کہ ہم/ ان آیتوں کی آج تفسیریں لکھیں۔آگ جن کی دفن ہے/ دریائے کنچن کے تلے۔

(آئینہ کنچن اور آئتیں)

سانجھ ڈھلے/ ٹیالے ہیولے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے/ یوں دکھتے ہیں/ جیسے شفاخانے کے سامنے/ ڈھیر عورتیں/ اپنی اپنی خالی شیشیاں ہاتھ میں پکڑے/ گم سم سی چپ چاپ کھڑی ہوں۔

(بلاوا)

اوراب اس کرب کے کچھ نقوش دیکھئے جو شاہین نے عالمی انسان کی حیثیت میں محسوس کیا ہے۔

دل میں یوں برف جمی ہے اب کے/ اک مہاجر کا ہو خیمہ جیسے/ اپنی تقدیر سے خوف آتا ہے/ ایک بھاگے ہوئے مجرم کی طرح/ ہیبت آثار ہو فرد اجیسے

(دل میں یوں)

تم ان بستیوں کو/ جہاں رات دن تم نے شعلے گرائے/ اگر جا کے دیکھو/ تو خود رو پڑو گے

(ویت نام)

پھر وہی زخم ستارے/ اور باوردی ستاروں پر جھلتے پھول/ آنکھوں کے کٹوروں میں پھٹے کھلیان کا ویراں تموج/ پھر کوئی ثالث کوئی اعلان/ ساری مملکت میں بلدیوں کی چار چھ پیہم نشستیں/ اور کچھ سڑکیں شہیدوں کے مقدس نام سے منسوب کرنے کی نئی تجویز/ اخبارات کی شہہ سرخیاں

(بے حسی کے کالے حروف)

اپنے وطن کے مقامی انسان اور عالمی انسان کے متذکرہ بالا المیوں میں شاہین نے پوری شرکت کی ہے اور بطور انسان انہوں نے معاشرے کی ہر ناہمواری پر گہرے دکھ اور کرب کا اظہار کیا ہے۔تاہم اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ غم جس میں شاہین کی اپنی ذات مبتلا ہے۔اس کا انہوں نے ادراک نہیں کیا۔ شاہین کا ذاتی المیہ تو اس حقیقت سے ہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے روزیٔ رزق کی تلاش میں نکلا ہوا ایک غریب الدیار انسان ہے لیکن ان کا ذاتی غم یہ بھی ہے کہ اس خطۂ غیر میں ان کا مستقبل محفوظ نہیں اور جب وقت کی دھوپ ڈھلتی جا رہی ہے تو ایک دائم تنہائی کا خوف ان پر مسلط ہوتا چلا جارہا ہے۔شاہین کی شاعری میں خوف نے بڑی کربناک صورت اختیار کی ہے۔ملاحظہ کیجیے۔

اجنبی شہر میں شیشے کے گھروں کے باہر/ جھرمٹوں میں کوئی اپنا ہے/ گماں ہے مشکل/ درد بے خواب سی آنکھوں کا پرانا محرم/ یوں ہے وامانده کہ اب آہ وفغاں تک مشکل/ نہر ریڈو کے کنارے میں کھڑا سوچتا ہوں

(قریۂ جاں کی ایک نظم)

جب وہ بوڑھے ہوئے شہر ان کا نہ تھا۔
جاننے والے اپنے پرائے انہیں بھول بیٹھے
کہ اب ان کا دنیا میں مصرف ہی کیا ہے/ وہ جو معذور ہیں ان کی تقدیریں گردشِ وقت کا ایک بچکولا کافی ہوا۔

(۲۵۔دسمبر)

تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ مایوسی اور پژمردگی کے اس قسم کے لمحات میں شاہین نے اپنی رجائیت کو زندہ رکھا ہے۔وہ ٹکڑے ٹکڑے بدن، کرچی کرچی خواب اور غیر محفوظ مستقبل کے پیشِ نظر بھی اپنا رشتہ اپنی سرزمین کے ساتھ قائم رکھتے ہیں۔یہ زمین ان کا عقبی دیار بھی ہے ان کے مستقبل کی محافظ بھی اور ماں کی گود بھی۔چنانچہ جیسے ہی وطن کی سرزمین انہیں یاد آتی ہے ایک کوندا سا ان کی آنکھوں میں بیدار ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو جاتے ہیں۔

ہر ایک زلف میں، ہر ایک پیرہن میں گلاب/ گلاب آنکھوں میں چہرے پہ اور بدن پہ گلاب/ ہزار رنگ کے طوفان بند کلیوں میں/ گلاب تیرے دریچوں میں تیری گلیوں میں
بہت حسیں ہے گلابوں کے شہر تیری شام
جو ریت ریت ہیں ان آنگنوں کا تجھ کو سلام

(اسلام آباد)

سانس لیتی ہوئی کمرے کی فضا میں/ کئی صدیاں بیتیں/ سات مسجد کو دکھائی ہوئی/ آئینہ یہ بوڑی گنگا/ یہ مغل آرٹ/ یہ چغتائی کی تصویر/ یہ آرام گہہ شاہِ جلال یمنی/ اور یہ تشنگی روح کا اظہارِ حسیں۔تاج محل/ وقت دیوار پہ لٹکے ہوئے خوش رنگ کلنڈر کے ورق سے جھانکے/ ہر گھڑی دل کو یہ ارمان/ کہ اس آہوئے وحشی کو گرفتار کریں

(گینز)

بار بار اک چڑیا/ تیر بن کے اڑتی ہے/ بیچ کھا کے مڑتی ہے/ میگھنا کے پانی میں/ ڈبکیاں لگاتی ہے/ اور پھر لبِ ساحل/ بال و پر سکھاتی ہے/ بار بار اک چڑیا/ میگھنا کے پانی میں

(رقصِ حیات)

باقی صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ کیجیے

شاعرِ آبلہ پا

اکرام بریلوی

(●)

ابنِ رشیق نے تو شعر گوئی کے لیے ایک لاکھ اشعار یاد ہونے کی شرط لگائی تھی اس پر اسد اللہ خاں غالب نے گرہ لگائی:

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

مگر ہمارے سید ولی عالم شاہین اپنی کریم النفسی کے باوصف ہمہ وقت کھوئے کھوئے سے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ڈوبے سے دکھائی دیتے ہیں۔ اب آپ ہی غور فرمائیں ایسی شخصیت سے کس طرح یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک لاکھ اشعار یاد رکھنے پر قدرت رکھتا ہو اور وہ بھی بیسویں صدی کی آخری دہائی کے اس درجہ بے چین اور گریز پا دَور میں۔ جہاں تک ''دلِ گداختہ'' اور ''حسنِ فروغِ شمعِ سخن'' والی بات ہے تو ولی عالم شاہین نے بچپن ہی سے ٹوٹ پھوٹ، شکست و ریخت، تباہی اور غارت گری کے وہ منظر دیکھے ہیں کہ دل جانتا ہے! مثال کے طور پہ قیام پاکستان سے تقریباً سال بھر پہلے اپنے آبائی گاؤں میں اپنا گھر بار جلتے اور ماں اور بھائی کے قتل کا خون آشام منظر دیکھا۔ اُن کا جرم صرف اتنا تھا کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء کے ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں رائے دی تھی۔

اس المیے کے وقت ولی عالم شاہین کی عمرِ عزیز صرف چھ سال تھی (سنہ پیدائش ۱۹۳۸ء) پھر انہوں نے والدِ محترم کے تجی کاروبار کی بربادی اور خسارے کے بعد عسرت و تنگدستی، نامرادی و مایوسی کی ایسی فضا دیکھی جس کے نقوش امتدادِ زمانی و مکانی کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے چلے گئے۔ جس نے انہیں جوان ہونے سے پہلے ہی ذہنی بلوغت سے ہم آشنا کر دیا۔ انہوں نے بعد، زندگی کی اس ٹوٹ پھوٹ اور ریزہ ریزہ ہوتے عالم کو بڑے کرب و کیفیت کے ساتھ اپنی شاعری کے تارِ پیراہن میں پرویا ہے

دیئے ہیں زندگی نے زخم ایسے
کہ جن کا وقت بھی مرہم نہیں ہے

آرزو آواز دے کر سوگئی
یاس کی تاریکیوں کے درمیاں

اور غالباً ایک پہاڑی کے قریب کا اختتامیہ ان ہی نامراد لمحوں کی بازگشت ہے:

شہر والے کیا جانیں
زندگی سسکتی ہے
کس طرح بیاباں میں
کس طرح مہکتے پھول
ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں
کارواں امیدوں کے
دُور چھوٹ جاتے ہیں۔ (رگ ساز)

لیکن ولی عالم شاہین مایوس نہیں ہوتے۔ وہ ان مایوسیوں کا جال توڑتے ہوئے زندگی کرنے اور جینے کی اُمنگ لئے آگے بڑھتے رہے۔

ہنوز دم میں ہے دَم ساتھ دے رہے ہیں قدم
اس ایک بات پہ ہیں، ہم سے حادثے برہم

شاید اس بہانے بن آئے بات اپنی
کچھ اور تیز ہو جا اے گردشِ زمانہ

آبلہ پائی کی لذت بھی عجیب لذّت ہے
ساکنو! دشت میں اکبار سفر کر دیکھو

انہوں نے ''ظلمتِ ہے سراغ روشنی کا'' کو حرزِ جاں بنایا۔ محنت مشقت کے مراحل سے کامیاب گزرے، ٹیوشن کیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب کو حقیقت میں بدل کر ہی دم لیا۔ بے پروبالی نے خوف و ہراس کے بجائے ظرف میں بالیدگی اور بلندی پیدا کی۔ پیشروؤں اور معاصرین ادب کو کھنگال ڈالا۔ اقبالؔ، فیضؔ اور اخترؔ الایمان سے بطور خاص متاثر ہوئے لیکن مجید امجدؔ کی شاعری کو اس لیے پسند کیا کہ اُن کا شعری اسلوب، طرزِ ادا اور ردھم میں براؤننگ کا سا بروکن ردھم یا افتاں خیزاں غنائی انداز ہے۔ جو اُن کی اک گونا شناخت کا باعث بنا ہوا ہے۔

ولی عالم شاہین کے ۵۵ء سے ۶۶ء تک کی شاعری کو میں رومانٹک تو ہرگز نہیں کہہ سکتا ہر چند کہ وہ سخت آزمائشی ادوار سے گزرے ہیں۔ یہ آزمائشیں کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے کی صورت میں کرب و بے چینی، روایتی تخیل اور نا آسودگیوں کی بنا پر داخلی اور خارجی زندگی سے انحراف کے طور پر کس قدر شوخ گفتاری اور وارفتہ مزاجی میں پناہیں ڈھونڈنے کی کوشش ضرور ہے۔ ایسی کوششیں جنہیں خواب اور شکستِ خواب سے زیادہ اہمیت نہیں دی جانا چاہیے۔ ایسے خواب اور خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ تو اُن کے پیشروؤں میں خصوصاً اخترؔ شیرانی، مجازؔ، جاں نثار اخترؔ اور جذبیؔ اور بہت سے دوسرے شعراء نے بھی دیکھی لیکن ان میں سے کوئی بھی کیٹس (Keats)، شیلے (Shelly) کولرج (Coleridge) اور بائرن (Byron) سے مشابہ یا مماثل نہیں کہ ہمارے بیشتر شعرا کو جنہیں رومانی تصور کیا جاتا ہے کسی طرح بھی ان مغربی شعرا کی طرح سیاسی و معاشرتی تحریکات سے کوئی عملی وابستگی نہیں رہی۔ البتہ مجازؔ اور جاں نثار اخترؔ کو کسی حد تک جذباتی وابستگی ضرور رہی مگر اتنی بھی نہیں کہ اُن پر رومانٹک ہونے کا لیبل (Label)

چسپاں کر دیا جائے۔اس اجمالی تمہید کے پیشِ نظر اگر شاہین کی ابتدائی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اُن کے ہاں مناظرِ فطرت کے حسیں پس منظر میں محبت کی پردہ در پردہ ہلکے سروں کی غنائی داستان سنائی دیتی ہے جس میں انسانی رشتوں کی خلوص کاری کی وہ سطح جھلکتی ہے جو شمعی یادوں کی کشش سے عبارت ہے۔اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرعاً مناظر فطرت و قدرت ، اُن کے آہنگِ شوق کو نادیدہ دیدنی ،طلسمات کے رنگ نیرنگ کی طرف لے جاتے ہیں جس میں جا بجا فیضؔ اور اختر الایمانؔ کی سی دلنشیں اور دلآویز گونج سنائی دیتی ہے۔ملاحظہ ہو:

آج پھر آئی ہے وہ ساعتِ دلدار کہ جب
ہم نے مل کر کوئی معصوم دعا مانگی تھی
دل کی گہرائی سے پیمانِ وفا باندھا تھا
اپنی بے لوث محبت کی قسم کھائی تھی

اور جو پایانِ کار اس مرحلے پر ختم ہو جاتی ہے:

اَب کے انگاروں پہ چلنے کی وہ رُت بیت گئی
آج کی رات دل وجاں کو فروزاں کر لیں
حلقۂ دہر پہ چھائی ہوئی تاریکی میں
ایک دو پل ہی سہی جشنِ چراغاں کر لیں

(ایک دو پل ہی سہی)

اور پھر ان دو چھوٹی چھوٹی نظموں میں:

کیا حشر ہوا سودائی کا
کس طور وفا بدنام ہوئی
کس کرب میں غم کی رات کٹی
کس طرح سحر سے شام ہوئی

اس کرب کا عالم کیا ہو گا
ہے کس کو خبر اس عالم کی
پتّھر کی رگوں میں زہر ہے کیا
پتّھر کی زباں کیا بولے گی

(پتّھر کی زباں)

اور بچپن کی ایک یاد سے تو اختر الایمان کا رنگ سخن صاف لَو دے رہا ہے:

گاؤں کی مسجد کے اُجلے گنبد و مینار پر
فاختاؤں کا وہ اک جھرمٹ سا ہر شام و سحر
وقتِ مغرب سے وہ مٹی کے دیئے جلتے ہوئے
نیم کے پیڑوں کے نیچے سائیں کی درگاہ پر
برہنہ پائی کی وہ لذتِ کنارِ آب جو
ڈوبتے سورج کے پرتو سے چمکتی ریت پر
گیت چرواہوں کے میدانوں پر لہراتے ہوئے
شیام کی بستی کی بانوں کا وہ شجر کارگر
مثلِ بط محوِ تنا وہ شوخ کمسن لڑکیاں
پھول اور پانی کا اک سنگم وہ ہنگام سحر
گھنٹیاں مندر کی آدھی رات کو بجتی ہوئی
وہ سکوتِ سحر آگیں وہ صدائے خواب اثر
نیند کے اَن دیکھے نخلستاں کی وہ سوندھی مہک
وہ خنک کرنیں بسنتی چاند کی وہ موجِ زر
سبز پودوں پر چمکتی کسی وہ زریں کہکشاں
کھیتوں کے بیچ بل کھاتی ہوئی وہ رہگذر
اُڑتے جگنو کا تعاقب شام کو برسات میں
بہتی پُروائی کی لہروں پر فروزاں اِک نگر
وہ تصور اپسراؤں کے سجیلے دیس کا
وہ دھنک کے رنگ میں ڈوبتے ہوئے شیشوں کے گھر
آج کس یادوں کے پَر باندھے اڑا جاتا ہوں میں
گردشِ ایام کو زیرِ نگیں پاتا ہوں میں

(رگ ساز،۵۸ء)

اس نظم کی روایتی تشکیل و ترتیب و ترکیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہین کے اندر کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہونے پائی کہ وہ دیہی سماج سے کٹ کر رہ سکیں۔ اس نظم کی دوسری چیز جو ہمیں فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے وہ درد و اثر کی جھومتی چال کا رقص و رم ہے جو قاری پر وارفتگی کا عالم طاری کر دیتا ہے۔شاہین کی اس دور کی شاعری میں بھی اُن کی ذہنی بلوغت کے سوز و ساز کی اندرونی رَو، ان کا وہ مرحلہ ٔجاں ہے جس سے وہ محبت کے مختلف النوع عالموں کی داخلی نفسیات کو اپنی شاعری کا موضوع بنا لیتے ہیں اور یہی اُن کا وہ کیف مسلسل ہے جہاں اُن کی فکری گہرائی، معنویاتی رعنائیِ خیال میں ڈھل جاتی ہے اور شاعر کے ساتھ قاری کے سارے وجود کا احاطہ کر لیتی ہے اور وہ مرئی مناظر کے غیر مرئی رموز و اسرار سے بہرہ اندوز ہونے لگتا ہے۔دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں ولی عالم شاہین جذبے میں فکر کا ٹانکہ لگا کر نئی حسیت اور تخیل کے اندرونی اور خارجی فضا میں حُسنِ ادا کے رنگ بھرتے ہیں۔اب اس تمہید کے بعد تین سطروں کی چند چھوٹی نظمیں ملاحظہ کریں جن میں جاپانی شاعری کے سے سجل روپ سے چنگاریاں سی اُڑتی نظر آتی ہیں:

رات گئے جب آہٹ سی محسوس ہوئی
ہاتھ بڑھا کے برہن نے پٹ کھول دیئے
آنے والا سرد ہوا کا جھونکا تھا!

(انتظار۔رگِ ساز۔۱۹۵۷ء)

پتھر جیسا دل رکھتے ہو!

دیکھو ندی کے اُس پار
پتھر پہ بھی پھول کھلے ہیں
(سنگدل۔رگِ ساز)

پچھلے پہر کے بھید بھرے سناٹے میں
جیسے ہی کچھ پیلے پتّے ٹوٹ گرے
ٹہنی سے، اک چنچل کونپل پھوٹ پڑی!
(دائرہ۔رگِ ساز)

کیا یہ چھوٹی سی ہائیکو طرز کی نظم ارتقائے زیست اور مولانا رومؔ کے شہرۂ آفاق حرفِ راز ''ہمچو ما سبزہ بار ہا روئیدایم'' کی یاد نہیں دلاتی؟

شاہین نے کلاسیکی روایت کی باوقار سادگی کے ساتھ الفاظ کی صورت گری اور زبان و بیان کی نرمی و صحت کو اپنا شعار و معیارِ شاعری بنایا اگرچہ اُن کی ابتدائی شاعری میں غنفوانِ شباب کے عشق و محبت کی گرمی اور التہاب ہے مگر وہ اونچی آواز میں بات نہیں کرتے بلکہ ایسی نرم گفتاری سے بات کرتے ہیں جس میں فضا کی مصوری اور ادبی صنّاعی کارفرما ہو۔ ''سرِ شام'' اچھی حزنیہ نظم ہے جس میں گرےؔ (Gray) کی ایلیجی (Elegy) کا خوشگوار اثر نمایاں ہے۔ ''الزام'' میں وہی وارفتگی و والہانہ شیفتگی ہے جو اخترؔ شیرانی کا طرۂ امتیاز ہے۔ ''درختِ صحرا'' ہسپانوی شاعر لورکا (Lorca) جیسی تاثراتی حزنیہ نظم ہے۔ ''پت جھڑ'' میں بے گھری کا گھٹا گھٹا نوحہ ہے۔ ''اقلیدسی زاویے'' اور ''وصال'' میں کس قدر ابہامی کیفیت ہے۔ ''آسمان'' آدمِ نو کے دورِ آفریں عزم و ہمت کا امتحان ہے۔

اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''رگِ ساز'' میں شاہین کی تخلیقی روح دو سطحوں پر سرگرمِ فکر ہے۔ پہلی سطح پر وہ اپنی عمرِ طبعی کے مطابق سوچتے ہیں جبکہ دوسری سطح اُن کی قبل از وقت ذہنی بلوغت کی سوچ ہے۔ یہ دونوں سطحیں عموماً متوازی خطوط پر سوچتی ہیں مگر جہاں بھی اُن کی ذہنی بلوغت کی سطح اُن کی عمرِ طبعی کی سوچ کا ساتھ چھوڑ کر افقی خطوط کی طرف اُٹھنے لگتی ہے وہیں اُن کی شاعری میں فکری عنصر لَو دے اُٹھتا ہے جوان کی عمومی شاعرانہ سوچ سے بہت مختلف ہو جاتا ہے۔ اُن کے ہاں یہ ایک ایسی منزل یا مرحلہ ہے جہاں جذبے، یاد اور فکر کی الگ الگ حیثیتیں باقی نہیں رہتیں بلکہ یہ تینوں عناصر لفظیات کے وصفی تزئینی کیف و کم میں گھل مل کر یک جان ہو جاتے ہیں۔

فرازِ دار و رسن سے کہ تیری گلیوں سے
کہاں کہاں سے کہانی تجھے سنائیں ہم

طنز مت کر غمِ دوراں کی تمازت ہم پر
اک ذرا بیٹھ گئے، مل جو گئی چھاؤں گھنی

میں ہی شاید نہ رہا لطف و کرم کے قابل
ورنہ اُن کو تو نہ تھی عادتِ پیماں شکنی

جوانی کی ابتدا ہوئی تو آلامِ عشق نہ سہی، آلامِ زندگی سے سابقہ پڑا۔ نتیجتاً آبائی وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ بہار سے ڈھاکہ آنے پر مجبور ہوئے۔ وہاں بھی چرکے کھائے، طعنے سہے اور کہنا پڑا:

تم تو وطن میں رہ کر بھی کہلائے اجنبی
اس اجنبی دیار میں کیوں آئے اجنبی

اِسی پیچ و تاب میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہو گیا تو:

ہر ایک سمت جب اُس کو پکارنا ٹھہرا
وہ پھر مری رگِ جاں سے قریب کیا ٹھہرا

اور پھر یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

کہنگی کھا چکی صحیفے کو

پے در پے جراحتوں نے اُن کے اندر ہجرت و بصیرت کی صلاحیت ضرورت سے زیادہ تیز کر دی اور وہ اس سوچ پر راضی ہوئے کہ زمانہ ایک حرکت مدام کا نام ہے جس کی تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ تاریخ ایک مسلسل رفتار ہے جسے کسی ایک مرکز پر روکا نہیں جا سکتا اور زندگی ایک بسیط حقیقت ہے جس پر کوئی بند نہیں باندھا جا سکتا کہ انسان ان حقیقتوں کے پھیلاؤ میں ایک ایسا راہ رو ہے جو روزِ آفرینش سے آج تک سرگرمِ سفر ہے۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں ایسی درد و کرب کی عکاسی ہے جس میں بے نشانی، بے چہرگی اور بے زمینی کی دھیمی دھیمی آنچ لَو دیتی محسوس ہوتی ہے۔ ''رگِ ساز'' اور ''بے نشان'' کے سرسری جائزے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یاد، جذبہ، فکر اور بے گھری اُن کی شاعری کی اساس یا عناصرِ اربعہ ہیں۔ یہ چاروں عناصر ماضی و حال کے حوالے سے اُن کی شاعری میں معنوی وسعت اور ایسی عمیق تہداری پیدا کرتے ہیں جو ریاضتِ فنِ شعر سے بے پناہ لگاؤ کا حاصل ہی نہیں بلکہ اُن کے وسیع مطالعہ اور تجربات کا ماحصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں کلیدی حیثیت سفر، بے گھری اور دربدری کو حاصل ہے اور وہ اس موضوع میں اظہار و ابلاغ کی نئی نئی صورتیں اور راہیں تلاش کرتے ہیں کیونکہ اُن کے حسی تجربے، اُن کی ذات کی اندرونی دکھن بن گئے ہیں اور اُن کی ذات کے خول سے متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کی ذات کا یہ خول بار بار کی اس داب کی جکڑ بندی سے چٹختا ہے تو اُن کی روح کا الم اور بڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے اس موضوع اور مضمون کی تکرار سے اُن کے نظامِ ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور اُن کی شاعری کے ریت ریت آنگن میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں دَر آتی ہیں۔ یہی احساس ہے جسے وہ ''بے نشان'' کے انتساب میں اپنے نغمے اپنے نوحے اپنے خواب سے تعبیر کرتے ہیں اور جو اُن کی شاعری میں اس طرح اظہار پاتے ہیں:

تعاقب کر رہے ہیں لوگ اپنا
کشاکش میں شناسائی پڑی ہے

ریزوں میں بٹ گیا ہوں میں شاہین ہر طرف
پہچان لے مجھے مرے بکھرے نشان سے

اب شاہین کی فکر میں نمایاں پختگی اور فنّی رچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اب دکھوں کی یاد گہری اور بے بسی کا احساس شدید ہو گیا ہے۔ وحشتِ شوق، گرمیٔ شوق میں ڈھل کر رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ چنانچہ آٹوا آ کر کتنی دردمندی سے کہتے ہیں:

اجنبی شہر میں شیشے کے گھروں سے باہر
جھرمٹوں میں کوئی اپنا ہے گماں تک مشکل

اور پھر کتنی کربناکی کے ساتھ یہ احساس چٹکیاں لیتا ہے:

اس خزاں کی خنک اور سیہ رات میں
خواب تک چھن گئے بے کسی ہے یہی

لیکن اس اداسی اور دکھن کے احساس کی تہہ میں شاہین کی شاعری میں چاندنی کا سا فیاضانہ حُسن و ترنم ہے، جذباتی سطحیت یا محدود خیالی نہیں بلکہ نزاکتِ احساس ہے۔ اُن کا ترنم بے آہنگ، اُن کی دُھن پھیکی یا بے مزا یا بے اثر نہیں۔ اُن کے سُر بے سُرے نہیں ہونے پاتے بلکہ اُن کے اندر ایک طرح کا کیمیاوی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ کے الفاظ عجیب پُر معنی اور پُر اسرار صورتِ فن اختیار کر لیتے ہیں۔ دو چھوٹی چھوٹی نظمیں ملاحظہ فرمائیں۔ پہلی نظم میں طنزیہ کاٹ کے ساتھ غزل کی گھلی گھلی چاشنی اور نرمی ہے اور دوسری میں چینی نظموں کی سی امیجری (Imagery) منفرد ڈکشن اور روزمرہ کی سادہ مگر پُر کار زبان، قوتِ حیات کی غمازی کرتی ہوئی نظر آئی ہے:

ہر ایک زلف میں ہر ایک پیرہن میں گلاب
گلاب آنکھوں میں چہرے پہ اور بدن میں گلاب
ہزار رنگ کے طوفان بند کلیوں میں
گلاب تیرے دریچوں میں تیری گلیوں میں
بہت حسیں ہے گلابوں کے شہر تری شام
جو ریت ریت ہیں اُن آنگنوں کا تجھ کو سلام (اسلام آباد)

اب دوسری نظم ملاحظہ ہو:

بار بار اک چڑیا
تیر بَن کے اُڑتی ہے
بیچ کھا کے مڑتی ہے
میگھنا کے پانی میں
ڈبکیاں لگاتی ہے
اور پھر لبِ ساحل
بال و پَر سکھاتی ہے
بار بار اک چڑیا (رقصِ حیات)

یہ نظم اس خام خیالی سے نجات دلاتی ہے کہ فکری شاعری کے لیے کوئی علیحدہ زبان ہوتی ہے۔ یہ نظم فکری بھی ہے اور فکر انگیز بھی کہ سادگی اور پُر کاری کی اس سے زیادہ موثر اور دلکش مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ دراصل یہ نظم عصری سچائی یا صداقت اور فن کارانہ ملاپ سے پیدا ہوئی ہے اس لیے گہری بصیرت اور تخلیقی توانائی سے بہرہ ور ہے ہر چند کہ اس کی زبان انتہائی سادہ اور نامانوس سی ہے۔ اس سادگی نے اسے پوری جدید نسل و شاعر کا لہجہ بنا ڈالا ہے حالانکہ اس میں کس طرح کی تخلیقی گرامر کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔ اب اسی انداز نہج کی ایک اور نظم ملاحظہ کریں جس کا ڈکشن اس لیے کسی قدر ملتا جلتا ہے مگر ذرا سا مختلف ہے:

ایک کونپل
نرم و نازک
جس کو زہری بان بن کر
ڈس گیا سورج کا پندارِ ہوس
اُس کے سوکھے نیم جاں
ہونٹوں پہ شبنم رات بھر
زندگی کا شہد ٹپکاتی رہی
صبح دم کونپل
بصد انداز
جینے کی لگن دل میں لئے سرشار تھی

دوسری جانب مگر
رقص پھر کرنے لگا آسیب کی صورت
ہٹیلے سر پھرے سورج کا پندار ہوس
دفعتاً
گونجی فضا میں اک صدائے شبنمیں
ہم ازل سے تا ابد پائندہ ہیں
ہم ازل سے تا ابد پائندہ ہیں

اور پھر سورج بھی پیلا پڑ گیا! (جاوداں)

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں شاہین نے اپنی شاعری کا آغاز کلاسیکی روایت ہی سے کیا اور مدت تک اسی پر قائم رہے جس میں بہر طور طرفہ تازگی اور تازہ کاری اُن کا طرہ امتیاز رہا۔ ''رگِ ساز'' ہر چند کہ اُن کی ۶۶ء تک کی شاعری کا انتخاب ہے مگر اُس سے اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ وہ منفرد لہجہ و اسلوب لے کر آئے ہیں۔ ''بے نشان'' میں جو ڈکشن شعری قاموس اور نیرنگ فکر و نظر ہے اس سے میری بات کو تقویت ملتی ہے۔ ''رگِ ساز'' کے بعد شاعری شاہین کا ایک نیا تجربہ اس لیے بھی ہے کہ وہ وقت اور عصری اقدار دونوں ہی سے ہم آہنگ ہے۔ زندگی کی مسلسل ہزیمتوں نے اُن کے کردار میں شرافتِ نفس اور بالغ نظری کے ذریعہ ایسا درد و کرب پیدا کیا ہے جس میں تخلیق کا نور بھی ہے اور تعمیر کا ساز بھی۔ یہ ایک ایسی بڑی بات ہے جو اُن کی شخصیت کے جوہر اور شاعری

کے باہمی رشتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعری تمام تر فن نہیں ہے کہ اُس پر قابو پا کر کوئی شاعر بن جائے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعری تمام تر خداداد قابلیت بھی نہیں۔ شاہین نے اس راز کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ اسی لیے وہ اپنی بات بڑے منفرد اسلوب و ہیئت میں پوری شدت وقوت کے ساتھ کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں:

گھر سے نکلا تو کئی بار خیال آیا تھا
جستجو ہے تو پریشاں نظری بھی ہوگی
ہر کھلی آنکھ میں رسوائیاں منڈلاتی ہیں
باعثِ دربدری، دیدہ وری بھی ہوگی
(قریۂ جاں کی ایک نظم)

اور پھر اسی شعری مجموعہ کی چوتھی نظم میں دربدری سے پیدا ہونے والی دیدہ وری کا ثبوت مل جاتا ہے۔

روح کی بے سمت راہیں
ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہونے کی پیہم اذیت
گٹھریوں میں زندگی کا بوجھ
آتی جاتی سانسوں کا اثاثہ
ہر گھڑی موہوم سی اک شادمانی کی للک
نام کی تختی انا ہو
پھر اُسے اک اجنبی دیوار پر لٹکاؤ
کھرچو اُس پتے کو جو کبھی تھا
(کس سے پوچھوں
کہ میرا کیا پتہ ہے؟)
کب تلک سُوکھی زباں پر
گرد کا یہ ذائقہ ڈھوتا پھروں
سَر پہ کس اُڑتی ہوئی بدلی
کا میں سایہ کروں (بے نشان)

یہ نظم دردنارسائی کا ایک ایسا نوحہ ہے جس میں اُن کی ہزیمتوں کی داستان بھی ہے اور کردار کی شرافتِ نفس اور بالغ نظری کے ساتھ اُن کی شخصیت کے تمام جوہر اپنی خودی کی نگہبانی بھی کر رہے ہیں اور وجدان عرفان کی پوری قوت وشدت کے ساتھ ترجمانی بھی کر رہے ہیں۔ اس میں اُن کی پوری داستانِ دردسائی ہوئی محسوس ہوئی ہے اور اس داستانِ درد میں پوری نئی نسل کا المیہ سانس لے رہا ہے۔

''بے نشان'' میں شاہین کی شاعری مختلف تجربات سے گزری ہے۔ یہ تجربے صرف ہیئت میں نہیں ہوئے ہیں بلکہ موضوعات کے انتخاب میں بھی ہوتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں نظم معریٰ اور آزاد نظم کا رواج اور شعور ولاشعور کی پیچیدگیوں کے ساتھ نفسیاتی الجھنوں کا کس قدر مبہم بیان، دو ایسی مخصوص چیزیں ہیں جن پر نگاہ ضرور پڑتی ہے۔ بعض شعراء نے اسے جدت سمجھ کر اپنایا اور بعض نے اپنی شاعرانہ شخصیت کے اظہار کا وسیلہ قرار دیا۔ ان شعرا میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس نقالی میں پھنس کر بے راہ روی کا شکار ہو گئے اور چند ایک ایسے بھی ہیں جو چھوٹی سی دنیا میں محدود ہو کر رہ گئے۔ لیکن شاہین نے ایسے تجربوں میں کچھ کوئی کشش محسوس نہیں کی اور اپنی شاعری کو اُن اعلیٰ مقاصد کے لیے وقف رکھا جو تعمیر حیات کے کام آتے ہیں۔

شاعری کے اس نئے موڑ پر آتے ہی اُن کے نزدیک معلوم ونامعلوم دو انتہائیں ہو گئیں۔ انہی دو انتہاؤں کے درمیان سعی وتلاش کے سفر سے زندگی عبارت ہے اور یہی سعی وتلاش کا سفر ہر انسان کا مقدر ہے۔ کچھ ایسے بھی بے خبر و نظر ہیں جنہیں نہ انتہا کی خبر ہے اور نہ ابتدا معلوم اور نہ وہ ان بکھیڑوں میں الجھنا ہی چاہتے ہیں۔ عام انسان سے لے کر ادیب، شاعر، دانشور کسی کو اس سے مفر نہیں۔ شاہین جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں جذبہ وفکر کے شاعر ہیں اس لیے معلوم سے نامعلوم تک کا یہ سفر اُن کی اپنی بازیافت کا لاشعوری عمل یا سفر ہے۔ اُن کی شاعری میں یہ حکایت سفر جبری بھی ہے (بہار سے ڈھاکہ۔ ڈھاکہ سے لاہور) اور اختیار بھی (پاکستان سے کینیڈا) شاہین کی شاعری اس جبر واختیار کی حیرتوں کی ترجمان بھی ہے اور آئینہ دار بھی۔ جبر واختیار کے اس سفر کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں:

(یہ جُرم ثابت ہے کہ ان سب نے ایک خواب دیکھا تھا
پناہ گزینوں کے کیمپ کا ایک کتبہ)
اپنے ماں جائے تھے
جن کے سر
اپنے نیزوں پہ رکھ کر
قبیلے کے وحشی جواں رات بھر
رقص کرتے رہے
اور پھر خوں چشیدہ زبانوں سے
روحوں کے بے پیرہن
زخم کھائے ہوئے نیم جاں جسم کو چاٹ کر
سوم اس کی نشیلی گپھاؤں میں
روپوش ہو گئے

اور اب ایک اور سلسلے خواب کا روح فرسا منظر:

رات بھر زنجیر کاٹوں
اک نئی زنجیر پہنوں
اپنی ان بے خواب آنکھوں میں
سنہرے خواب بن کر
چند اک سیماب پا، بے درد لمحوں کو

ربڑ کی طرح کھینچوں
اوران لمحوں کی، گرہوں میں
پھر اپنے خواب باندھوں
اَب مری سوچوں میں گرہیں
اَب مری سانسیں وہاں
اب مری دھنویوں میں گرہیں
اب مرے سائے بھی جال
اب میرے اطراف گرہوں کا طلسم
شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح جکڑا ہوا گرہوں میں جسم
(اب جوان گرہوں کو کھولوں اک صدی پر پھیل جائیں)
صبح دم بستر پہ تھک کر چُور گرتا ہوں
تو اب یہ سوچتا ہوں
رات بھر زنجیر کاٹوں، کاٹتا جاؤں مگر
کیوں نئی زنجیر پہنوں
کیوں کوئی زنجیر پہنوں (پچھلے سال کی آخری نظم)

اور پھر:

جو اُس طرف
اب نہ جانے کتنی مسافتوں کے پرے ہے
میں اُس کو اپنی آنکھوں میں دیکھتا ہوں
میں اُس کے چاروں طرف اندھیرے کی طرح
خود کو لپیٹ ڈالوں
میں اس کے سینے میں سانس لیتا ہوں
اور آخر
اُسے برہنہ کسی اک حقیقت کا روپ دے دوں (برہنہ روپ)

پہلا اقتباس اس دورِ جہنم کے کرب و اضطراری داستانِ خونچکاں کا آئینہ دار ہے جو سقوطِ ڈھاکہ کی ہولناکی کی صورت میں نازل ہوا۔ دوسری نظم جسم و جاں کا وہ مرحلہ جانکاہ ہے جو اُس جنتِ ارضی کی جدائی کے داغ سے ہمرشتہ ہے اور گومگو کی بیزار کُن کیفیت پر ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے اقتباس سے خود اعتمادی کی لازوال کرن پھوٹتی ہے جس کا گہرا دکھ اور بسیط المنا کی برہنہ حقیقتوں کے کیف و کم میں ڈھل گئی ہے۔

شاہین کو کینیڈا آ کر آٹوا میں آباد ہوئے تقریباً ربع صدی بیت چکی ہے۔ بے گھری، دربدری اور صدیوں کی تھکن کا احساس ختم ہو جانا چاہیے تھا مگر:

جدا از قربتِ جاناں، رہا زجاں شدہ ام
نشانِ ماہی باشد کہ بے نشاں شدہ ام

قربت جاناں سے دُوری نے بے نشانی اور عدم تشخص کا وہ احساس پیدا کیا کہ زمینی اور ذہنی ہجرتوں کے تمام داغ مٹ گئے اور اُنہیں (یعنی شاہین کو) ہجری ادب اُن تہذیبی اور تاریخی سلسلوں کی طرف لے گیا کہ وہ والہانہ کیف و سرمستی کے عالم میں جھوم کے کہہ اٹھے:

سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی
ہمارے گھر سے یہ پیغمبری نہ جائے گی

یہ کوئی آسان خیال نہیں بلکہ ایک الہامی کیفیت ہے جو شعر کے قالب میں ڈھل گئی ہے دوسرے مصرعہ میں ایک ایسی بلیغ حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو اُن کی تہذیبی اور تاریخی روایت کا جزو لاینفک ہے جسے وہ پیغمبری سے تعبیر کر رہے ہیں۔ درحقیقت، یہ پیغمبری وہ اسوۂ حسنہ ہے جس کا آغاز مکے سے ہجرت اور مدینہ منورہ پہنچ کر ہوا تھا۔ ولی عالم شاہین سید زادے ہیں۔ رسول اللہؐ اور آلِ رسولؐ سے اُن کا گہرا باطنی و نسبتی رشتہ ہے۔ اُن کی خاکستر میں وہ چنگاری موجود ہے جس کی ابتدا وہ کینیڈا آ کر بھائی چارے اور انسان دوستی سے کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کی تاریخ اور تہذیبی روح کو اُن کے غیر منطقی عمل سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور وہ اس اجنبی فضا اور تضادات سے پُر ماحول میں رہ کر بھی قانونِ فطرت کے اعلیٰ تقاضوں کے مطابق ایک مقامِ فکر سے دوسرے مقامِ فکر کی طرف جادہ پیما ہو سکیں۔ وہ اب عالمی سطح پر سوچ رہے ہیں۔ ''آئینہ کنچن اور آیتیں'' ''ایک شام'' ''بوڑھا معالج'' ''میرا بل ائر پورٹ'' ''غسلِ آفتابی'' ''کولمبس اے کولمبس'' ''ویت نام'' ''مشرقِ وسطیٰ'' ''برف کی کالی کیچڑ'' ان کے موضوعات ہیں۔ ان نظموں میں سے چند ایک کے اقتباسات پیش کیے بغیر سرسری گزر جانا زیادتی ہوگی۔

اپنے اپنے دوزخوں کی آگ لے کر
شام ہوتے ہی نکل آئے ہیں سارے لوگ باہر
اور باہم رکھ رہے ہیں
اپنی اپنی آگ کا الزام سب، اک دوسرے پر
اور اس کوشش میں سارا آسماں
سر پر اُٹھانے کا تہیہ کر چکے ہیں
(اب صحیفہ کون سا اترے گا ان کے واسطے؟
تھے یہاں جتنے پیمبر مر چکے ہیں)
کھوکھلی آواز میں سب چیختے ہیں
چیختے ہیں تا کہ یہ احساس ہو زندہ ہیں وہ! (ایک شام)

اور پھر ''غسلِ آفتابی'' کے تکملہ پر:

سوادِ خلد مغرب!
کیا عجب تیرا معمہ ہے
تیری منزل ہے میرا رنگ
میرا رنگ، ہاں جس پر تری نفرت کا سایا ہے
مگر جادو کا کیا کیجیے

کہ سر چڑھ کر ہی رہتا ہے!

''ویت نام'' کا تاثراتی تجزیہ:

تم اُن بستیوں کو
جہاں رات دن تم نے شعلے گرائے
اگر جا کے دیکھو
تو خود رو پڑو گے

''مشرقِ وسطیٰ'' کی حالت زار کا نوحہ:

معجزے کی توقع میں گم روز و شب
اپنے جانباز پُرکھوں کے وارث
خود اپنی ہی زنجیر ہاتھوں میں پہنے ہوئے
یہ دعا مانگتے ہیں
کہیں سے چراغ الٰہ دین مل جائے
پھر اُن کی تقدیر جاگے
مگر روز خوابی سے تقدیر کب جاگتی ہے
روز خوابی شکستہ گھروں کا مقدر!

ان اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شاہین ''بے نشان'' میں فکری پختگی، اپنے ایجاد کردہ مخصوص ڈکشن اور شعری قاموس کے ساتھ زندگی سے بے پناہ محبت اور احترام و عظمتِ آدم کی نویدِ تازہ لے کر آئے ہیں جس میں وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ آفاقیت ہے لیکن کہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ شعر و شاعری کا تعلق سرتاسر دیدہ وری اور دانائی سے ہی نہیں جب تک کہ دیدہ وری اور دانائی میں لطفِ سخن پیدا نہ ہو۔ یہاں ''لطفِ سخن'' سے میری مراد ہرگز زبان دانی، محاورہ بندی، سلاست روی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ شاعر کے مزاج کی مخصوص کیفیت، ذوق سلیم، ہنروری، علمی بصیرت اور خداداد صلاحیت ہے جو خارجی حالات کے ٹکراؤ اور تصادم سے عمل میں آتی ہے۔ اور یہ بات صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر انسانیت سے قربت اور زندگی سے گہری وابستگی حاصل کر لے اور جب شاعر اس مقامِ بلند کو چھو لیتا ہے تو اُس کے کلام میں وہ غنائی روح اتر آتی ہے جسے انگریزی زبان میں سمفنی (Symphony) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سمفنی میں حسن و عشق کے نغمے بھی ہوتے ہیں۔ ذاتی شکست و ریخت کے نوحے بھی اور رنگ و نیرنگ کے طلسماتی خواب بھی۔ شاہین نے ''بے نشان'' کی شاعری یا اپنی شاعری میں یہی سب کچھ سمو لیا ہے اور ان کے امتزاج اور آمیزش سے ایک منفرد اور انوکھی سمفنی (Symphony) ترتیب دی ہے۔

شاہین کی شاعری میں تصوریت، حقیقت پسندی اور جدیدیت کی کم و بیش ہر رَو بڑی تازہ کاری کے ساتھ جلوہ پیا ہے۔ ''رگِ ساز'' سے لے کر ''بے نشان'' تک ایک خاصی مرصّع و مربوط داستان ہے جس کی روشنی بلکہ متزّہ تابش بیک وقت بڑی دلسوز و دلنواز ہے جس سے اُن کی شہرت و مقبولیت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔

شاہین نے نظم میں بے شمار ہیئتی تجربات کیے ہیں۔ ایک مصرعے، دو مصرعوں، تین مصرعوں کی نظموں سے لے کر ''اِکیسّی'' لکھنے تک ان کے تجربات خاصے متنوّع رہے ہیں۔ سہ مصری نظم کہنے والوں کی اوّلیں صف میں شامل ہیں۔ تاہم غزل کی بات کریں تو وہ اس ہیئتی لحاظ سے مکمل سمجھتے ہیں اور اس میں نئے مضامین تو خود بھی لاتے ہیں مگر ان کا بس چلے تو اس کی ہیئت کی توڑ پھوڑ کرنے والوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں کہ غزل کی لطافت برقرار رہے۔

شاہین کی کتاب ''بے نشان'' رانچی یونیورسٹی، بہار کے جدید اردو ادب کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہے بلکہ حال ہی میں وِنو بھاوے یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل کی گئی ہے۔ اس لیے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے اس کتاب کا نیا ایڈیشن بھی شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ رانچی اور بھاگلپور کی یونیورسٹیوں میں ان کی شاعری اور زندگی پر پی ایچ ڈی کا کام پروفیسر وہاب اشرفی اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی زیرِ نگرانی ہو رہا ہے۔ ان کے کلام کے تراجم انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، ہندی اور بنگلہ زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔

نسیم سحر

شاہین کی شاعری قدیم و جدید اصول و ضوابط کے گرد گھومتی ہے انہوں نے اپنے ذاتی تجربات و احساسات کو بنیاد بنا کر ان شکستہ دنوں کی نوحہ گری کی ہے جو اسی معاشرے میں جنم پاتے ہیں۔ شاہین کی نظمیں دل سوز اور جگر پاش مناظر کی عکاس ہیں۔ مثلاً ''بے نشان'' ''دُکھ میری زنجیر'' ''برہنہ روپ'' ''کتبہ'' اور دوسری ایسی نظموں میں بے نشانی، بے زمینی اور ہجرت کا بیان، دھرتی سے تعلقِ خاطر کا اظہار بھرپور علامات کے ذریعہ کیا ہے یہ یقیناً شاعر کا نوحہ ہے بلکہ ہر اس فرد کا نوحہ ہے جس نے اپنے آبائی صوبہ بہار سے مشرقی پاکستان ہجرت کی لیکن حالات کی ستم ظریفی نے وہاں بھی نہ رہنے دیا۔ اور وہاں سے بے گھر ہو کر مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان آ گیا اور پاکستان سے کینیڈا۔ اور اس طرح بے زمینی کا احساس شاہین کی شاعری کا جز بن گیا۔

مشہود حسن رضوی

نشانِ بے نشانی

ڈاکٹر حنیف فوق
(کراچی)

شاہین کی شاعری جسے وہ نغمہ، نوحہ اور خواب سے تعبیر کرتے ہیں دراصل ذات کے پیچ در پیچ واسطوں سے اپنے حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس احوال وجود کی شاعری ہے، جسے وجودیت سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے تخلیقی عمل میں وہ متغیر شخصی احساسات کی تصویر کشی کرتے ہوئے اظہار کی نئی صورتوں کی تلاش کرتے ہیں، لیکن معاشرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے اس کا سلسلہ منقطع نہیں کر دیتے۔ ان کی شاعری میں حقیقت و تخیل کے ایک نئے امتزاج سے رنگ و صورت کی جو نازک شکلیں اور حسّی تجربہ کی جو متحرک تصویریں ملتی ہیں ان میں انسان اور زمین سے محبت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ پھر اپنے حسّی تجربے کے سفر میں وہ اس مرکز کشش کو جسے روایت کا نام دیا گیا ہے اور جو دراصل نئی فکری و احساساتی لہروں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اپنے نظامِ ذات کا جزو بنائے رکھتے ہیں۔ شاہین ذات، فطرت اور معاشرے کو تاریخ کی تکوینی وحدت سے منسلک نہ کرتے ہوئے بھی زمان و مکان کا پابند ضرور جانتے ہیں اور دعویٰ یا اعلان کیے بغیر بھی ان کی شاعری سماجی رابطوں سے سروکار رکھتی ہے۔ شاعرانہ ذہن اور خارجی صورتِ حال کے درمیان جو رشتہ ہے شاہین کی شاعری اسے رد کرنے کے بجائے قبول کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اسی لیے اسے زندگی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

شاہین کی شاعری کے ''ریت ریت آنگن'' حسین گلابوں کے شہروں کو سلام کہتے ہوئے، بن باس کی سختیوں اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے ہیولوں کو نظر انداز نہیں کرتے اور اس طرح ہم عصرانہ زندگی کے جو جلوے ان کے یہاں ملتے ہیں، وہ جذبات کے اسرار کے ساتھ ماحول کے تضادات کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک ہی معاشرہ کی مختلف الحال تصویریں بھی ملتی ہیں لیکن بن باس نے انہیں نئے مناظر بھی دکھائے ہیں۔ چنانچہ مختلف الخیال معاشرے کے نقوشِ رنگا رنگ بھی ان کے شاعرانہ خاکوں میں رنگ بھرتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہین کی شاعری لحہ رواں کی طلسماتی کلمہ سے جاگتی ہے اور ہم عصرانہ احساس کا افسوں جگاتی ہے۔ ان کے سارے شاعرانہ موضوعات میں حسی عناصر کی رنگ آمیزی ہے اور احساس کی ایک زیریں رو مختلف حالات و مقامات سے گزرتی ملتی ہے۔ احساس کی یہ رو آماجگاہ تصورات نہ سہی، خوابوں کی تجلی سے خالی نہیں۔ چنانچہ شاہین کی شاعری انفرادی حسّی تجربہ کی راہوں سے آگے بڑھ کر اس منزل کی جستجو کرتی ہے جہاں جشنِ اعتبارِ تمنا منایا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہہ کر کہ ''یہ کیا ضرور خواب کی سچائی خواب ہو'' اسے حقیقت میں بدلنے کی آرزو کی جا سکتی ہے۔ شاہین کی شاعری اس لیے قابلِ مطالعہ ہے کہ دورِ جدید کی بے مائیگی کا بیان کرتے ہوئے یہ خود حرکتی کے عمل کے بجائے خوابوں سے سروکار رکھتی ہے۔

شاہین کی شاعری خواب اور حقیقت کے ساتھ ساتھ احساسات اور اشیاء کی اُس آمیزش سے نشو و نما پاتی ہے جس میں خواہشِ تعبیر تمنا جھلکتی رہتی ہے۔ اس کی جدیدیت، حقیقت پسندی کی روایت کے زیرِ سایہ آگے بڑھتی اور اس کی خبر دادگی اور حس کردگی دونوں ہی میں اس روایت کی نئی سمتوں میں کشادگی کا پتہ چلتا ہے۔ انسانی فردیت کا یہ بامعنی اظہار کہ جس کا سلسلہ، مجہول میں معروف کی تلاش تک پھیلا ہوا ہے، شاہین کی شاعری کو شاعرانہ اعتبار عطا کرتا ہے۔ یہ شاعری جو خوش وقتیوں اور ماتم گر فتگیوں کے نوش و نیش سے مضطرب و آسودہ لمحوں کو مفہوم و کلام کے قالب میں ڈھالتی ہے اس لحاظ سے بھی معتبر ہے کہ ذات کی بے نشانی کو اپنے دور کا نشان بنا دیتی ہے۔

شاہین کی شاعری اپنے طرزِ احساس اور روشِ اظہار میں جدید ہوتے ہوئے بھی ان مبتلایانِ جدت سے مختلف ہے جن پر جدت ہزیان کی طرح نازل ہوئی ہے اور جو ماورائے عقلیت کے فرزانوں کی ہُو سہارا پا کر وجد میں آ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایسے جدت پسندوں سے بھی مختلف ہیں جو کرتب اور جدت میں فرق کرنے سے قاصر ہیں۔ اپنی جدت کا اشتہار دینے کے لیے بعض اپنی شاعری میں سائنسی اور صنعتی دور کے نشانات کی بھرمار ضروری سمجھتے، بعض جدید الفاظ و تراکیب کے پیوند لگاتے، بعض سطحی خوش نمائی سے بے تعلق لفظی پیکروں کو جوڑتے بعض خوش آہنگ لفظوں کے قالب ڈھالتے، بعض پراگندگی کو اپنا شعار بنا لیتے، اور بعض اظہار کا سانچہ توڑ دینے ہی کو ایجاد کا کمال سمجھتے ہیں۔ دراصل اظہار کے مختلف شعبدے ہوں یا خود نفی اظہار سے صورتِ اظہار نکالی جائے یہ ڈھکوسلے جدید حسیت سے عاری ہونے کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کسی بہت معمولی بات کو نئی دنیا کے دریافت کر لینے کے ٹھسّے کے ساتھ پیش کرنا بھی شاعری میں جدیدیت کے سرخاب کا پر نہیں لگا دیتا۔ شاہین کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مشاہدہ کی تازگی اور احساس کی تازہ کاری تو ملتی ہے لیکن ان ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیا گیا ہے جہاں ادّعا شاعرانہ احساس کی جگہ لے لیتا ہے الفاظ نئے بنے ہوئے قالبوں میں ڈھل جاتے ہیں اور علامتوں کو پرچم کی طرح لہرایا جاتا ہے۔ اسی طرح جدید عصر کے خلفشار کو ظاہر کرنے کے لیے وہ ہوش سے ہذیان کی طرف سفر کو بالاتر حقیقت نہیں جانتے۔ ان کی شاعری زیست کی بے حاصلی کے متعدد لمحوں کو پیش کرتے ہوئے بھی جیتے رہنے کی پرچھائیوں کو واضح کرتی اور انسانی آرزو کے علائم و رموز سے اپنا تعلق قائم رکھتی ہے۔

شاہین کی نظموں کا شاعرانہ آہنگ حسّی تجربے کی دین ہے لیکن نہ وہ فکری تنظیم کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور نہ بے ہیئتی کے انتشار کو حواس کی شہادت کا وسیلہ بناتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں موضوع و معروض میں جلی یا خفی مناسبت ضرور ملتی ہے۔ ان کی شاعری ذات کا اظہار ہوتے ہوئے بھی خود فروشی سے دور اور جدید معاشرت کے اٹھائے ہوئے سوالات سے قریب ہے۔ وہ عصرِ حاضر کے ویران قریوں کی نمائندگی نہیں کرتے تو ان کے آثار و نشانات ضرور دکھاتے ہیں۔

شاہین کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو اپنے

محسوسات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور جدّت پسندی کے نام سے جدّت کی غلط تعبیر کرنے والے ہوش کے دشمنوں اور جنون کے وکیلوں کی آواز پر کان نہیں دھرتے۔ان کے اندر کی یہ روشنی بعض اوقات باہر بھی اجالا چاہتی ہے اوران کی کئی نظموں میں احساسات اور آرزومندی کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے چنانچہ ''بوڑھا معالج'' میں وہ خرابہ میں خوابوں کا ایک شہر آباد پاتے اور پرچھائیوں کو خیمہ خیمہ خراماں ہوتے دیکھتے ہیں۔اپنی نظم ''دکھ مری زنجیر'' میں وہ موسم کے تماشے اور اپنے لہو، اپنے ضمیر کو ایک ہی منظر کے شریک پاتے ہیں۔شاہین نے بے وطنی، مہاجرت اور بے نشانی کا کرب برداشت کیا ہے۔ جہاں وہ بادوباراں کے طوفانوں سے آشنا ہوئے ہیں وہاں دہلی، احمد آباد، مشرقِ وسطیٰ، کشمیر، قبرص اور ویت نام کو بھی اپنے سے باہر نہیں، اپنے دل کے نہال خانہ میں محسوس کر کے شاخِ زیتون کو منہ میں دبائے خشکیوں کی خبر لانے والی فاختہ کے انتظار میں شک وامید کی آمیزش کا درد بھی سہا ہے۔ وہ ''ایک شام'' میں جینے کے احساس کے لیے کھوکھلی آواز میں چیختے انسانوں کو آئینہ دکھاتے ہیں۔شاہین اپنے وجود کی شناخت اور مٹی کی پہچان کو رونما ہونے والے حادثات سے وابستہ کرتے ہیں اور اعداد وشمار کے گورکھ دھندوں سے لے کر اجلے پیرہن کے نیچے کالے داغوں تک کو اپنے شاعرانہ احساس کے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ دورِ حاضر کے خارجی انتشار اور ذہنی فساد کے درمیان ''زردقاش'' جیسی نازک ولطیف ''جاوداں'' جیسی خوش آئند وگرم اور ''کتبہ'' جیسی پرزور وپُرکار نظم کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

شاہین نے جدید صنعتی معاشرہ کا انسانی اقدار کی روشنی میں جائزہ لیا ہے وہاں وہ ''برف کی کالی کیچڑ'' اور ''۲۵ دسمبر'' جیسی نظموں کو معنوی آب ورنگ دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔لیکن ''غسلِ آفتابی'' میں مشرقی مزاج کو مغربی ماحول پر مسلط کرنے کی خواہش راشد کے ''انتقام'' کی معکوس بازگشت بن کر رہ گئی ہے۔شاہین کی نظم ''بے نشان'' موجودہ انسان کی جلاوطنی کی ذہنی کیفیت کا خواہ وہ وطن میں ہو یا وطن سے باہر، ایک خوبصورت اور پُرتاثیر اشارہ ہے۔ان کی نظم ''آئینہ، کنچن اور آیتیں'' اپنی ملائمیت اور دردمندی کے اعتبار سے بڑی زیبائی کی حامل ہے۔ دریائے کنچن کے کنارے بربریت کے مظاہرہ پر لکھی ہوئی یہ نظم اگرچہ اس پورے تاریخی المیہ کی نیم رخی تصویر ہے لیکن اسے اپنے حدود میں کامیاب کہا جاسکتا ہے۔پھر اس کی ساکن مثالیت فتنہ کی آگ کو بھڑکانے والی ہوا کے بجائے موجِ آب کا چھینٹا ہے۔''سلسلے خواب کے'' دوسری نیم رخی تصویر ہے لیکن اس میں پناہ گزینوں کے ایک کیمپ کے کتبہ کی طنزیہ نشتریت نے خواب کے بے انت سلسلہ سے مناسبت قائم کر کے اپنا دائرہ اثر وسیع کیا ہے کیونکہ اس میں سرہی نیزوں پر بلند نہیں ہوئے ہیں، ماں جایوں کے خواب بھی نیزوں پر لٹکتے رہے ہیں۔اور نظم حادثہ کو ہی نہیں اس کے قبل وبعد کے خواب وشکستِ خواب کے سلسلوں کا احاطہ بھی کر لیتی ہے۔شاہین کی اس نوعیت کی نظموں میں احساس کی کڑیاں اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہوجاتی ہیں کہ ایک معنوی وحدت وجود میں آتی ہے۔

شاہین کی بعض نظموں میں روز مرہ کی زندگی کی معمولی اور سادہ جزویات کی اچھی مصوری کی گئی ہے۔کہیں کہیں یہ جزویاتی مصوری دیگر اشیاء سے ایک حد تک غیر مربوط ہوگئی ہے لیکن اسے لاتعلق پھر بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس میں ریزہ کار نقاشی کا حسن ملتا ہے مثلاً میگھنا کے پانی میں ایک چڑیا کے بار بار ڈبکیاں لگانے اور پھر لبِ ساحل بال وپر سکھانے کے منظر کی عکاسی کی گئی ہے لیکن اس منظر میں حرکت کا احساس بھی ہے اور اس لیے نظم کا عنوان ''رقصِ حیات'' رکھا گیا ہے۔ اس طرح جہاں یہ جلوے ماحول کے سکون واضطراب سے معنوی ربط حاصل کر لیتے یا کسی چھوٹے بڑے خواب کا حصہ بن جاتے ہیں وہاں دل آویزی اور جاذبیت میں اضافہ ہوجاتا ہے ''یہی زندگی ہے'' بھی ایک منظر کی جاذبِ نظر تصویر ہے۔

شاہین نے ''بے نشان'' میں دورِ آشوب کا حال دیکھا اور مہاجرت کے دکھ کو بیان کیا ہے۔اس مہاجرت کا سلسلہ کئی مہاجرتوں، کئی ملکوں اور طویل زمانوں پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔عزیز لمحوں کے وداع، نئی زمینوں کی خوشبو، جواں جسموں کی تمازت اور اپنی داماندگی کے بعد آخر کار شاعر کو ''اپنی مٹی سے الگ سب واہمہ'' ہونے کا احساس ہوجاتا ہے۔یہی احساس اسے اپنی پہچان کی ترغیب دیتا ہے لیکن اب تک اتنے پیوند اور اتنی مہریں لگ چکی ہیں کہ اپنی پہچان تو کجا، روح کی راہیں تک بے سمت ہوگئی ہیں۔بڑی بات یہ ہے کہ اس روح فرسا صورتِ حال کو شاہین نے مراقِ ماضی نہیں بننے دیا ہے۔ خود بے یقین رہ کر بھی زندگی سے لگاؤ رکھا اور تلخی سے دامن بچایا ہے۔شاید نئے انسانی رشتوں کی دریافت پھر اس آسیبی فضا کے خوف ودہشت کو شوق ومحبت سے بدل دے لیکن اس کے لیے خود کارروانِ انسانیت کا نئی منزلوں تک سفر لازمی ہے۔

''رگِ ساز'' سے ''بے نشاں'' تک شاہین کی شاعری میں جو فنی ارتقا ملتا ہے اس کا ایک اندازہ ان کی حسّی تصویروں کی پرکاری اور لفظوں کی محتاط ترتیب سے ہوسکتا ہے۔بعض لفظی آرائش کے خوگر، لفظوں کا ایسا نمائشی اور بے سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں کہ لغت میں چاہے ان کے جو معنی بھی ہوں ان کی ترتیب دی ہوئی صورت میں الفاظ بے معنی اور بے جان ہوجاتے ہیں۔شاہین لفظ ومعنی کے اسرار سے آشنا ہیں البتہ کہیں کہیں تسامح ہوا ہے مثلاً ''ہم ذہین اور مہذب تھے بچھڑتے ہوئے بھی'' میں ذہین کی جگہ شاید طنزاً ذی عقل وذی فہم کہنا مقصود ہے۔ بہ حیثیت مجموعی شاہین نے کفایتِ لفظی کو مدنظر رکھا اور اظہار کو ترتیبِ اظہار سے تقویت پہنچائی ہے۔ان کے الفاظ جذبے کے سیل سے تہہ نشین تو نہیں ہوتے اور تصور کی آگ سے پگھل تو نہیں جاتے لیکن جدید حسیت کی چمک ضرور رکھتے ہیں۔شاہین الفاظ پر گرفت کے معاملے میں زبان کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور اسی لیے ان کی شاعری میں جدید طرزِ احساس کے ساتھ روایت اظہار کے اہتمام نے بھی بعض خوبصورت پیکر تراشے ہیں جن کی زیبائی میں نئے اور پرانے خطوط کی آمیزش ملتی ہے۔ان کی نظم اور غزل دونوں شعری احساس سے لبریز ہیں چنانچہ بعض نظم کے ٹکڑوں میں غزلیت در آئی ہے مثلاً:

چاند ہر پانی میں چمکے، چاند ہر دریا کا غم
اور مری تقدیر شاید چاند کا بنجارہ پن

اجنبی شہر میں شیشے کے گھروں کے باہر
جھرمٹوں میں کوئی اپنا ہے گماں تک مشکل

اسی طرح ان کی غزل کے بعض اشعار تسلسلِ روایت کے ساتھ فن کے نئے روپ کا پتہ دیتے ہیں مثلاً:

اپنی آوازوں کے پیچھے بھاگتا تھا
وہ خود اپنی راہ کا پتھر بنا تھا

ہمارے بیچ سرابوں کا ایک رشتہ تھا
کہاں بچھڑ گئے صحرا میں ہم نظر میرے

جھوٹ چہرے پہ سجانے والے
کوئی آئینہ تو سچّا ہو گا

بھلی لگتی نہیں تکرار اتنی
بظاہر بے ضرر سچائیاں ہیں

شاہین نے بے نشان میں جن ''بے ضرر سچائیوں'' کو پیش کیا ہے، ان کی زد پس ماندہ اور ترقی یافتہ دونوں معاشروں پر پڑتی ہے۔ ان کی شاعری اپنے دور کی حسرتوں اور خوابوں کو جبرِ احساس کا آئینہ دکھاتی ہے۔ ان کے قدم زمین پر مضبوطی سے جمے ہوتے تو تصوراتِ قدر و اختیار کے امکانات بھی روشن ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ اس دور کی مجبوری ہے کہ اس نے دربدری کو انسانی تقدیر بنا دیا ہے۔ البتہ ان کی شاعری کی تہہ میں جو خیال کارفرما ہے وہ یہی ہے کہ ہم اپنے گردوپیش سے لاتعلق اور اجنبی نہیں رہ سکتے اور اسی خیال نے ان کے یہاں جو شاعرانہ بصیرت پیدا کی ہے اس میں گردوپیش کا مفہوم بھی وسیع ہوا ہے اور احساس کے نئے زاویے بھی بروئے کار آئے ہیں۔ ان کے شاعرانہ اظہار میں جو جدت ملتی ہے وہ عدم ابلاغ کا نام نہیں کیونکہ وہ تجربہ اور نافہمی میں فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کھینچ مت یوں کہ قبا ہی پھٹ جائے
لفظ مفہوم سے ننگا ہوگا

شاہین بے شعوری کے شعور اور غیر عقلی توضیحات کی صدائے بلند کو جدتِ فن نہیں جانتے اور نہ وہ بیان کے بعض نئے قالبوں، تصورِ معدومیت کے چند مجہول گوشوں، کچھ بے تسلسل آرائشوں اور ہجوم ہر زگی کو جدت کا نام دیتے ہیں۔ شاہین لفظ و معنی کی جدائی کو جدید نہیں ٹھہراتے بلکہ ان کی شاعرانہ جدت اندرون ذات کے منتشر ذرات کو ایک تخلیقی کشش کے تحت بیرونِ ذات کے مرکب قلزات سے متصل کرنے کی کوشش میں ظہور پاتی ہے اور اس کوششِ اتصال میں احساسات کی جو نئی ترمیم کی گئی ہے اسے نشانِ بے نشانی بلکہ اپنے عصر کی حسّی گواہی کہا جا سکتا ہے۔

..... ○ .....

شاہین کے نغموں، نوحوں اور خوابوں کا تعلق ارضِ بنگال سے ہے۔ ان کی امیجری میں آب و باراں اور سرسبزی و شادابی کی فراوانی اس حد تک منعکس ہوتی ہے کہ اگر وہ ڈھاکہ اور میگھنا کا واشگاف ذکر نہ کرتے تو بھی یہ قدرتی پس منظر از خود اپنا جغرافیائی حوالہ متعین کر دیتا۔ ان کے یہاں اسلوب و انداز کی جدیدیت اگر انہیں وحشت کلکتوی اور عندلیب شادانی سے علیحدہ کرتی ہے تو یہی جدیدیت صلاح الدین محمد اور محبوب خزاں سے ان کی معاصرت قائم کرتی ہے۔ ایک شدید شخصی اور اجتماعی حادثہ، سقوطِ ڈھاکہ شاہین کے شعور کی مرکزیت قائم کرتا ہے۔ دیناج پور سے گزرتی ہوئی ندی کنچن کے کنارے بربریت کے ہولناک ترین مظاہروں سے ابھرنے والی ایک نظم:

ہر طرف بکھری ہوئی ہیں آئینے کی کرچیاں
ایک ریزہ بھی جہاں ہے
آئینہ موجود ہے!
گھپ اندھیرا
اور زہریلی ہواؤں کی گھنی آبادیاں
شبنم جھونکو سے بچالے
اس دیئے کو
جو ابھی تک پُر فشاں ہے
تیرے دامن کے تلے!
سسکیاں کچھ اور بھی بے رحم ہوتی جا رہی ہیں
آ کہ ہم
ان آیتوں کی آج تفسیریں لکھیں
آگ جن کی دفن ہے
دریائے کنچن کے تلے

(آئینہ کنچن اور آیتیں)

اس نظم میں انسانی وجود کے لیے آئینے اور آیت کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے شاہین نے کارگہِ شیشہ گری اور تقدس کے انسلاکات کے ذریعے اپنے معانی کو وسعت دی ہے۔ بربریت اور بہیمیت اس نازک، حساس اور مقدس انسانی وجود کو نیست و نابود تو کر سکتی ہے لیکن انسانی جذبوں کی آگ کو ختم نہیں کر سکتی۔ وہ کسی وقت بھی زندہ ہو سکتی ہے، کی جا سکتی ہے۔ یہ کربناک شعور اور رجائیت شاہین کا امتیازی وصف ہے۔

خادم حسین صدیقی

''روح کی بے سمت راہیں''

محمد علی صدیقی

(●)

شاہین جدید اردو شاعری کے افق پر ان چند ناموں میں سے ہیں جن کے یہاں شعری محسوسات اور فکری رو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو پاتیں۔ ان کے محسوسات سے فکر اور فکر سے شاعری ٹپکتی ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی محور ''بے زمینی'' اور ''بے نشانی'' کا غم ہے۔ اُن کی شاعری میں ''بے نشانی'' کی حقیقت ایک فلسفیانہ قضیہ Category کے طور پر سامنے آتی ہے۔ شاہین کی پوری شاعری ''بے زمینی'' کے صبر آزما عذاب سے گذر کر کندن ہوگئی ہے۔ جس میں امید اور سرخوشی کے برگ و بار بھی لہلہاتے نظر آتے ہیں لیکن اُن کا بنیادی مزاج ایک ایسے حزن کے خمیر سے اٹھا ہے جو تمام تر ظاہری اور منطقی حوالوں کے باوجود اُن کے ذہن میں تصفیہ طلب ہے۔

شاہین کی شاعری ''بے نشانی'' کے بنیادی سوال کی تلاش کا نام ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں یہ احساس بے زمینی کروڑوں افراد کی زندگی میں کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ان حضرات میں سے اکثر و بیشتر بے زمینی کو وجودی فلسفہ کے اہم موضوع ''نیستی کی دہشت'' Dread of nothingness طرح ''بے زمینی'' کے ملال کو اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ یہ ملال مکان بلکہ محلوں کی موجودگی سے بھی دور نہیں ہوتا بلکہ اس ''گھر'' کی تلاش کا حرفِ آغاز بن جاتا ہے جو گلستان کو صحرا اور صحرا کو گلستان بنا چھوڑتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ شاہین جدید اردو شاعری میں اُن معنوں میں منفرد شاعر ہیں کہ انہوں نے ''ہجرت'' کے موضوع اور اُس سے ملحق احساساتِ محرومی کو جس طرح رقم کیا ہے وہ صرف ماضی میں مجہول انداز کی پناہ ڈھونڈنین کی کوشش نہیں ہے بلکہ اپنی نسل کے اندر اس بنیادی سوال کا جواب ڈھونڈنے کی سعی ہے کہ زندگی کیا ہے؟ اور اسے کس طرح بامعنی بنایا جاسکتا ہے۔ شاعری ویسے بھی مجہول کو معروف اور نامعلوم کو معلوم کے طور پر دیکھنے کا نام ہے جو کسی دوسرے ڈسپلن کے ذریعہ سمجھ میں تو آ سکتی ہے لیکن اپنی حیرتوں کی پہنائیوں سے تعارف کے لیے بذات خود ایک احساس تحیر کی طالب ہوتی ہے۔ آج جب کہ ہجرت کی حقیقت سے طلوع ہونے والے ''درد کے سورج'' کی شعائیں شرق اوسط، یورپ اور شمالی امریکہ تک پھیل چکی ہیں یہ سوال اور بھی اہم بن جاتا ہے کہ آخر انسان اپنی شناخت کے تہذیبی حوالوں سے بیزاری کی حد تک کیوں پیار کرتا ہے۔ اور اگر یہ پیار صرف پہلی نسل تک محدود ہے تو پھر دوسری اور تیسری نسل کو فرد مایہ کرنے میں کس رویہ کی عمل داری ہے۔ میزبان کلچر کی طاقت پر اعتماد یا اپنی تہذیبی روح سے شعوری مراجعت۔ ہر دو صورتوں میں تارکینِ وطن کا ذہن بڑی حد تک جن محرکات سے متاثر ہوتا ہے انہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ ہجرت اختیاری عمل ہو۔ شاہین کی شاعری میں تیسری ہجرت حالتِ جبر کا نوحہ ہے اور اس لیے وہ ان تارکینِ وطن میں سے نہیں ہیں جو ہجرت کو ''حرکت میں برکت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ شاہین کی شاعری میں ہجرت کا موضوع۔ نظم اور غزل ہر دو میں کچھ اس طرح آتا ہے کہ ہجرت کا احساس وجود فلسفہ کا ایک اور بنیادی قضیہ بن جاتا ہے۔ اور پھر مکانی اور ذہنی ہجرتوں کا فرق معدوم ہو جاتا ہے۔ وہ بلاشک وشبہ موخرالذکر معنوں میں ہجرتی ادب Exile Literature کے عالمی سلسلہ سے متاثر ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی زبان کو ایک نئی حیثیت سے مالا مال کیا ہے۔

شاہین ''قریہ جاں کی ایک نظم'' میں اس کیفیت کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

گھر سے نکلا تو کئی بار خیال آیا تھا
جستجو ہے تو پریشان نظری بھی ہوگی
ہر کھلی آنکھ میں رسوائیاں منڈلاتی ہیں!
باعث دربدری دیدہ دری بھی ہو گی
یہ مگر کون سی منزل ہے سفر میں ادب کے
پہلے اتنا تو نہ تھا دل میں خلا کا احساس
دن گذر جاتا ہے کچھ اور اندھیرے دے کر
ڈھل گئی رات تو پھر سیل بلا کا احساس
اجنبی شہر میں شیشے کے گھروں سے باہر
جھرمٹوں میں کوئی اپنا ہے گماں تک مشکل
درد بے خواب سی آنکھوں کا پرانا محرم
یوں ہے واماندۂ کہ اب آہ وفغاں تک مشکل

وہ ''بے نشاں'' میں اسی احساس بے زمینی کا کچھ اس طور احاطہ کرتے ہیں:

روح کی بے سمت راہیں
ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہونے کی یہ پیہم اذیت
گٹھریوں میں زندگی کا بوجھ
آتی جاتی سانسوں کا اثاثہ
ہر گھڑی موہوم سی اک شادمانی کی للک
نام کی تختی اتارو
پھر اُسے اک اجنبی دیوار پر لٹکاؤ
گھر چواُس تہ کو جو کبھی تھا۔
(کس سے میں پوچھوں
کہ میرا کیا پتہ ہے)

یہ عجیب بات ہے کہ شاہین وقت کے فریم ورک میں جس پتہ کو سب

سے نزدیک ترین قرار دے سکتے ہیں وہاں کی خونیں یادیں انہیں رہ رہ کر تڑپاتی ہیں۔ان کی شاعری ان روح فرسا منظروں سے درس معرفت طلب کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کا یہی وہ بنیادی منہاج ہے جو اچھی اور اعلیٰ شاعری کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔شاہین کی نظم ''سلسلے خواب کے'' ان روح فرسا مناظر میں سے ایک منظر آپ کے سامنے لاتی ہے۔

یہ جُرم ثابت ہے کہ ان سب نے اک خواب دیکھا تھا
پناہ گزینوں کے ایک کیمپ کا کتبہ
اپنے ماں جائے تھے
جن کے سر
اپنے نیزوں پر رکھ کر
قبیلے کے وحشی جواں رات بھر
رقص کرتے رہے۔
اور پھر خوں چشیدہ زبانوں سے
روحوں کے بے پیرہن
زخم کھائے ہوئے نیم جاں جسم کو چاٹ کر
موم رس کی نشیلی گپھاؤں میں
روپوش ہوتے گئے۔۔۔

شاہین ''بے زمینی'' اور ''بے نشانی'' کی کیفیات کس کس مظہر اور کس کس جگہ تلاش کرتے ہیں یہ عمل بذاتِ خود بڑا اہم اور دلچسپ ہے۔

''شارویلی کی قبر کا کتبہ'' ہر لحاظ سے ایک کامیاب نظم ہے۔لیکن اپنی مٹی سے تعلق پر اصرار نے اس نظم کے ہیرو کی فتح اور سرخوشی کو بھی ہمارے شاعر کے لیے یاس وحزن میں مبتلا کر دیا ہے۔

کون تھا اس کا مقابل دہر میں
پاؤں مٹی پر جمائے
وہ سپہ سالار کی صورت کھڑا تھا
پھر کوئی مصلحت للکار
لے آئی اُسے
اک خوشنما قالین پر
دیکھنے والوں نے دیکھا
چند لمحوں وہ مردہ پڑا تھا
شارویلی اب اگر جاگے
تو اپنی قبر کا کتبہ پڑھے
علم ودانش
شعر وحکمت
فن حرب
اپنی مٹی سے الگ سب واہمہ
سب واہمہ

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اشعار بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔

تم تو وطن میں رہ کر بھی کہلائے اجنبی
اس اجنبی دیار میں کیوں آئے اجنبی

یا

اس خزاں کی خنک اور سیہ رات میں
خواب تک چھن گئے بے کسی ہے یہی!

الغرض شاہین کی شاعری جگہ جگہ اس دور کے مابعد الطبیعیاتی تناقص کی تفہیم اور اس سے ایک راہ نکالنے کی کوشش سے عبارت ہے۔

''دُوج کا چاند'' اس تناقص کی تہہ میں اتر جانے کی گرانقدر سعی ہے۔اس نظم میں فن اور فکر کچھ اس صورت سے شیر وشکر ہوئے ہیں کہ خود شاعری اپنے شاعر کی رہنما فکر کا تعارف بن جاتی ہے۔

رات ڈھل جائے تو کچھ اور جنوں خیز ہوئے
رنگ ڈوب کے نکھرے ہر شے
دوڑتا جائے سمے
شہر در شہر دل ودیدہ کے دشمن بھی بہت
سحر واعجاز کے مسکن بھی بہت
اور الجھن بھی بہت
چہرہ ولب پہ ہوس رنگ شفق دیکھو تو
دوج کا چاند ہے شق دیکھو تو
سوئے افق دیکھو تو۔

''دوج کا چاند'' کی سطر ''سوئے افق دیکھو تو'' شاہین کی شعری فکر کا کلیدی نکتا ہے۔یہی نکتہ نظم ''ویت نام'' میں ایک وسیع تر آفاقی تناظر عطا کرتا ہے اور ''مشرق وسطیٰ'' جیسی نظم میں معجزوں کی خواہش پر برہمی کا اظہار لیے ملتا ہے۔

اور اس طرح وہ اُن شعراء کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں جو شکست وریخت کی روح فرسا صورت حال میں بھی معجزوں کی توقع میں زندہ رہنا نہیں چاہتے۔

شاہین کی شاعری کی سب سے بڑی انفرادیت ہی یہ ہے کہ وہ باہمی متغاض اور متضاد نظریات کے ٹکراؤ سے ایک ایسی صداقت تلاش کرنا چاہتے ہیں جو عقل اور وجدان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا نہیں چاہتی وہ اس عہد کے سب سے بڑے تناقص کی گرہیں کھولنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انسان صرف ملال وحزن کی کیفیات میں زندہ نہیں رہ سکتا۔زندگی ہمہ دم آگے بڑھنے کا نام ہے۔

شعر میرے ہیں مٹی میں گوندھے ہوئے
یہ جو خوشبو سی ہے شاعری ہے یہی

ڈھل جائے گی یہ شام غم دل کو غزل کر
اے کشتۂ آلام غم دل کو غزل کر
ہر وہم نتیجہ ہے فسردہ نظری کا
زندانی اوہام غم دل کو غزل کر
دلدادۂ منزل کو خبر ہے کہ تھکن کا
منزل بھی ہے اک نام غم دل کو غزل کر

یہ وہ موڑ ہے جہاں وہ ''غزل'' کو زندگی کی سرشاری کے معنوں میں لیتے ہیں۔اُن کے یہاں ''غزل'' زندگی ہے جبکہ ''نظم'' ایک بے رحم تجزیہ۔ان دو کیفیات اور ہستیوں کے درمیان زندگی بڑی حیران کن حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔شاہین کی شاعری میں ''ویرانی'' بھی معرفت کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔

ویران تو ہو چکی ہے بستی
دیواروں پر عرضِ حال کیا ہے

لیکن اس کے بعد ہی وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

اپنے سے بھی اب نباہ کر لوں
شاہین ترا خیال کیا ہے

شاہین کی شاعری خیال انگیز استعاروں سے بھری ہوئی کشت بہار کا نوحہ ہے جو سرد اور سیاہ رات کو کچھ اور بھی زیادہ پُر ہول بنا دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُن کے یہاں انسانی مقدر پر وہ اعتماد و ایقان ہے کہ جو موجب حیرت بھی ہے اور موجب اطمینان بھی۔شاہین کی شاعری ایک کنایہ ہے۔وہ اس کنایہ کے ذریعے ''جلاوطن ادب'' سے المناک تضاد پر قابو پانا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاہین کی شاعری میں بے پناہ تنوع ہے۔ان کے یہاں زندگی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے۔

ان کے یہاں ہجرت صرف مکانی Space مظہر نہیں ہے بلکہ اس کے تعاقب میں نفسی اور عقلی جہتوں کی ایک ایسی مرقع نگاری ہے جو اس عہد کے غیر انسانی نظام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے المیوں کی گرہ کشائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ شاہین اپنی عمر کی پانچ دہائیوں کے اندر اندر تین ہجرتوں کا عذاب جھیل چکے ہیں۔ ہندوستان سے مشرقی پاکستان اور پھر بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پاکستان اور یہاں سے کناڈا۔یہ ہجرت در ہجرت کا ایک ایسا عذاب ہے جس نے مذہب اور علاقائیت کو ایک دوسرے کے ہاتھوں لہولہان ہوتے دیکھا اب وہ کناڈا کی دھنک رنگ مغربی تہذیب میں سانس لے رہے ہیں۔لیکن اس طرح کہ اپنے آپ سے اور اپنی تہذیبی روح سے شرمندہ۔ یہ وہ صورت حال ہے کہ جس کے زیر اثر وہ بڑی آسانی سے لایعنی اور خیر منطقی رویوں کے شکار ہو سکتے تھے۔لیکن انہیں اپنی قوت ارادی پر اس درجہ یقین ہے کہ وہ ناقابلِ برداشت سچوایشن میں بھی کبھی ''فطرت'' اور کبھی انسان دوستی کے نام پر تناقضات سے پاک ماحول میں رہنے کی آرزو کرتے ہیں لیکن

؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

شاہین کی شاعری نے اردو زبان کی شعری لغت میں نئے تجربات کی بدولت نئی تمثالیں اور نت نئے شعری رویے رقم کیے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں جس ''شمال'' کو آباد کیا ہے وہ اس شمال سے قطعاً مختلف ہے۔جو ہماری روایتی شاعری میں استعارا در آتا ہے لیکن شاہین کا شمال ترقی یافتہ دنیا سے عبارت ہے۔ اور اس ترقی یافتہ سماج کی میکانکی زندگی کے خلاف ایک احتجاج بھی انہوں نے ہجرت کی پوری پوری قیمت ادا کی ہے۔لیکن اپنی زبان کو ہجرت کے ایک ایسے نئے مفہوم سے متعارف کروایا ہے جس کے سامنے ۱۹۴۷ء اور ۷۲۔۱۹۷۱ء کی ہجرتیں ماند تو نہیں پڑتیں البتہ ورطۂ حیرت میں ضرور مبتلا ہو جاتی ہیں۔

شاہین کی شاعری حیرتوں کے بڑے دائروں کے درمیان جہد البقا کی ایک ایسی کاوش سے عبارت ہے جس کے ذریعہ ایک فنکار کے تجربات سے ہم سب کے تجربات بن جاتے ہیں۔

شاہین کے نزدیک جدید شعری رجحانات بھی پوری طرح حقیقت کا احاطہ نہیں کرتے وہی مثل ہے کہ جس کے ہاتھ ہاتھی کی دم آ گئی ہے وہ اسی کو ہاتھی سمجھ رہا ہے کوئی خاص رجحان ادب کی مکمل نمائندگی نہیں کر سکتا اور کسی ایک رجحان کا غالب آ جانا ادب کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔شاہین آزاد خیال کے قائل ہیں اور تجربے کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں۔خود انہوں نے بھی ہیئت کے تجربے کئے ہیں اور بعض نظمیں ایسے اسالیب میں کہی ہیں جو غالباً اس سے پہلے اُردو میں رائج نہیں تھے۔مثال کے طور پر ایک اطالوی صنف سخن ہے TERZA RIMA اس کی خصوصیت مصرعوں (LINES) کی ایک خاص نشست و برخاست ہے، نظم عموماً ۱۹ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔شاہین نے اس صنف کو اُردو دایا ہے اور کئی نظمیں اس طرز پر لکھی ہیں شاید انہیں خصوصیات کے سبب ۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والی گرین اسنو کی کتاب An Anthology of Canadian Poets of Asian Origin میں جن شعراء کو شامل کیا گیا ہے ان میں شاہین واحد پاکستانی شاعر ہیں اس مجموعے میں جن کی چھ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔

شبنم رومانی

''زخم جتنے آشنائی کے لگے''

منظر علی خان

(●)

آپ نے اپنی زندگی میں بہت سی بے قاعدہ اور باقاعدہ چیزیں دیکھی ہوں گی لیکن آپ کی نگاہوں سے کوئی بے قاعدہ شاعر بھی گزرا ہے کہ نہیں۔۔۔ مجھے نہیں معلوم! مجھے آپ کے حسن نظر پہ بھروسا ہے اسی لیے میں آج آپ کے سامنے ایک باقاعدہ شاعر کو لے کر حاضر ہوا ہوں۔ شاعری کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی ان کے یہاں باقاعدگی ہے لیکن اس کا اعلان انہوں نے تاحال نہیں کیا۔۔۔ میں آپ کی ملاقات آج جناب ولی عالم شاہین سے کرانا چاہتا ہوں جواب سے پہلے شاہین غازی پوری کہلاتے تھے۔ غازی پوری کی رعایت ضلع مونگیر بہار کا ایک بڑا گاؤں غازی پور ہے جسے جناب شاہین کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ویسے اس گاؤں میں گنا بہت اُگتا ہے جس سے گڑ بنایا جاتا ہے۔ ہم آپ سے گنے اور گڑ کی بات بھی کریں گے پر صورت حال یہ ہے کہ کراچی آنے کے بعد جناب شاہین جب نخالص غازی پوریوں سے ملے تو خود کو شاہین تک محدود کرلیا، سنا ہے اب صرف ولی عالم یا ولی ہو جانے پر غور کررہے ہیں۔ وجہ اس کی کچھ تو عالم آب وگل کی بے ثباتی بتائی جاتی ہے اور کچھ شاہین کا کثرت استعمال۔۔۔ یہاں ذکر ابھی اس شاہین کا ہے جو برادرم اجمل شاہین کی تحویل میں ہے۔ بات باقاعدہ شاعری کی ہورہی ہے جو جناب شاہین نے ۱۹۵۵ء سے شروع کی اور ماشاءاللہ اب تک تمام قاعدے اور قوانین کی پابند ہے۔ ہماری اس اطلاع کا ماخذ شاہین صاحب کا بائیوڈیٹا (Bio Data) ہے جو ان کے دوسرے شعری مجموعے ''بے نشان'' کے بیک ٹائٹل پر مرقوم ہے۔ آپ کے لیے میرے پاس برادرم شاہین سے متعلق اور بھی بہت سی اطلاعات ہیں جن کا اندراج ان کے بائیوڈیٹا میں نہیں۔ اس طرح کی اطلاعات کوئی بھی اپنے بائیوڈیٹا میں شامل نہیں کرتا۔ حالانکہ یہی وہ اطلاعات ہوتی ہیں جن سے ''عوام الناس'' کو دلچسپی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جناب شاہین نے جتنی ڈگریاں حاصل کیں اور کہاں کہاں سے کیں۔۔۔ یا وہ کن درسگاہوں میں لیکچر دیتے یا لیتے رہے۔۔۔ اس طرح کی تمام معلومات کتاب کے بیک ٹائٹل پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ ہاں صاحب کتاب کی بیک پر جاننے والے جن معلومات کے خزانے لٹاتے ہیں چٹخارہ اصل میں اسی میں ہوتا ہے۔ اس طرح کی معلومات کا دریا بہانے کے لیے آپ کا رازداں یا جاننے والا ہونا بھی اتنا ضروری نہیں ہاں زبان بڑی رواں ہونی چاہیے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں اہل زباں ہی نہیں، روانی تو بعد کی بات ہے پھر بھی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارا اور جناب شاہین کا سال پیدائش ایک ہے۔ شاید مہینہ اور دن بھی ایک ہو مگر ابھی ذکر سال پیدائش کا ہے جو گذشتہ دنوں شہر کراچی میں خاصا اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ مشکل ہم دونوں کی یہ ہے کہ ہمارے سال پیدائش میں تھوڑی سی بھی Flaxibility نہیں کہ موقع کی مناسبت سے ۱۹۳۸ء کو ۱۹۴۸ء تک پہنچا دیا جائے یا موقعا گر دوسرا ہو اور صورت حال کا تقاضا ہو کہ بزرگی پر ضعف طاری کیا جائے تو سال پیدائش کو پیچھے ۱۹۲۸ء تک لیجانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں بلکہ منافع اور شہرت کی شہرت ہے۔ پیسہ تو آنی جانی شئے ہے پر ''نشانِ سپاس'' تو کہیں جا نہیں سکتا!

سال پیدائش ایک ہونے کے باوجود میں برادرم ولی عالم شاہین کو ہمیشہ خود سے آٹھ دس سال بڑا سمجھتا ہوں اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ یہ بڑی اور باقاعدہ شاعری کرتے ہیں۔ یہ وجہ بھی نہیں کہ دیکھنے میں خدانخواستہ بجائے پچاس کے اکہتر سال کے نظر آتے ہیں جس کی آج کل ڈیمانڈ ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ انہیں نوجوانی کا کھلنڈراپن کبھی بھی مرغوب نہیں رہا۔ شاید اسی لیے کلاس میں مانیٹری ہمیشہ انہی کے حصہ میں آئی۔ جب سے انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی ہے مشاعرے میں مسند صدارت پر خواہ کوئی بھی شخصیت جلوہ افروز ہو صاحب صدر جناب شاہین ہی نظر آتے ہیں۔ یہ جو انہوں نے باقاعدہ شاعری کا سال ۱۹۵۵ء لکھا ہے یہ وہی سال تو ہے جب سے جناب شاہین بجائے شاعر کے صاحب صدر نظر آنے لگے ہیں۔ جب سے انہوں نے مشاعروں میں انداز صدارت اختیار کیا ہے اس انداز سے آپ بھی آگاہ ہیں میرا مطلب دوران مشاعرہ صدر کا ابتدا سے انتہا تک خاموشی اختیار کیے رکھنا، ہر برے بھلے شعر پر سر کی جنبش اور معلن کی ہیرا پھیری پر ایک نگاہ غلط انداز اور بس۔۔۔ ہاں پان کی گلوری عام صدور کی طرح جناب شاہین کو مرغوب نہیں رہی، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جناب شاہین کا ایک منفرد انداز ہمیشہ سے ہے اور اس مزاج میں عمر کی اس منزل پر کسی تبدیلی کے امکانات نہیں۔۔۔!

میں نے جناب شاہین کو پابندی سے اسکول، پھر کالج پھر ہونے والی سسرال اور پھر ہو جانے والی سسرال جاتے دیکھا ہے۔ تبدیلی درجات وسوغات اپنی جگہ شاہین صاحب کے انداز آمد ورفت میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سسرال سے واپسی عام حالات میں سر جھکا کر نہیں ہوتی یا نہیں ہونی چاہیے لیکن شاہین صاحب اپنی عادت کا کیا کریں، وہ اسکول میں بھی مانیٹر تھے اور سسرال میں بھی دامادی سے زیادہ مانیٹری ان کے حصہ میں آتی لیکن وہ جو لوہا لوہے کو کاٹتا ہے سو یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ اب ''مانیٹرنگ'' سے لے کر ''منی ٹرنگ'' تک ان کی بیگم صاحبہ محترمہ روشن آراء کے دائرہ اختیار میں ہے اور خوب ہے۔۔۔!

ہاں تو بات باقاعدہ شاعر کی ہورہی ہے جس کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دو ہونے کے لیے پر تول رہے ہیں اور کئی ایک کے ابھی پر نہیں نکلے پر نکلیں گے ضرور۔ ہم اپنی بات آگے بڑھانے کے لیے پہلے جناب شاہین

کے دوسرے شعری مجموعے ''بے نشاں'' کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ ہمیں بچپن میں پڑھایا گیا تھا کہ:

آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

تو نام کے متعلق جیسا کہ آپ جانتے ہیں وطن عزیز کی اکثر دیواروں پر ہمارے نام کے ساتھ جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے کہ ''ناکھپن'' یا شاید ''کھپن'' بہرحال نام کی حد تک تو واقعی ہمیں مٹانا مشکل ہے۔ ہم میں برادرم شاہین بھی شامل ہیں۔ رہا نشان تو اس کا بے نشاں رہنا کچھ ایسا باعث تردد نہیں ہونا چاہیے۔ بچپن ہی میں ہم نے یہ بھی پڑھا تھا کہ ''مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے'' تو ظاہر ہے کہ اگر نامیوں کے نشاں مٹ سکتے ہیں بلکہ مٹ چکے ہیں تو ہم بے نامیوں کے نشان اگر دھندلانے لگے ہیں تو افسوس کیوں ہو! بہرطور بات ہو رہی ہے ''بے نشاں'' کی جس کا انتساب کچھ یوں ہے:

''آنے والا کل ہی دے شاید جواب
نام سے کس کے کروں میں انتساب
اپنے نغمے، اپنے نوحے، اپنے خواب''

شاہین صاحب کی مشکل ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی شہر کراچی میں ایسے ایسے عالی ظرف وعالی دماغ لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنی صرف ایک چیز یعنی ''افسانے'' کو نصف درجن اعزاء واقارب کے نام معنون کر دیا، حیرت ہے شاہین صاحب کو تین تین چیزوں کے لیے میرا مطلب نغمے، نوحے اور خواب سے ہے کوئی فرد واحد نہیں ملتا۔۔۔ اگر وہ بہتر سمجھیں تو برادرم امراؤ طارق، حال جوائنٹ سیکرٹری انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ڈویژن سے مشورہ کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی تازہ تصنیف ''دھنک'' کے باقی ماندہ رنگ کا انتساب اپنے والدین کے نام کرتے وقت اپنے چھوٹے ماموں کو بھی یاد رکھا ہے۔ بڑے ماموں کو وہ کیوں بھول گئے تمام شہر پریشان ہے۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ یہ مسئلہ امراؤ بھائی کی برادری والے خوش اسلوبی سے سلجھائیں گے۔

جناب شاہین کی صورت گری کچھ مشکل نہیں۔ مناسب قد وقامت کے ایک تقریباً خوبصورت جوان ہیں۔۔۔ آنکھوں پر عینک ہو تو یونیورسٹی کے پروفیسر نظر آتے ہیں اور چشمہ نہ ہو تو اسی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے ان کی خوبصورتی کے ساتھ تقریباً کا لاحقہ بے وجہ نہیں لگایا۔ انہوں نے بھی اپنی شاعری میں کسی عورت یا مرد یا لڑکی یا لڑکے کے حسن کی تعریف دل کھول کر نہیں کی۔ سو میں نے بھی، بہتر جانا کہ ایک ذرا ڈنڈی میں بھی ماروں۔ ویسے صنف نازک کے حسن کی تعریف شاہین کو مطلوب تو رہی ہے پر اظہار کے لیے انہیں مطلوبہ الفاظ اور الفاظ کی ادائیگی کے لیے ''لئے'' نہیں ملی۔ وہ خود کہتے ہیں:۔

''میری نظموں کا اختصار آہوں اور کراہوں کا اختصار ہے۔ عہد رواں میں کہ اس جنس کی ارزانی ہے میں اپنی آواز کے گم نہ ہونے کی ضمانت کس سے مانگوں؟ لیکن کیا یہ ضمانت ضروری ہے؟''

میرے خیال میں پاکستان کی حد تک ہر طرح کی ضمانت ضروری ہے جس میں ضمانت قبل از گرفتاری بھی شامل ہے۔ اس خصوصی ضمانت کی بات میں نے اس لیے بھی بتا دی ہے کہ شاہین صاحب سیاست سے انکار بھی کرتے ہیں اور اقرار بھی بلکہ جس انداز میں اقرار کرتے ہیں وہاں متذکرہ ضمانت اشد ضروری ہے۔ آپ ان کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''سیاست میری کمزوری ہے نہ قوت لیکن جس طرح چکی کے پاٹ کے بیچ سے گیہوں کے دانے کا ثابت وسالم بچ نکلنا امر محال ہے اسی طرح ایک عام آدمی کی زندگی نہ چاہتے ہوئے بھی سیاست کی زد میں آئے بغیر نہیں رہتی اور سیاست پر مبنی فیصلہ جتنی بلندی پر طے ہو فیصلے کا پتھر اتنی ہی قوت کے ساتھ نیچے گرتا ہے۔۔۔ چوٹ کھانے والے اپنی چوٹ کی نوعیت اور قوت برداشت کے اعتبار سے چیختے ہیں اور چلاتے ہیں اور گاہے بگاہے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔'' (''بے نشان'' کے ابتدائیہ سے اقتباس)

یہ مرنے مارنے سے دلچسپی ہو یا وہ حالات جن سے جناب شاہین گزرے ہیں کہ ان کے قریب رہ کر اور ان کے اشعار سن کر ہمیں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اپنا لباس غور سے دیکھیں کہ کہاں کہاں خون کے چھینٹے پڑے ہیں اور ہم کہاں کہاں سے زخمی ہیں، ان کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

اس قدر عام ہوئی شہر میں خون پیرہنی
نظر آتے نہیں بے داغ لبادے اب تو

یا

زخم جتنے آشنائی کے لگے بھرتے تو کیا
ہاں مگر کچھ دھیان دنیا کے غموں میں بٹ گیا

ہم بھی اپنا دھیان جناب شاہین کے پیراہن سے ہٹاتے ہیں لیکن افسوس ہے یہ یہاں سے ہٹے گی تو پھر ایک کتبے پر جا کر اٹک جائے گی۔ شاہین کی شاعری میں ویسے کتبوں، قبروں، گورکنوں اور کفن وکافور کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اور ایسا کچھ ہے کہ کیا کہیے اور کیا سنئے! لیکن ہم کہ کراچی میں رہتے ہیں جسے اب شہر شہدا کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس شہر میں موجودہ ڈھائی درجن سے زائد سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیوں کے پاس کچھ نہیں تو دو یا ڈھائی سو شہداء فی پارٹی کے حساب سے موجود ہیں ایسے میں میرے لیے کفن اور گورکن بلکہ سخی حسن سے آگے دیکھنا مشکل ہے۔

میں اپنا دیکھنا فی الحال ملتوی رکھتا ہوں، آپ ایسے میں شاہین کی نظم کتبہ سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''یہ جنازہ ہمارا ہے''
پھر ماتا سے بھری ایک بوڑھی کھنکتی صدا گونج اٹھتی
''یہ میرا لہو ہے''
کوئی بنت مہتاب بولی
یہی میری کرنوں کی قوت ہے

اور پاس ہی ایک چہکتے لہو نے بتایا
یہ لاشہ بشارت ہے ان موسموں کی
جو آئے نہیں ہیں
مگر جن کی خوشبو کی آہٹ قریب آ چکی ہے
لہو سے ہمارا ہے رشتہ وہی جو ازل سے ابد کا
ہماری چہکتی نگہدار آنکھیں ہیں کتبہ لحد کا''

مرحوم مشرقی پاکستان جس کے متعلق موجودہ نئے پاکستان کے لوگوں میں ایک عام تاثر یہ تھا کہ وہاں عندلیب شادانی اور مولانا تمنا عمادی کے علاوہ شاید افسر ماہ پوری اور ڈاکٹر حنیف فوق تھوڑی بہت اردو جانتے ہوں تو جانتے ہوں ورنہ پورا بنگال قاضی نذر الاسلام کی بنگلہ زبان بولتا تھا۔ اسی مشرقی پاکستان میں ایک مشاعرے کے لیے اقبال کی غزل سے طرح دی گئی کہ ''مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن'' اس مشاعرے میں جناب شاہین نے بڑی خوبصورت اور مرصع غزل پڑھی لیکن حسب دستور وہیں پہنچے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا۔ آپ ان کا شعر سماعت فرمایئے:

میری بربادی کے ہمسایوں میں چرچے خوب ہیں
جیسے میت کی خبر سنتے ہی خوش ہو گورکن

جہاں تک مجھے یاد ہے اس شعر پر شادانی صاحب نے جو اس مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے دل کھول کر داد دی۔ ان کے ساتھ ساتھ ہال کے کونے کونے سے داد و تحسین کی مسلسل آوازیں آتی رہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ شاہین صاحب نے صرف زندگی کے المناک پہلوؤں ہی کو اجاگر کیا ہے بلکہ دوسرے پہلوؤں تک بھی ان کی نگاہ پہنچی ہے۔ مگر ہم وہاں اپنا ہاتھ پہنچاتے ایک ذرا ہچکچا رہے ہیں۔ چلیے تھوڑی سی ہیرا پھیری کر لیتے ہیں۔۔۔ شاہین صاحب کی نظم ''یہی زندگی ہے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''میرے سامنے ایک لڑکی
تبسم بہ لب
فون پر اپنی سرگوشیاں ثبت کرتے ہوئے
چور آنکھوں سے چاروں طرف
دیکھتی ہے
عجب کشمکش ہے
عجب دلکشی ہے
ادھر ذہن میں پھول سے کھل گئے
اور ادھر برف سی جم گئی
یہی زندگی ہے
ہوا اونگھتی ہے''

آپ نے غور کیا! فون پر سرگوشیاں ہوئیں، سرگوشیوں کے نتیجے میں جانے کہاں کشمکش ہوئی تب دلکشی نظر آئی اور جنہیں نظر آئی ان کے اذہان میں پھول کھلے۔۔۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد میں نے خیال کیا اور شاید آپ نے بھی خیال کیا ہو کہ پھول کے بعد اب پھل لگنے کی باری آئے گی۔۔۔ لیکن واہیات۔۔۔ مقدر کی خرابی سے اور برف سی جم گئی اور جانے کب تک جمی رہے گی۔

شاہین صاحب کے ذکر میں حرارت بھرنے کے لیے چنگاری سے لے کر دہکتے شعلے ہر چند کہ انہی کی شاعری میں موجود ہیں۔ لیکن ہم یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے بزرگ دوست پروفیسر نظیر صدیقی کے ارشادات عالیہ سے اس ضمن میں استفادہ کیا جائے جنہوں نے از راہ دوست نوازی شاہین صاحب کے پہلے شعری مجموعے ''رگ ساز'' کا دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔ شاہین کی شاعری کے بارے میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''شاہین کی شاعری میں اچھوتے موضوع، اچھوتے خیال اور اچھوتے احساس کی کمی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اچھوتے پن کی تلاش میں سر کے بل کھڑے ہونے کے قائل نہیں۔''

شاہین کے بارے میں ہمیں یہ جان کر بڑا افسوس ہوا کہ وہ سر کے بل کھڑے نہیں ہوئے حالانکہ جیسے اچھوتے خیالات، اچھوتے موضوعات اور اچھوتے احساسات ان کے یہاں موجود ہیں ان کا حصول پاؤں کے بل کھڑے ہو کر ممکن نہیں۔ قبل اس کے کہ میں شاہین صاحب کے موضوعات، احساسات اور خیالات کی چھان پھٹک کروں کہ یہ کس طرح کھڑے ہونے سے ذہن پر وارد ہوئے ہم پہلے ''اچھوتے'' کے تواتر سے لطف اندوز ہونا بہتر خیال کرتے ہیں۔ اس تواتر سے لطف اندوزی میں ایک ذرا اشتابی اس لیے بھی ہے کہ ''اچھوتے'' سے ''چھوتے'' ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور جو کہیں معاملہ اچھوتی کا ہو تو پھر پلک جھپکنے کی بات سمجھئے اور معاملہ نظیر صدیقی کا ہو تو اس طرح کی احتیاط لازمی ٹھہرتی ہے، وہ کسی بھی شخصیت پر قلم اٹھاتے وقت ''چھوت چھات'' کا فیصلہ پہلے کر لیتے ہیں۔ نظیر صدیقی تو دیباچہ لکھ کر فارغ ہوئے اب ہم ہیں اور آشنائی اور ناآشنائی کے دائرے جسے شاہین نے تخلیق کیا ہے۔ ہم اس دائرے میں آپ کو لے چلیں گے لیکن پہلے آپ شاہین کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

ایک ناآشنا پہ مرتے ہیں
ہم بھی کیا کاروبار کرتے ہیں

ناآشنائی کے بعد اب آشنا کا شعر سنئے:

یہ کیا کہ آئے گئے ایک کج ادا کی طرح
ملو کبھی تو ملو ہم سے آشنا کی طرح

سوال یہ ہے کہ حضرت شاہین جب ناآشنا پہ مرتے ہیں تو انہیں آشنا کی تلاش کیوں ہے؟ کاروبار تو ان کا چل ہی رہا ہے ورنہ یہ کب کا رک گیا ہوتا۔ قلم کی روانی بجا لیکن اضمحلال تو کہیں نہ کہیں محسوس ضرور ہوگا۔ لیکن جب بات کام دیو کی آ جائے تو خواہ مخواہ بھی بدن میں کسمساہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ ہم اپنی

احساس کو ابھی کنارے رکھتے ہیں آپ پہلے شاہین کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہر طرف نور کا جال ہی جال ہے
رنگ آہنگ ہے اور کنول تال ہے

بھیگی دھرتی بدن کو سمیٹے ہوئے
ایک خوشبو کی چادر لپیٹے ہوئے

آج کلیوں کے لب پر ہے رنگیں غزل
سوچتی بھی نہیں ہوں گی بدنام کل

آج تڑپیں گے دل بات کی بات میں
کام نے لے لیا ہے دھنش ہات میں

کام دیو کے ہاتھ میں دھنش ہو یا کچھ اور ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ شاہین کے معاملے میں ''اور ادھر برف سی جم گئی ہے'' پر معاملہ ختم ہوتا ہے۔ سیر دو سیر برف ہو تو پگھلا بھی لی جائے۔ بات تو پورے شہر آٹوا (Ottawa) کی ہے۔ اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ہم برادرم شاہین کا ایک خوبصورت شعر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس لیے بھی کہ بات ابھی کام دیو کی ہوئی ہے جو اس شعر سے لگا تو نہیں کھاتی مگر شبہ ضرور پیدا کرتی ہے، شاہین کہتے ہیں:

بدن اک سبق تھا حیات کا جسے سیکھ کر میں گزر گیا
کئی اور ایسے مقام تھے کہ سراغ جن کا لگا ئیے

حضرت شاہین تو سبق سیکھ کر اور مشاعرے لوٹ کر کراچی سے کینیڈا چلے گئے اور ہماری ڈیوٹی ان مقامات کا سراغ لگانے پر لگا گئے ہیں جن سے کیا کچھ ملے گا ابھی تحقیق طلب ہے۔ رہا بدن کا سوال تو اسے جناب شاہین سیکھ چکے اور گمان غالب ہے کہ ابھی یہ سبق بھولے نہیں۔ اللہ ان کا حافظہ برقرار رکھے۔ آمین۔

''سرفروشی کی تمنا''

اردو شاعری ہو یا نثر، ظرافت ہو یا خطابت، تنقید ہو یا تحقیق، ڈرامہ ہو یا رپورتاژ ہر محاذ پر غیر مسلم دانشوروں کی خدمات اردو زبان و ادب کو حاصل رہی ہیں۔ حصول آزادی میں بھی اردو نے اہم رول ادا کیا۔ جناب رام پرساد بسمل نے اردو کے چمن کی آبیاری میں اپنا خونِ دل صرف کیا۔ انقلابی شاعر رام پرساد بسمل 11 جون 1897 کو (شاہجہاں پور) اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ وہ بھارت کے عظیم انقلابی اور معروف مجاہد آزادی تو تھے ہی، اعلیٰ معیار کے شاعر، مترجم، ماہر السنہ، مورخ اور ادیب بھی تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنی جان کی قربانی دے دی۔ ''بسمل'' ان کا اردو تخلص تھا۔ بسمل کے علاوہ وہ ''رام'' اور نامعلوم کے نام سے بھی مضمون اور کلام لکھتے تھے۔ انہوں نے 19 سال کی عمر میں انقلابی راستے پر قدم رکھا اور 30 سال کی عمر میں پھانسی چڑھ گئے۔ 11 سال کی انقلابی زندگی میں انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور خود ہی انہیں شائع کیا۔ ان کتابوں کو فروخت کر کے جو رقم ملی اس سے انہوں نے ہتھیار خریدے اور ان ہتھیاروں کا استعمال برطانوی راج کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے کیا۔ ان کی کل 11 کتابیں شائع ہوئیں۔ رام پرساد بسمل کی سدا بہار تخلیق ''سرفروشی کی تمنا'' ہے۔ رام پرساد جی کو 30 سال کی عمر میں 19 دسمبر 1927 کو پھانسی دے دی گئی۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
کیوں نہیں کرتا ہے کوئی دوسرا کچھ بات چیت — دیکھتا ہوں میں جسے وہ چپ تیری محفل میں ہے
اے شہید ملک و ملت میں ترے اوپر نثار — اب تیری ہمت کا چرچہ غیر کی محفل میں ہے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

جاری ہے----

○

''اُمّ القریٰ''

(شاہین کا نظمیہ آہنگ)

عطیہ سکندر علی

(سکھر)

یاسیّدِ اُمّ القریٰ

(بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر)

کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعد از خدا
یاسیدِ ام القریٰ

ناظر، نظارہ اور نظر
ہر ایک اپنے اوج پر
بامِ ثریا سے پرے
کس والہانہ شوق سے
منزل تھی تیری منتظر
ایسی کشش! ایسا سفر!
اے عارفِ غارِ حرا...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعد از خدا
یاسیدِ ام القریٰ

تو رحمت اللعالمیں
تو قاطعِ تشکیک و ظن
نوعِ بشر کا بانکپن
وہ تیری چپ ہو یا سخن
تیرا پیامِ جاوداں
یہ احترامِ جان و تن
ہر قول لاثانی ترا...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعد از خدا
یاسیدِ ام القریٰ

حد سے بڑی میری انا
ہر سانس میری اک خطا
میرے گنہ بے انتہا
حالات جب بھی سخت تھے
کوئی نہ تھا جب آسرا
دیوانہ میں ہشیار میں
تیرے ہی در پر آ گرا...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعد از خدا
یاسیدِ ام القریٰ

اقرا سے تیری ابتدا
اور تو مدینہ علم کا
اک آرزو بس اک دعا
روشن رکھے میرا دیا
تیرے مدینے کی ہوا
اُمی لقب، خیر الوریٰ...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعد از خدا
یاسیدِ ام القریٰ

○

ہم پچھلی صدی کے لوگ

ہم پچھلی صدی کے لوگ
پرانے ہیں
اپنے پُرکھوں سے بھی پرانے ہیں
کچھ اپنے تاج محل میں دفن ہیں، خوش ہیں
پیروں کو پھیلائے سوتے ہیں
سب کی نیندیں حرام کئے اپنے ہر سپنے میں سکھ بوتے ہیں
کچھ آج بھی، صدیاں بیت گئیں،
یوں ہی بے ٹھور ٹھکانے ہیں
ہم پاٹلی پتر اور سہون سے
برلن کی دیوار سے لندن سے
سنکیانگ اور مصر کی چھوٹی چھوٹی گلیوں تک
اپنے کو بانٹتے آئے ہیں
اب خود قلاش ہیں
سڑکوں پر مارے پھرتے ہیں
بے چون و چرا
غیروں کی لڑائیاں لڑتے لڑتے
زخمی ہو ہو گرتے ہیں
پھر ہانپتے کانپتے
اپنی سانسیں گنتے ہیں
گوگول کے اوور کوٹ میں
اپنے دن اور اپنی راتوں کے صدموں کو جھیلتے ہیں
معلوم نہیں
کیا کھاتے ہیں، کیا کھیلتے ہیں
گوتم چمپا اور کمال کے دامن میں
برباد مکانوں کے باغوں کی بندھی ہوئی پھولوں کی حسرت
عینی سے کن وقتوں کے بے وقت تقاضے کرتی ہے
عبداللہ کے بیٹے احمد اور اُن کے عم زاد علی کو
اپنے جانتے
دوزخ میں دے دے کے سزائیں
دانتے (ا)
کب کا اپنی آگ میں راکھ ہوا

(ا) طربیہء خداوندی (The Divine Comedy) کے شہرہء آفاق اطالوی شاعر دانتے (Dante Alighieri) کے اٹھائیسویں کینٹو (Canto XXVIII) کے حوالے سے

لینارڈ کوہن

مانٹریال میں اب بھی تمہارے جاننے والے
سڑک کنارے
قہوہ خانوں میں اپنے وقت گزارتے
تم کو بھول نہیں پاتے ہیں
تم تو ہمیشہ کے مادھو تھے
لاکھوں ڈالر تم نے کمائے
پھر بھی
تمہاری لاپروائی تم کو اکثر لے ڈوبی
جس کو جو بھی ہاتھ آیا گٹھری میں باندھے
ساتھ تمہارا چھوڑ کے آگے نکل گیا
اور تم
نا اہلی کے بیش بہا تمغے کو اپنے بھید بھرے سینے پہ سجائے
گوتم بدھ کے نام کی مالا جپتے
آخر اک گمنام پہاڑی پر جا ٹکے
دل کو سکوں پہنچانے کے ان جتنوں میں
تم نے کیا کھویا کیا پایا
کون بتائے

لینارڈ
اونچی اونچی پہاڑیاں طے کرنے کے بعد
جہاں اب تم ہو
شاید بڑے سکون سے ہو گے
تم کو خود اندازہ ہو گا
اب بھی تمہارے ہر نغمے کی گونج یہاں باقی ہے
اور تمہاری لکھی کتابیں
آج بھی کم مقبول نہیں
لیکن اس سے تمہیں کیا لینا؟
پہلے بھی جب دنیا کے ہر خطے میں تم اپنے گیت بکھیر رہے تھے
شہر تمہارا تم سے دور، بہت ہی دور، بہت ہی پیچھے چھوٹ گیا تھا
مانٹریال کی گلیوں میں اس وقت بھی تم پورے زندہ تھے
آج بھی تم زندہ ہو، تابندہ ہو
اب تو اسی مٹی کا تم اک حصہ ہو!

’’لینارڈ، ہمیں علم ہے کہ آپ عظیم ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ آپ کسی لائق بھی ہیں۔‘‘
(Leonard Cohen (1934-2016 بین الاقوامی شہرت یافتہ کینیڈا نژاد شاعر ناول نگار اور موسیقار کے نام ایک خط کا اقتباس۔

ستمبر گیارہ

کبھی جو اور کسی سرزمین پر جا کر
بنامِ امن لہو کی ندی بہاتے تھے
انہیں گماں بھی نہ تھا
ایک وقت آئے گا
جب اور کوئی خود ان کے ہی درمیاں آ کر
انہی کے گرز سے ان کے بتوں کو ڈھا دے گا

ابوغریب سے زندانِ گنتانا موتک
وہ سارے نام کہ جغرافیائی ثروت تھے
فضائے تیرہ ءتاریخ میں اچھالے گئے
طلسم خانہ ءمغرب کے خانہ زاد بھی اب
بدل کے جسم کو شہ سرخیوں کی صورت میں
خود اپنے ہم وطنوں سے سوال پوچھتے ہیں
تہِ زمیں کی یہ سوغات،
آتشِ سیال،
لکیر بن کے گزرتی ہے جن زمینوں سے
وہی ہے کیا حدِ آخر ضمیرِ انساں کی؟
یہ جنگِ امن نہیں، جنگ اقتصاد کی ہے
جہانِ کہنہ کے کردارِ کج نہاد کی ہے
کہ جس کی زد میں ہے یہ سارا عالمِ اسباب
تمام کوچہ و بازار، منبر و محراب

اب ایسی گونج ہے
کانوں میں انگلیاں دے کر
تمام عقدہ کشایانِ دہر پوچھتے ہیں
یہ کیا ہوا کہ سلامت نہیں کہیں کوئی!

○

''جدید تاریخ میں پہلی بار یورپ اور اس کے حواریوں کو خود ان کی اپنی سرزمینوں پر ایسی سفاکی کا سامنا کرنا پڑا جسے وہ معمول سمجھ کر کرہ ءارض کے دوسرے خطوں پر روا رکھتے تھے۔''
نوئیم چومسکی (Noam Chomsky) کی کتاب: *Nine-Eleven* (Six Stories Press, NY, 2002) سے ایک اقتباس۔

عبدالوہاب البیاتی کے ساتھ ایک شام

ہر گلی کوچے میں لاش اپنی اٹھائے
رات آتے ہی کسی اک بالاخانے پر
جہاں سائے
برہنہ تن کو ڈھانپے ناچتے ہیں
یا کہیں اک پارک میں
یا پھر کسی نکڑ پہ واقع
قہوہ خانے کے دھوئیں میں
دفن کر آتے ہو خود کو
اپنے چہرے کو چھپائے
شرم کے مارے
خدا اور عائشہ و لارا و عِشتار سے

سلسلہ یہ عشق کا
لاانتہا
کوئی آتا ہے مگر
ہر بار جانے کے لئے

ہے کدھر راہِ نجات
طٰہٰ اور یٰسین کے دکھ کی امیں
الطّواسینِ گنہ گارانِ ہست و بودِ ذات
قرض تھا حلاج پر کیا تیغ خوں آشام کا؟
دردِ دل کیا جانہ پائے گا کبھی خیام کا؟
راز کیا اب بھی ہے پوشیدہ ابوتمّام کا؟
کون جانے گا غمِ حاوی خلیل
ہانپتا صحرا ہے اور دریائے نیل

الطواسین۔ منصور حلاج کی تصنیف
خیام (وفات: ۱۱۲۳)۔ فارسی زبان کا مشہور شاعر، ریاضی داں، اور ماہر فلکیات
خلیل حاوی (۱۹۲۵۔۱۹۸۲) عربی زبان کا ممتاز شاعر جس نے
لبنان پر اسرائیلی حملے کے بعد خودکشی کر لی۔
ابوتمام (۷۸۸ ۔ ۸۴۶)۔ عباسی عہد کا عظیم شاعر
عِشتار۔ بابلی اساطیر میں عشق اور زرخیزی کی دیوی
عائشہ اور لارا۔ عبدالوہاب البیاتی کی نظموں کے دو نسوانی کردار

تلوے کی مُردہ کھال

میرا خیال تھا
دنیا کو، دنیا کے راز کو
کافی کچھ میں جان چکا ہوں
لیکن جانی شے بھی
اک اندیکھا اور بھیانک روپ بدل کر
میرے آگے تن جائے گی
اس کا ہرگز علم نہیں تھا
سوچتا ہوں دنیا کو میں نے کیا جانا ہے
پھر یہ سوچ کے
دنیا کے سب کام تو آخر نبٹانے ہیں
اپنے گھر سے نکل پڑتا ہوں
ویزا، ٹی وی، بجلی، پانی، گیس، اور فون
کے اتنے سارے ڈھیر بلوں پر
مہر لگاتی، باتیں کرتی
بینک کی خندہ جبیں کارندہ
دل کو اک بے نام خوشی سے بھر دیتی ہے
گھر آ کر
پھر بیٹھے بیٹھے
غیر شعوری طور پہ، عادت سے مجبور
کھرچنے لگتا ہوں
اپنے نرم و گرم چشیدہ
وقت شکن تلوے کی مُردہ کھال

○

پچھلے برس کی آخری نظم

رات بھر زنجیر کاٹوں
اک نئی زنجیر پہنوں
اپنی اِن بے خواب آنکھوں میں
سنہرے خواب بُن کر
چند اک سیماب پا بے درد لمحے کو
ربڑ کی طرح کھینچوں
اور ان لمحوں کی گرہوں میں
پھر اپنے خواب باندھوں

اب مری سوچوں میں گرہیں
اب مری سانسیں وبال
اب مری دھوپوں میں گرہیں
اب مرے سائے بھی جال
اب مرے اطراف گرہوں کا طلسم
شہد کی مکھی کے چھتّے کی طرح جکڑا ہوا گرہوں میں جسم
(اب جو اِن گرہوں کو کھولوں اک صدی پر پھیل جائیں)

صبح دم بستر پہ تھک کر چور گرتا ہوں
تو اب یہ سوچتا ہوں
رات بھر زنجیر کاٹوں کاٹتا جاؤں مگر
کیوں نئی زنجیر پہنوں
کیوں کوئی زنجیر پہنوں

○

ترقی پسند تحریک

(ادبی خدمات اور موجودہ صورتِ حال)

شاہین

ہر تحریک وقت کی پیداوار ہوتی ہے۔ کبھی یہ تاریخ کا روشن باب بن جاتی ہے اور کبھی حاشیے میں سمٹ کر رفتہ رفتہ بڑی حد تک اجتماعی شعور سے بھی کٹ جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک اردو کی ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب میں کم وبیش بیس سال تک آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر رہی۔ برصغیر کی آزادی سے بارہ سال پہلے اور آزادی کے بعد کے آٹھ نو سال تک کا زمانہ ترقی پسند ادب کا عہدِ زریں تھا۔ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے اس تحریک نے اردو ادب کو جو کچھ دیا وہ غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔ افسانوی ادب ہو یا شعری ادب یا انتقادی ادب ترقی پسند مصنفین نے ایک نئے عوامی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، سائنسی اور تاریخی شعور کے تناظر میں ادب کو بھرپور توانائی بخشی۔

بڑا ادیب یا شاعر بننے کے لئے محض صلاحیتوں کا ہونا کافی نہیں، صحیح وقت اور صحیح مقام پر پیدا ہونا ضروری ہے۔ تاریخ کا وہ دور بے حد اہم ہوتا ہے جب حالات میں تبدیلی کے سبب حسیاتی اعتبار سے نمایاں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ ایسے ماحول میں شاعر یا ادیب کا نشو ونما پانا نادرہ کار جدت طرازیوں کا باعث ہوتا ہے۔ تاریخ کے اس موڑ سے پہلے پیدا ہونے والے ماضی کی روایات سے الگ نہیں ہو پاتے اور بعد میں پیدا ہونے والے ادیب وشاعر کے ہاں جدت کا امکان نسبتاً کم باقی رہتا ہے کیونکہ ماضی قریب میں بہت کچھ رونما ہو چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ باصلاحیت تخلیق کار جو اس دوران ادبی افق پر نمودار ہوئے انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ترقی پسند تحریک کے زریں دور میں کچھ قابلِ قدر ہستیاں باہر رہ کر، یا عتاب زدہ ہونے کے باوجود، کام کرتی رہیں۔ معاصرانہ چشمکوں اور ادبی معرکوں سے قطعِ نظر، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں فریق، دبے لفظوں میں سہی، ایک دوسرے کی خدمات کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس جس کا مشہورِ زمانہ خطبہ پریم چند نے پیش کیا تھا ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ دوسری کانفرنس کا انعقاد کلکتے میں ۱۹۳۸ء میں ہوا جس کا افتتاح ربندر ناتھ ٹیگور نے کیا تھا۔ اس تحریک کی ابتدا سے ہی بڑی بڑی قد آور شخصیتیں اس سے وابستہ رہیں۔ ادبا اور شعراء کے درمیان بھی معاندانہ تعلقات کم کم تھے۔ فیض احمد فیض کی 'نقشِ فریادی' کا دیباچہ ن۔م۔راشد نے لکھا۔ ن۔م۔راشد کی 'ماورا' پر کرشن چندر کا پیش لفظ تھا۔ میرا جی ترقی پسندوں کی نشستوں میں اکثر وبیشتر شریک ہوا کرتے تھے۔ ترقی پسند ادیب بھی حلقہء اربابِ ذوق کے جلسوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ بے لچک رویوں کی شدت کے سبب راشد کے ساتھ ساتھ منٹو، میرا جی، قرۃ العین حیدر، اختر الایمان، اور کئی دوسرے معتوب ٹھہرے۔ یہ تحریک کی کمزوری تھی کہ وہ اچھے اور برے ادب کی پرکھ میں ہمیشہ کھری نہیں اتری۔ سرکاری موقف کی ترجمانی کے جوش میں ادب پر آنے والی آنچ نے کسی حد تک اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا۔ مگر یہ مثالیں ایسی تھیں جس کے لئے حالی نے اپنی ایک رباعی میں کہا ہے کہ اگر انار کے چند ایک دانے گلے سڑے ہوں پھر بھی انار کی لطافت میں کمی نہیں آتی۔

کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

ترقی پسند تحریک نصف صدی سے بطور تحریک زندہ نہیں۔ لیکن ترقی پسند فکری رویے پر کوئی ضرب نہیں پڑی۔ ادب کے سلسلے میں کڑیاں جڑتی رہتی ہیں۔ کمزور کڑی کے لئے گنجائش ہی نہیں نکلتی کیونکہ کمزور کڑی کا وجود زنجیر کی مجموعی صحت پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی سالمیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب ہی ایک ایسی مملکت ہے جہاں آمریت نہیں چلتی۔ ترقی پسند فکر ایک دولتِ مشترکہ ہے جس کے ہم، آپ، سب ساجھے دار ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت کا دور آیا، پھر مابعد جدیدیت کا۔ صورتِ حال یوں ہے کہ ہر طرح کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ کون اچھا ہے کون برا۔ اس مخمصے میں پڑے بغیر میں چند اشعار کے ذریعے اپنے موقف کی وضاحت کروں گا:

ان بجلیوں کی چشمکِ باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

معین احسن جذبی

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں
نم ہوئی ہے تو اسی شاخ سے لشکر نکلا

وحید اختر

ردی کے بھاؤ بیچنے نکلے ہوئے ہیں لوگ
یہ زندگی پڑھا ہوا اخبار ہی تو ہے

صبا اکرام

حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا
تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

عرفان صدیقی

بھنور سے جی بھی گھبراتا ہے لیکن کیا کیا جائے
طوافِ موجِ کم رفتار بھی کرتے نہیں بنتا

محبوب خزاں

مگر ان سیپیوں میں پانیوں کا شور کیسا تھا
سمندر سنتے سنتے کان بہرے کر لئے ہم نے

ساقی فاروقی

یہ مختلف فکری جہتوں کے شاعر ترقی پسند نظریاتی رویے سے الگ نہیں نظر آتے۔ مقصدیت اور افادیت، اور شعور وادراک پر اصرار ترقی پسند ادب کا طرہء امتیاز رہا ہے۔ ان عناصر کی کارفرمائی مندرجہ بالا اشعار میں بھی بدرجہء اتم موجود ہیں۔ ترقی پسند فکر کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔

علی سردار جعفری ترقی پسند ادب کے حوالے سے ایک بڑا نام ہیں۔ اگرچہ تحریک سے ان کا رشتہ پہلی کانفرنس کے دو سال بعد ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا لیکن سجاد ظہیر کے بعد شاید ان کی شخصیت سب سے زیادہ فعال رہی ہے۔ ترقی پسند تحریک پر ان کی کتاب ایک مستند کارنامہ ہے۔ میرے انگریزی رسالے 'اردو کینیڈا' میں ان کا اکیس صفحے پر محیط ایک معرکتہ الآرا مضمون بعنوان 'ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری' شائع ہوا تھا جس کی غیر اردو داں حلقے میں بھی بڑی پذیرائی ہوئی تھی۔ مشہور شاعر اور صحافی حسن عابدی نے ۱۹۹۱ء میں سردار جعفری کا انٹرویو لیا تھا جو کراچی کے انگریزی روزنامے 'ڈان' میں شائع ہوا (بحوالہ سردار جعفری نمبر، ماہنامہ 'افکار' کراچی)۔ آخری سوال کے جواب میں کہ آیا 'کیا یہ درست ہے کہ برصغیر میں جدیدیت کی تحریک کو فروغ اس لئے حاصل ہوا کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اپنے آپ کو دہرانے لگے تھے؟' سردار جعفری نے تکرار کو تخلیقی ذہن کی خصوصیت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ 'جدیدیت کی تحریک کی جڑیں ترقی پسندوں کی انتہا پسندی میں پیوست ہیں۔ ایک بات تو یہ ہوئی اور جدیدیت کے بروئے کار آنے کی دوسری وجہ۔۔۔ آخر دوسرے درجے کے لکھنے والوں کو بھی تو کوئی راستہ ملنا چاہیے۔'

اب یہ تعمیم پسندی کی روش کہ ترقی پسند ادب کے علاوہ بقیہ سارا ادب دوسرے درجے کے لکھنے والوں نے تخلیق کیا ہے تو یہ وہ انتہا پسندی ہے جس کی طرف خود سردار جعفری نے اشارہ کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ بھی ذاتی طور پر اس میں شامل رہے ہیں۔ ایک اور جگہ ان کا یہ بیان کہ 'راشد اور میراجی کی شاعری اپنی شناخت کھو چکی ہے' اسی زمرے میں آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی، لیکن ترقی پسند فکر زندہ ہے۔ واضح رہے کہ ادب کی اقلیم میں آزادیء فکر کی بالادستی شرطِ اول ہے۔ بقول ممتاز حسین 'انسان اپنی نو بہ نو تخلیقات ہی سے زندہ ہے۔ وہ اپنے تخلیقی عمل سے اپنی تخلیقِ نو پیہم کرتا رہتا ہے۔' کوک شاستریت، دین و مذہب، اقتصاد، بشریات، جرم وسزا، یا سیاست، ادب کا تعلق سب سے ممکن ہے۔ مگر ان میں سے کسی کو ادب پر حاوی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر دنیا کی بڑی شاعری میں مذہب کو بہت دخل رہا ہے۔ رومی ہوں یا اقبال وانیس یا سوامی تلسی داس اور میرابائی، یا مغربی ادب کے حوالے سے بات کریں تو دانتے، ملٹن، بلیک اور ایلیٹ، ان سب کی شاعری صرف اور صرف ادبی محاسن کے سبب عظیم گردانی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ محض مذہبی عقائد اور پس منظر کی بنا پر ان کے سروں پر تاج پہنایا گیا ہے۔ (ہمارے نقادانِ گرامی نے دانتے کی 'طربیہء خداوندی' کی جی کھول کر مدح خوانی کی ہے لیکن میرے علم کی حد تک کسی نے بھی اس کتاب میں آنحضرتؐ اور حضرت علیؓ کی شان میں جیسی گستاخی کی گئی ہے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا ہے۔) اسی طرح سیاست ادب کی تابع تو ہو سکتی ہے ادب کی رہنمائی نہیں کر سکتی۔

ترقی پسند تحریک سے الگ رہ کر بھی بہتوں نے، جن میں وہ بھی شامل ہیں جو معتوب رہے، ترقی پسند ادب کی تخلیق کی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا جائے۔

نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند فکر آج بھی توانا ہے کیونکہ ہر اچھا ادب ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ اردو ادب ارتقا پذیر ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ پریم چند نے اپنے خطبہء صدارت میں کہا تھا کہ ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ نیز یہ کہ آرٹسٹ طبعاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا انہوں نے جس سمت کی نشاندہی کی تھی وہ آج بھی اچھے ادب کے لئے منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ اس بات کی طرف کم توجہ دی گئی ہے کہ پریم چند نے اپنے خطبہء صدارت میں اپنے موقف کی وضاحت کے لئے تین شعر کا حوالہ دیا تھا اور تینوں اقبال کے ہیں:

رمزِ حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

اور

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذتِ پرواز
گہے بشاخِ گلم گاہ بر لبِ جویم

اور پھر

در دستِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

انسانیت کی بقا اور ارتقا کا یہ عالمگیر پیغام عصر حاضر میں بھی ایک جہانِ معنی پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کو جس شعور کی آگہی بخشی تھی وہ آج کی تمام ادبی فکری رو میں جاری وساری ہے۔

- بقیہ -
''کسی مے خوار کا گھر''

کے بارے میں کوئی قاری یہ شکوہ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ نہ صرف سمجھ میں آتی ہے بلکہ پردۂ ذہن پر گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑتی اور فکر وخیال کے نئے نئے پہلو اجاگر کرتی ہے۔ وہ دراصل انسانی غموں کے شاعر ہیں اور ان انسانی غموں میں بے چہرگی، تنہائی، بے زمینی اور بے نشانی کا المناک گونج ان کی تمام شاعری میں سنائی دیتی اور دلوں کو برماتی ہے اور یہی خصوصیت یا نشانی آفاقی سطح پر ان کی اور ان کی شاعری کا نشان بن گئی ہے اور یہ امتیاز جدید شعراء میں شاید کسی کو حاصل نہیں۔

''دلِ شادکام''

نعت رسول ﷺ

بلند اُن ﷺ سے کسی کا مقام تھوڑی ہے !
مرے لبوں پہ کوئی اَور نام تھوڑی ہے
ہماری روح بھی کرتی ہے وردِ صلِ علیٰ
فقط لبوں پہ درود و سلام تھوڑی ہے!
عطا ہوا ہے نبی ﷺ کے کرم سے لفظ بہ لفظ
سُنا رہا ہوں جو، میرا کلام تھوڑی ہے !
مقامِ عالیِ نعلینِ مصطفیٰ پہ ہوں مَیں!
جہاں کھڑا ہوں مَیں، میرا مقام تھوڑی ہے
غلام ہوں مَیں اُنہی کا، وہی کفیل مِرے
کچھ اپنی فکر کروں، میرا کام تھوڑی ہے !
نہ پوچھو کیسے مدینے سے لوٹ کر آیا !
وہاں سے لوٹ کے دل شادکام تھوڑی ہے
خدا کے بعد جو زندہ ہے تو حضور ﷺ کا نام
وگرنہ اور کسی کو دوام تھوڑی ہے
ہر اِک رسول کا رتبہ عظیم ہے، لیکن
کوئی حضور ﷺ سا خیر الانام تھوڑی ہے !
نبی کریم ﷺ سا آقا بھلا نصیب کسے؟
بِلال جیسا بھی کوئی غلام تھوڑی ہے
خدا کے بعد رسولِ کریم ﷺ ہیں، اور بس !
نسیم اِس میں کسی کو کلام تھوڑی ہے !

نسیم سحر (راولپنڈی)

نعت رسول مقبولؐ

اے مرے شاہ عجم شاہ عرب امی لقب
سب سے اونچا ہے ترا نام ونسب اُمی لقب

تو غنی از ہر دو عالم بادشاہ ہوں کہ گدا
مانگتے ہیں تیرے در سے سب کے سب، اُمی لقب

آپ ہی تو ہیں مرے ٹوٹے ہوئے دل کی امید
آپ ہی تو ہیں مری جائے طلب اُمی لقب

جس نے کی ہے دشمنی تجھ سے تری اولاد سے
اس پہ اترا ہے ترے رب کا غضب، اُمی لقب

چشمِ رحمت سے کریں نوکر پہ گویا التفات
شدتِ غم سے ہوا ہوں جاں بلب اُمی لقب

رحمت اللعالمین یٰسین صادق اور امیں
تجھ کو قدرت سے ملے کیا کیا لقب اُمی لقب

نعت کہتے دل میں در در آئے دنیا کا خیال
دل میں رکھو یوں اسدؔ، پاسِ ادب اُمی لقب

اسد عباس خان
(جھنگ)

برگِ آوارہ

انِل ٹھکّر
(بَہلی، بھارت)

ساتھ۔۔۔

ساتھ پل بھر کا ہو یا برسوں کا۔۔۔ساتھ ذہن کا ہو یا روح کا۔۔۔ ساتھ آسمان کا ہو یا دھرتی۔۔۔ساتھ میں دراڑ پڑ جائے۔۔۔دراڑ سے فاصلہ جنم لے۔۔۔فاصلوں کی نئی زمین سے کانٹے دار جھاڑیاں پھوٹ نکلیں تو وہ روح کو لہولہان کر دیتی ہیں۔اس نے اپنی لہولہان روح کے ساتھ اپنی دھرتی کے ٹکڑے کو الوداع کہہ کر مستقبل کی انجانی راہ پر قدم بڑھائے تو اس کے پورے وجود میں کپکپی پیدا ہوئی۔اس کے پاؤں تھرتھرائے۔آگے بڑھنے کی جستجو دم توڑنے لگی اور جب آنکھیں وعدہ فراموشی پر اُتر آئیں تو اس کا حوصلہ پست ہو گیا۔

اس نے سوچا تھا کہ اپنی ہر جذباتی کمزوری کو، اپنی خون آلودہ روح کو بھی یہاں سے جاتے ہوئے دھرتی کے ٹکڑے سے چھپا کر لے جائے گا مگر یہ آنکھیں۔۔۔نہ جانے یہ آنکھیں کیوں جدائی کی گھڑی میں عورتوں کی طرح ماتم کرنے پر آمادہ ہو رہی ہیں۔حالانکہ آنکھوں سے اس کا اَن کہا، اَن لکھا سا معاہدہ تھا کہ وقتِ ہجرت وہ خود کو مانندِ صحرا خشک کر لیں گی!

اس کا کسی پر بھی تو اختیار نہیں رہا۔نہ حالات پر، آنکھوں پر، نہ اپنے آپ پر۔۔۔لاچار و بے بس! اس نے جانے کے لیے پیٹھ تو پھیر لی مگر پاؤں آگے نہ بڑھا سکا۔پاؤں جواب دے گئے۔اس نے آہستہ سے آہ بھری اور پیڑ کے تنے سے لگ کر کھڑا رہا۔

نظروں کے سامنے کھلا میدان۔میدان کے بیچ مولانا ابوالکلام آزاد کا مزار۔جامع مسجد کی سیڑھیاں مسجد کی بلند و بالا عمارت اور آسمان کو آغوش میں لیتے ہوئے مینار۔گنبد کے اطراف طواف کرتے ہوئے کبوتر۔ٹکڑیوں کی صورت فضا بسیط میں بہتے ہوئے بادل اور زمین پر انسانوں کا ہجوم، چہل پہل طرح طرح کی بولیوں کی چہچہاہٹ سب کچھ وہی تو ہے۔سب کچھ وہی۔ہُو بہ ہُو جیسا پچپن سال پہلے تھا۔جب پہلی مرتبہ اس دھرتی کے ٹکڑے کو اس نے جھاڑ پونچھ کر صاف کیا تھا۔ایک نظر جامع مسجد کی جانب دیکھ کر اپنی گدی پر بیٹھا تو نظروں کے سامنے تھا مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت کا چشم دید گواہ۔۔۔لال قلعہ۔۔۔لال قلعے کی دیوار پر بلندی سے تین رنگوں میں لہراتا ہوا ترنگا، جمہوریت کی آن، جمہوریت کی شان مگر اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس لہراتی ہوئی جمہوریت کی آن کے اطراف خیال و خواب کے کبوتر اُڑاتا۔

زمین کے اس ٹکڑے پر اس کے کاروبار کا وہ پہلا دن تھا۔نئی جگہ، نیا ماحول، نیا نیا کاروبار، کاروبار بھی ایسا کہ ایک لمحے کی غفلت بھی نقصان کی وجہ ثابت ہو سکتی ہے۔دائیں بائیں یا سامنے سے آنے والے گزرنے والے کا پل بھر میں مطالعہ کر کے صدا دینی پڑتی ہے۔

اللہ کے نام پر۔۔۔واہے گُرو تمہارا بھلا کرے۔۔۔جئے بھولے شنکر، کانٹا لگے نہ کنکر۔۔۔جیسا بندہ۔۔۔ویسی صدا۔

تھوڑے ہی دنوں میں وہ چہرہ پڑھ کر صدا دینے کے فن میں ماہر ہو گیا۔ان کے بندے وہ اپنے گرو کے سامنے ماتھا ٹیکنے والے بھگوان کے بھگت جن کے کانوں پر ادھر اس کی فنکارانہ صدا پڑتی، اُدھر ان کے دلوں میں رحم کا دریا ہچکولے لینے لگتا، ہاتھ لاشعوری طور پر جیبوں میں چلے جاتے۔پانچ پیسے خیرات کرنے والے دس اور بیس پیسے دان دینے والے چونی اس کی پھیلی ہوئی چادر پر پھینک کر اپنے ربّ کو یاد کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

کاروبار کے ابتدائی دور میں جو اس کے فن کا دورِ مشق بھی تھا اس نے کہیں سے لا کر ایک پودا اس قطعۂ زمین کے سینے میں لگا دیا۔

کچھ اس طرح جانے اَن جانے اس نے اس دھرتی کے ٹکڑے سے ناتا جوڑا۔

وقت کے ساتھ پودا بڑھتا گیا۔۔۔رشتہ جڑ پکڑنے لگا۔۔۔پودے کے جسم سے شاخیں پھوٹیں۔۔۔رشتے کی باہیں پھیلیں۔۔۔پودا پیڑ بنا۔۔۔ دھرتی ماں بنی۔

یک بہ یک اسے محسوس ہوا کہ پیڑ کے تنے کا لمس اس کی پیٹھ سہلا رہا ہے۔جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔مجھے دیکھ۔۔۔کسی سے کوئی آس نہیں، دھوپ، بارش، آندھی، سب سہہ لیتا ہوں۔میرا کام ہے چھاؤں دینا۔آج تو جا رہا ہے کل کوئی اور آئے گا۔۔۔میں اسے بھی چھاؤں ہی دُوں گا۔البتہ جب وہ تھک کر سستانے کے لیے میرے تنے سے پیٹھ ٹکائے گا میرے پتے ہوا کی موسیقی کے ساتھ لوری سنائیں گے تو اس کی آنکھیں تو خوابیدہ ہو جائیں گی مگر میں تیری یاد میں سسکتا رہوں گا۔ میری طرح، ایک ہی جگہ ٹھہرنے کا مقدر تو تیرے حصے نہیں آیا۔تو چل سکتا ہے، بڑھ جا، تیرے اطراف تو راہیں ہی راہیں ہیں۔کوئی راہ تیرے لیے بھی تو ہو گی۔

وہ دھیرے سے جھکا۔دھرتی کے ٹکڑے سے چٹکی بھر دھول اٹھائی زبان پر رکھی، تن کر سیدھا ہوا، بیساکھیاں سنبھالیں اور میدان کی نرم دوب پر قدم بڑھائے۔مگر چند قدم چل کر ہی وہ رُک گیا۔۔۔جامع مسجد کے گنبد کو دیکھا آسمان کو چھوتے ہوئے میناروں پر نظر ڈالی اور بڑبڑایا۔

نہیں، مجھے آج پناہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس نے دھیرے سے آنکھیں بند کیں، جیسے پلکوں سے ایک چُسکی میں میدان سمیت جامع مسجد کے عکس کو پی لینا چاہتا ہو۔

چاندنی چوک کے فٹ پاتھ پر قدم رکھتے رکھتے وہ رُکا۔دھیرے سے چہرہ گھما کر عمارتوں کے جنگل سے اوپر اُٹھ کر دکھائی دینے والے میناروں پر

''چہارسُو''

ایک نظر ڈالی۔ چند لمحوں بعد کچھ سوچتے ہوئے چل پڑا۔

کیا سچ مچ، مجھے آج پناہ کی ضرورت نہیں ہے؟ جبکہ میرا اپنا سب کچھ ریت کے مانند میرے ہاتھ سے پھسل گیا ہے۔

اس نے بارہا جامع مسجد کے احاطے میں پناہ لی تھی۔ جب بھی مسجد کے ستون کا سہارا چھوڑ کر بیساکھیاں اُٹھائی تھیں تو اس کا وشواس ستون کے پتھروں کی طرح مضبوط ہوتا چلا گیا کہ جس کا کوئی آسرا نہ ہو، اس کے لیے بارگاہِ رب العزت ہی پناہ گاہ بن جاتی ہے۔

اس کی یادیں بندر کے بچے کی طرح سوچ کی ایک ٹہنی سے دوسری، اور دوسری سے تیسری ٹہنی پر چھلانگیں لگا لگا کر اودھم مچانے لگیں۔ اسے یاد آیا۔۔۔ جب اس نے جامع مسجد میں پہلی بار پناہ لی تھی۔ اس دن وہ اپنے کاروبار میں مشغول، صدائیں دے رہا تھا کہ بھگدڑ مچ گئی چاروں طرف شور برپا ہو گیا۔ ہر شخص خوف زدہ، بدحواس بھاگ رہا تھا۔ اطراف میں ٹھیلوں پر کپڑا، چاٹ اور دیگر سودا فروخت کرنے والے اپنا اپنا ٹھیلا دھکیلتے ہوئے جس سمت بھی ذرا سی راہ نظر آئی بھاگے۔ پُرانی دہلی کے اسٹیشن کی جانب جانے والی سڑک، دریا گنج جانے والا رستہ، رکشاؤں اور لوگوں کی افراتفری سے لبریز ہو رہے تھے۔ کس کی گاڑی کس سے ٹکرائی، کس کا پاؤں کس نے کچلا، کس کی ٹوپی کہاں اُچھلی کس کو کچھ خبر نہیں۔

اس نے بھی ڈر کے مارے اپنا تھیلا اُٹھایا۔ بیساکھیاں سنبھالیں اور کھڑا ہوا تو دفعتاً ذہن میں سوال اُٹھا کہاں جاؤں؟ مڑ کر دیکھا۔ مغرب میں آفتاب۔۔۔ جیسے انسان کا کمینہ پن دیکھ کر جامع مسجد کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا رہا تھا۔ مینار کی پرچھائیں ہنومان کی دُم کی طرح لمبی ہو کر اس کے زمین کے ٹکڑے تک بچھی ہوئی تھی۔ بچھی ہوئی پرچھائیں کو دیکھ کر جیسے اسے اِلقا ہوا۔۔۔ وہ لنگڑاتے ہوئے تیز قدموں سے، گرتے سنبھلتے پرچھائی کی اس راہ سے مسجد کی سیڑھیوں تک تو پہنچ گیا مگر سیڑھیوں کی بلندی دیکھ نا اُمید ہو گیا۔

انسان چاہے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو جب اس کی جان پر بن آتی ہے تو ایک عجیب سی قوت بجلی کی سرعت کے ساتھ جسم کے رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔۔۔ وہ سیڑھیوں کی بلندی کو بھی پار کر گیا اور جب مسجد کے ستون کا سہارا لے کر بیٹھا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور ذہن پر خوف کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ خوف کے بادل تین دن تک گرج گرج کر منڈلاتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد افواہوں کے جھونکے آتے۔۔۔ فلاں فلاں مقام پر اتنے مسلمان قتل کر دیے گئے۔۔۔ ایسی ایسی جگہ پر ہندوؤں کی اتنی لاشیں بچھ گئیں۔۔۔ اتنی دکانیں لوٹی گئیں۔۔۔ کئی مکان جلائے گئے۔۔۔

افواہوں کے جھونکے آتے اور اس کے جسم کو پسینے سے لج لجا کر کے چلے جاتے۔۔۔ رہ رہ کر مختلف سمتوں سے مختلف نعروں کی آوازیں بلند ہوتیں۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ ہر ہر مہادیو۔۔۔ بولے سونہال، ست شری اکال۔۔۔ مسلمانوں کی لاشیں۔۔۔ ہندوؤں کے مردے۔۔۔ دکانوں کی لوٹ۔۔۔ مکانوں کی راکھ۔۔۔

نعروں کا شیطان اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا اور سرگوشی بھرے لہجے میں اس کے کان میں بولا۔۔۔ بھائی منگتو، اُن میں سے تیرا نعرہ کون سا؟

سوال سن کر وہ سٹپٹا گیا تھا۔ وہ نعروں کی بولی سے ناواقف تھا۔ وہ تو صدا کی زبان جانتا تھا۔ وہ نعروں کی لگام لگا کر چلنے والا ٹٹو نہیں تھا۔ وہ تو صدا کے سُر الاپتا ہوا بے لگام بندہ تھا۔

بندہ۔۔۔ اپنے ربّ سے ڈرنے والا۔۔۔ سیاست میں جاہل۔۔۔ جس کی منزل کرسی نہیں۔۔ جس کا مسئلہ ہے۔۔۔ روٹی۔۔۔ وہ کل کی نہیں سوچتا۔ وہ تو صرف امروز کی انگلی تھامے روٹی کے گیت گاتا ہے۔

تین روز جب تھک ہار کر نعروں کا شیطان سمھ کرن جیسی نیند میں اونگھنے لگا تو وہ اپنی پناہ گاہ کی سیڑھیوں سے اُتر کر پھر اپنی صداؤں کی دنیا میں لوٹ آیا مگر۔۔۔ ذہن کی صلیب پر سوال کی ایک لاش۔

اس کی نظریں بار بار اس سوال کی جانب اٹھتی رہیں اور اسے احساس ہوتا رہا۔ جیسے وہ اس سوال کے جسم میں ہر بار نظروں سے کیلیں ٹھونک رہا ہے۔ کیل لگتے ہی خون ٹپکنے لگتا ہے اور خون کے ہر قطرے سے سوال کا نیا جنم ہو رہا ہے۔ جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اسے جواب نہیں سوجھتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے کہ اس کا مذہب کیا ہے؟

وہ کون ہے؟

ہندو؟

مسلمان؟

سکھ؟۔۔۔ عیسائی۔۔۔ یا۔۔۔؟

سوال ہے، پہچان کا۔۔۔ انسان کی پہچان کا پیمانہ کیا ہو سکتا ہے؟

۔۔۔ مذہب۔۔۔ ذات؟۔۔۔ پیشہ؟

وہ اَن پڑھ، گنوار، جاہل ہونے کے باوجود اتنا تو سمجھ سکتا تھا کہ اس کی پہچان تو اس کے والدین ہی ہو سکتے ہیں۔ والدین۔۔۔ جو جنم دیتے ہیں۔۔۔ مذہب دیتے ہیں۔۔۔ ذات دیتے ہیں۔

مگر کہاں ہیں؟ کون ہیں اس کے والدین؟

اس نے ماضی کے صحرا میں افق تک نظریں دوڑائیں مگر اسے اپنے والدین کہیں نظر نہیں آئے۔ اس کی پہچان ماضی کے صحرا میں جانے کہاں کھو گئی تھی۔ کیسے ڈھونڈے وہ اسے!۔۔۔ اسے تو ماضی کے صحرا میں دُور، بہت دُور ریت کے ٹیلے پر ایک چھوٹا سا معصوم لڑکا نظر آتا ہے۔ بس۔۔۔ اس کے بعد کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ سوائے حوصلہ دینے والی اُڑتی ریت کے۔۔۔ ماضی کے صحرا سے نکل کر وہ لڑکا دہلی آیا۔ روزی روٹی کی تلاش میں۔ جینے کے لیے جدوجہد کی۔ کام کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں اور ایک دن چوری کر کے بھاگتے ہوئے کار کی لپیٹ میں آ کر ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔

''چہارسُو''

اُسے تو یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکے کو منکو نام کس نے اور کب دیا؟ مگر۔۔۔نام تو پہچان نہیں بنتی۔۔۔نہ خود کی۔۔۔نہ مذہب کی۔۔۔نہ ذات کی۔

ڈھیر سارے سوال اس کے دماغ کی ٹہنیوں سے سوکھے پتوں کی مانند جھڑ کر اس کے وجود کے اطراف کوڑے کرکٹ کی شکل اختیار کرنے لگے۔

شام کو دکان بڑھانے کے بعد حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ آج کاروبار بہت مندہ رہا۔ کاروبار مندہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نعروں کا کمبھ کرن تو اوگھ رہا تھا مگر معاشرتی زندگی ابھی اپنے پرانے ڈھرے پر نہیں آئی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ کہ آج اس کی صدا میں پہلے جیسا نہ سوز تھا نہ لے۔ کیونکہ وہ سوالوں کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تلے دبا ہوا گھٹن سی محسوس کر رہا تھا۔

رات کے گیارہ ساڑے گیارہ بجے کے قریب کا وقت تھا۔ کوئی اِکا دُکا سواری یا انسان کبھی کہیں نظر آ جاتا تھا۔ ورنہ سڑکیں سنسان تھیں۔ موسم سرما کے خیر مقدم میں شہر پر قہر بھرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوائیں بھی تیزی سے بھاگ دوڑ کر رہی تھیں۔ موسم کے بدلتے تیور کی پروا کیے بغیر وہ ابھی تک گلی کوچوں میں بھٹک رہا تھا ورنہ عموماً آٹھ بجے تک وہ اپنی جھونپڑی پر لوٹ آتا تھا۔ آج اس کا جی ابھی گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر بیساکھیوں کے سہارے بھٹک بھٹک کر اس کے کندھوں میں درد کی ٹیس اٹھنے لگی تھی۔ یوں تھک کر چور ہو رہا تھا۔ ذہن جیسے سن ہو گیا تھا۔

گھر جانے کے لیے وہ ایک گلی میں مڑا۔ گلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راستے کے بلب بھی کہرے کی چادر اوڑھے بجھے بجھے سے نظر آ رہے تھے۔ اس کی بیساکھیاں اور سناٹے میں خلل ڈال رہی تھیں۔ ذہنی تناؤ کے سبب وہ بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ سے خوفزدہ ہو رہا تھا کہ اتنے میں کسی بچے کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس نے راحت سی محسوس کی کہ سناٹے کی دھرتی پر کوئی انسانی آواز تو پھوٹ نکلی۔

وہ جیسے جیسے آگے بڑھا بچے کے رونے کی آواز قریب ہوتی چلی گئی۔ آواز بالکل اس کے قریب آ گئی تو وہ رکا مگر اسے بچہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پلکوں پر پھیلے شبنم کے قطروں کو اس نے آستین سے پونچھا۔ پلکیں پھڑپھڑائیں اور کہر آلود موسم میں روتے ہوئے بچے کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔

جب اسے بچہ نظر نہیں آیا تو اس کے رونے کی آواز کا سرا تھاما اور اس کے سہارے آگے بڑھا۔ آواز کی ڈور اسے میونسپلٹی کے کچرے دان کے پاس لے گئی۔ اس نے کچرے دان میں جھانکا۔ اندھے کنوئیں جیسے ڈبے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے جھٹ سے دیا سلائی جلائی تو اس نے دیکھا کپڑے میں لپٹا ہوا ایک نومولود بچہ رو رہا تھا۔ اس نے جلتی دیا سلائی کو ایک طرف پھینکا اور بچے کو اٹھا لیا۔ انسان کے لمس کو پا کر بچہ چپ ہو گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا گلی سنسان تھی۔ مکانوں کے دریچوں اور دروازوں پر نگاہ کی تو گلی کا ہر مکان گھوڑے کی طرح کھڑا اونگتا نظر آیا۔ یک بہ یک اس کے ذہن پر خوف طاری ہو گیا۔ اسے ڈر محسوس ہوا کہ اگر کسی نے مجھے اس بچے کے ساتھ دیکھ لیا تو میرا شمار بچہ چرانے والوں میں کیا جائے گا اور میں مفلس خواہ مخواہ مارا جاؤں گا۔ ڈر کے مارے اس کے دل میں آیا کہ بچے کو واپس اس سیاہ غار میں رکھ کر چلتا بنے مگر اس بے نور روشنی میں بچے کا معصوم چہرہ دیکھ کر وہ جلاد بننے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا کر دھیرے دھیرے قدم بڑھائے اور سامنے کی دکان کے زینے پر بیٹھ گیا اس انتظار میں کہ بچے کو لینے کے لیے شاید کوئی آ جائے۔ مگر اسے کیا معلوم کہ کسی ناکارہ، غیر ضروری چیز کو کچرے دان میں پھینکنے کے بعد اسے واپس لینے کبھی کوئی نہیں آتا۔

رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بچے کو ساتھ لا کر اس نے صحیح کام کیا یا غلط؟ آنے کے بعد جب اسے معلوم ہوا کہ نوزائیدہ لڑکی ہے تو وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ لڑکی کو پال پوس کر بڑا کرنے کی ذمہ داریوں پر سوچتے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر صبح ہوتے ہی اڑوس، پڑوس کے لوگ پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گا کہ یہ لڑکی کس کی ہے؟

گھر آتے ہی اس نے ذرا سا پانی ملا کر بچی کو چمچ سے تھوڑا دودھ پلا رہا تھا اس لیے وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ مسلسل سوچ کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس نے بچی کو اپنے قریب کر لیا اور چادر اوڑھی تو اسے خیال آیا کہ رات میں کروٹ لیتے وقت کہیں بچی دب نہ جائے اس کے دل میں ممتا کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے بچی کے سر کو دھیرے دھیرے سہلانا شروع کیا۔ چاندنی کی کرنوں سے ملائم بالوں کا لمس پاتے ہی یک لخت اسے محسوس ہوا کہ۔۔۔اسے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے۔

جواب۔۔۔مذہب کا۔۔۔ذات کا۔۔۔نعرے کا۔۔۔

اسے اپنی گمشدہ پہچان مل گئی۔۔۔اسے معلوم ہو گیا۔۔۔وہ صرف انسان ہے۔

دوسرے دن علی الصباح اس نے اس بچی کو اپنے جھولے میں ڈالا اور چل دیا۔ رات سوتے وقت ہی اس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ اس بستی میں نہیں رہے گا۔

گھومتے گھامتے آخر کار دوپہر تک اسے ایک جھگی جمنا کنارے کی بستی میں کرائے پر مل گئی۔ بچی کے ساتھ اُسے نئی زندگی جینی تھی۔ بستی کے لوگوں سے اس نے کہا کہ۔۔۔چار دن پہلے غازی آباد میں اس کی بیوی بچی کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ غازی آباد میں جی نہ لگا تو وہاں سے اُٹھ کر دہلی چلا آیا۔

ان شب و روز کو یاد کرتا ہوا جو سولہ سال بیت چکے تھے اُن کی جگالی کرتا وہ چاندنی چوک کی بھیڑ میں فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں جذبات کا سمندر آ رہا تھا جس میں غصہ بھی تھا، خوف بھی۔ جس میں نفرت کا زہر بھی تھا، ممتا کی سیپیوں میں اشکوں کے موتی بھی۔ انتقام کی اٹھتی ہوئی لہریں بھی تھیں اور انسان دوستی کا پھیلا ہوا ساحل بھی۔

بھیڑ سے اپنے اپاہج جسم کو بچاتے ہوئے جب وہ گردوارہ سیس گنج

صاحب کے سامنے پہنچا تو اس کے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ اس نے نظریں اُٹھا کر گردوارہ صاحب کے دروازے کو دیکھا پھر دل ہی دل میں بولا۔۔۔ واہے گُرو، تیرا نام بھی میں نے بھُنا کر کھایا ہے۔۔۔ پیٹ کے لیے اب ایسا نہیں کروں گا۔

فٹ پاتھ کے کنارے بیساکھیاں رکھ کر، کندھے سے جھولا اُتارا اور راستے کی جانب رُخ کر کے بیٹھ گیا۔ جھولے سے بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی نکال کر بیڑی سلگائی نہیں کہ گردوارے کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھا ہوا دربارا بھاگتا ہوا آ کر بولا۔۔۔ اوئے منگو تو اِتھے کی کرداں ہے!

دیا سلائی جلانے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ اُٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ اس نے اپنی پشت پر دھیرے سے جھکے ہوئے دربارا کو دیکھا۔ چند لمحوں کی خاموشی بھی دربارا کو کھلی، بولا۔۔۔ یہ علاقہ میرا ہے۔ تو اِتھے کیوں۔۔۔

بھائی دربارا، میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ جی چاہا کہ بیڑی پی لوں۔

یہ گل ہے تو چنگا ہے۔۔۔

دربارا نے مڑ کر دیکھا۔ لوگوں کا ایک ہجوم گردوارے کی سیڑھیوں کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ منگو کو اس حال پر چھوڑ کر بھاگا۔

بیڑی کا کش لیتے ہوئے وہ سوچنے لگا ان کئی سالوں میں کیا کیا جھیلا ہے اس نے۔ کتنی خوشیاں، کتنی پریشانیاں، کتنے غم اور آخر کار اس کا انجام کیا ہوا؟ آج اس کا اپنا کوئی نہیں رہا۔

پھر وہی لاوارث پن۔۔۔ وہی آوارگی۔۔۔ نہ کوئی ٹھور۔۔۔ نہ کوئی ٹھکانا۔۔۔ نہ سنگی۔۔۔ نہ ساتھی۔۔۔ پہچان کا ایک پیمانہ بنا تھا وہ بھی چکنا چور ہو گیا۔

سترہ سال پہلے جمنا کنارے اس نے اس لاوارث بچی کے ساتھ نئی زندگی کا ڈیرہ ڈالا تھا۔ اس بچی نے اسے ایک پہچان دی تھی اور اس نے اس کو اپنی مفلسی کا وارث بنا کر ایک نام دیا تھا۔۔۔ مُنّی۔

مُنّی کے وجود نے مفلسی میں بھی اس کا خوش گوار زندگی سے تعارف کروایا۔ اس کی صداؤں میں مٹھاس بھری لے پیدا کر دی۔ اپاہج پن کے باوجود بھی اس میں زندگی کو سرخرو ہو کر جینے کی للک پیدا کی۔ اس نے بھی مُنّی کا بچپن جھیلا، اس کے لڑکپن کو اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر گھوڑا بنا اور اس کی جوانی کی پہرے داری کی۔ زندگی جمنا کی لہروں کے مانند بہتی ہوئی اسے ایسے مقام پر لے آئی جہاں پہنچنے پر ہر دریا اپنے کناروں کو الوداع کہہ کر اپنی نئی پہچان کی آغوش میں سما جاتا ہے۔

مُنّی کی جوانی پر پہرا دیتے ہوئے اسے دیکھ کر بستی کے ایک بزرگ نے ایک دن کہا۔۔۔ بیٹی کی جوانی پر کب تک پہرا دیتے رہو گے؟ بزرگ کی بات سُن کر اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ وہ بار بار اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا رہا کہ اسے آج تک یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ مُنّی اب بڑی ہو گئی ہے۔

اسے وہ خیال کیسے آتا؟۔۔۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ خود کب بڑا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی علم نہیں کہ انسان کے بالغ ہوتے ہی اسے جنسِ مخالف کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔۔۔

اپنے ماضی کی جگالی کرتے ہوئے وہ تب چونکا جب کسی راہ چلنے والے کی ٹھوکر اسے لگی۔ اس نے دیکھا گردوارا صاحب کے سامنے بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا۔ اس نے بیساکھیاں اُٹھا کر اُٹھنا چاہا تو دیکھا کہ اس کے سامنے چند سکے بکھرے پڑے ہیں۔ اس نے اٹھتے ہوئے دربارا کو پکارا۔۔۔ اُوئے دربارے۔۔۔

دربارا نے کاروبار سے توجہ ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔

لے، اُٹھا لے، ترے علاقے کے پیسے ہیں۔ کوئی سخی داتا دے گیا ہے۔۔۔ وہ دربارے کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی روانہ ہو گیا۔

جسم سے روح الگ ہو جائے۔۔۔ دل سے دھڑکن بچھڑ جائے۔۔۔ زندگی سے مقصد جدا ہو جائے، تو۔۔۔ لاوارث سانسوں کا بوجھ اُٹھانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ چل پڑا۔ اس کے ہم قدم ہو کر یادیں بھی چل پڑیں۔

بزرگ کی بات سُن کر اس نے اسے گرہ میں باندھ لی۔ اب وہ مُنّی کے لیے کوئی لڑکا ڈھونڈ کر اس کی شادی کر دے گا۔

اس نے فیصلہ تو کر لیا مگر ذہن و دل میں جنگ چھڑ گئی۔ جسم و جاں میں ایک تضاد پیدا ہو گیا۔ وہ دستورِ جہاں کی سوچنے لگا۔۔۔ دل دھڑکنوں کی جدائی سے گھبرانے لگا۔۔۔ جسم عادتوں سے مجبور۔۔۔ جاں روایتوں سے لاچار۔۔۔

کش مکش کے بھنور میں پھنسے رہنے کے باوجود بھی کچھ دنوں میں ہی اس نے لڑکا ڈھونڈ نکالا۔ لڑکا اسے پسند تھا۔ جوان تھا، ہم پیشہ تھا، آواز میں سوز تھا، صدا بھی بڑھیا لگاتا تھا۔ آمدنی بھی اچھی تھی کیونکہ خاندان میں اس کا باپ، ماں، بہن بھی بھیک مانگتے تھے۔ اسے یقین ہو گیا مُنّی اس گھر میں راج کرے گی۔

شادی طے ہوئی تو اس گھر کی کمائی جو اس نے ٹھیلے والوں اور چھوٹے دکان داروں کے پاس سود پر چڑھا رکھی تھی جمع کر کے گھر لے آیا۔ پانچ پانچ دس دس پیسے کر کے جوڑی پونجی، روپوں کی شکل میں خرچ ہونے لگی۔ دو ہزار مُنّی کو یہ کہتے ہوئے دئے کہ یہ روپے اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھنا وقت بے وقت تیرے کام آئیں گے۔

شادی کے روز گھر کے سامنے چھوٹا شامیانہ بھی ڈلوایا پندرہ روپے خرچ کر کے کہیں سے شہنائی بجانے والے کو پکڑ لایا۔ پوری بستی شہنائی کی بے سُری آواز پر جھومنے لگی۔ منگو کے پاؤں دھرتی پر ٹک نہیں رہے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے مُنّی کے اصرار پر نئے کپڑے پہنے تھے۔

بارات آ گئی۔ دوڑ بڑھ گئی۔ اتنے میں ایک لڑکا اس کے پاس آ کر بولا۔۔۔ جمیل چاچا تمہیں بلا رہے ہیں۔

کہاں؟

اپنے گھر میں۔

وہ کچھ لینے کے لیے پورن کے گھر کی طرف جانے کی بجائے جمیل چاچا کے گھر کی طرف مڑا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ چاچا ابھی کچھ دیر پہلے تو بارات کا سواگت کر کے منڈپ میں تھے اب مجھے اپنے گھر کیوں بلایا ہے!

وہ جب جمیل چاچا کی جھونپڑی کے پاس پہنچا تو اندر کچھ بحث چل رہی تھی۔ وہ جھونپڑی میں داخل ہوا تو سناٹا چھا گیا۔ اس نے دیکھا اندر سات آٹھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

آؤ منکو۔۔۔ جمیل چاچا نے کہا۔

اس کے بیٹھنے کے بعد بھی سناٹا طاری رہا تو اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سب کی جانب باری باری دیکھا اور پھر چاچا کے چہرے پر سوالیہ نظریں جما دیں۔

بھائی منکو، تمہارا داماد کچھ کہنا چاہتا ہے۔

منکو نے داماد کی طرف دیکھا تو داماد نے اپنے باپ کی جانب۔ منکو مسکرایا اور بولا۔۔۔

کیا بات ہے؟

داماد نے تھوک نگلا۔ ایک مرتبہ باپ کو دیکھا اور بولا۔۔۔

دیکھو تم نے شادی کی بات کی، میں نے ہاں کر دی۔

ہاں، ٹھیک ہے۔

ہم بارات لے کر شادی کرنے بھی چلے آئے۔

اتنا کہتے کہتے لڑکے کا سانس پھول گیا۔ اس نے اپنے باپ کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ بس باپو، اب آگے تم کہو۔

جھٹ سے لڑکے کا باپ بولا۔

مگر تم نے ابھی تک لین دین کی بات نہیں کی۔

منکو کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ مگر اس نے اپنے دل کی بات چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دی اس نے سوچا۔۔۔ آخر ہے تو بھکاری مانگ کر کتنا مانگے گا۔۔۔ لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ سب کی نظریں جیب میں رکھے اس کے ہاتھ پر لگی ہوئی تھیں۔ جس انداز سے وہ منّی کی شادی پر خرچ کر رہا تھا اس مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر شخص سمجھ رہا تھا کہ منکو ابھی طیش میں آ کر نوٹوں کا پلندا لونڈے کے منہ پر دے مارے گا۔

جیب میں جاتے ہی منکو کو اتنا تو معلوم ہو گیا کہ جیب میں اتنی رقم نہیں بچی کہ اس کی مانگ کے بارے میں پوچھے، پھر بھی وہ پریشان نہیں ہوا۔ اس نے جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ بیڑی سلگائی، بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیا سمدھی کے سامنے رکھی اور پوچھا کیا چاہیے؟

ہمیں پیسے نہیں چاہیے۔

منکو اُلجھن میں پڑ گیا۔ اس نے جمیل چاچا کی جانب دیکھا وہ بھی پریشان نظر آئے۔

تو؟ ریڈیو، ٹی وی!۔۔۔ منکو نے سوال کیا۔

سمدھی نے ذرا اکڑ کر کہا۔۔۔

اگر تم اپنی بیٹی کی شادی میرے جھگو سے کرنا چاہتے ہو تو تمہیں ایک چیز تو دینی ہی ہو گی۔

چیز کا نام بتاؤ۔۔۔ میں دوں گا۔

اگر تم اپنی بات سے بدل گئے تو میں بارات واپس لے جاؤں گا۔

باپ کی بات سن کر بیٹے کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

میں نے کہا۔۔۔ میں دوں گا۔

جمیل چاچا سے اب چپ نہ رہا گیا۔۔۔ اگر اس کے پاس وہ چیز ہو گی تو دے گا۔ انشاء اللہ ضرور دے گا۔

وہ چیز اس کے پاس ہے۔

تم نام بتاؤ۔۔۔ منکو نے بے قراری سے پوچھا۔

وہ زمین کا ٹکڑا۔۔۔ جہاں تم بیٹھ کر بھیک مانگتے ہو۔

یہ سُن کر منکو کو یوں محسوس ہوا جیسے سمدھی نے اپنی مانگ نہیں رکھی بلکہ تیز چاقو اس کے پیٹ میں اُتار دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا۔

کیا مطلب؟ اجمل چاچا نے سوال کیا۔

کل سے میرا بیٹا وہاں بیٹھ کر بھیک مانگے گا۔ منکو دوسری جگہ ڈھونڈے۔ وہاں موجود ہر شخص پریشان ہو گیا۔۔۔ سب کو یقین تھا منکو نہیں مانے گا۔۔۔ بارات واپس جائے گی۔۔۔

منکو نے ایک جھٹکے کے ساتھ سمدھی کے مانگ کا چاقو پیٹ سے کھینچ نکالا۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ سب کے کانوں نے سنا:

ٹھیک ہے۔۔۔ دیا میں نے۔

''آخری خواہش''

چھے بیٹیاں، بیس پوتے پوتیاں، اٹھائیں پڑپوتے پڑپوتیاں کی حامل مانچسٹر سے تعلق رکھنے والی ترانوے سالہ جوزی برڈس برطانوی خاتون نے تمام زندگی امن، آتشی اور بھائی چارے کے زریں اصولوں پر گزار کر آخری خواہش کے طور پر جیل جانے کی تمنا کی۔ مانچسٹر پولیس نے خاتون کی خواہش کے احترام میں اُن پر ایک فرضی چوری کا کیس ڈال کر اُسی طرح تفتیش کی جس طرح کسی پیشہ ور مجرم سے کی جاتی ہے۔ واپسی پر معمر جوزی برڈس نے اس تجربے کو خوشگوار بتلاتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا۔

''اونچے نیچے لوگ''

عذرا اصغر
(بہاولپور)

میرے گھر کے سامنے ایک میدان ہے۔شام کو اس میدان میں محلے کے لڑکے اکٹھے ہو کر فٹ بال یا کرکٹ کھیلتے ہیں۔سنا ہے کسی زمانے میں اس قسم کے میدانوں میں لوگ کبڈی کھیلا کرتے تھے۔کشتی لڑا کرتے تھے مگر اب ترقی یافتہ قوموں کے نوجوان کرکٹ اور فٹبال کھیلتے ہیں کہ کبڈی اور کشتی غیر مہذب کھیل ہونے کی دلیل ہے۔البتہ فری اسٹائل باکسنگ انتہائی مذہب قوم کا کھیل ہے۔مگر ابھی ہم مکمل طور پر ترقی یافتہ نہیں ہوئے اس لیے کرکٹ اور فٹ بال ہی کھیلتے ہیں۔میرے گھر کے سامنے والے میدان میں دن بھر گائے بھینسیں چرتی پھرتی ہیں اور ان کے چرواہے کبھی کسی گھر کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے بڑی خاموشی سے بھینسوں کو گھاس پھوس چرتے دیکھتے رہتے ہیں یا لاٹھی کا سہارا لے کر بُت بنے کھڑے رہتے ہیں۔جانے وہ کیا سوچتے ہیں مگر میں انہیں اس طرح چپ چاپ لاٹھی ٹیکے کھڑا دیکھ کر یہ ضرور سوچتی ہوں کہ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔گھر کے مختلف کام کرتے ہوئے متعدد بار میں گھر کے اس حصے کے سامنے سے گزرتی ہوں جہاں سے یہ میدان صاف نظر آتا ہے۔جب دھوپ کے سائے لمبے ہونے لگتے ہیں تو چرواہے اپنی گائے بھینسیں لے کر کہیں اور چلے جاتے ہیں اور محلے کے لڑکے بالے میدان پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ہر روز یونہی ہوتا ہے مگر ادھر کچھ دن سے اس میدان میں خانہ بدوش لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔میدان کے ایک کونے میں کئی میلے اور پھٹے ہوئے خیمے کھڑے ہیں اور ان میں عورتیں، بچے، گدھے اور بکریاں ایک ساتھ رہتے ہیں۔مرد بھی ہوں گے مگر وہ شاید جلد ہی گھر سے نکل جاتے ہیں۔اس لیے میں کبھی ان کو نہ دیکھ سکی۔عورتیں بھی تمام دن گھر سے باہر ہی رہتی ہیں مگر وہ اکثر نظر آتی ہیں۔کبھی اینٹوں کا چولہا بنا کر اس پر کچھ پکاتی ہوئی کبھی ادھر اُدھر سے چھوٹی موٹی لکڑیاں چنتی ہوئی۔اور کبھی بستی کے دروازوں پر کھڑی خیرات مانگتی ہوئی۔دن بھر بس بچے ہی نظر آتے ہیں۔ایک آدھ پلنگ جو خیمے کے اندر یا باہر بچھا ہوتا ہے اس پر لوٹتے ہوئے یا ننگی زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھے، بسورتے ہوئے ننگے جسم اور بھوکے پیٹ کے ساتھ۔

خیمے لگ جانے سے میدان میں ہر وقت رونق رہنے لگی ہے۔چرواہے اب خالی الذہن دیواروں کے سائے میں کھڑے اونگھنے کے بجائے دلچسپی سے خیموں کے اندر یا باہر عورتوں کو کام کرتے، بچوں کو چھاتی چساتے دیکھتے رہتے ہیں۔شام کو کرکٹ کھیلنے والے لڑکے کچھ زیادہ شور کرنے لگے ہیں۔وہ کبھی کبھی کوئی فلمی گانا بھی اونچی آواز میں گا لیتے ہیں۔

عورت ہونے کے ناتے میں نے بہت کم دنیا دیکھی ہے۔پھر بھی سوچتی ہوں بہت دیکھ لی۔اتنے ہونے ان ہونے دکھ، اس قدر عجیب و غریب تجربات کہ ہر تجربے کے بعد مدتوں حیرت زدہ رہی۔میں نے ہمیشہ سوچا لوگوں کو دولت سے اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟ مگر ہوتی ہے۔سب کو ہوتی ہے۔کبھی کبھی سوچتی ہوں میرے پاس بہت سے پیسے آ جائیں تو میں نادار لوگوں میں بانٹ دوں۔مگر اتنے پیسے کبھی نہ آئے کہ دل کھول کر دوسروں میں تقسیم کر سکتی۔شاید اس لیے کہ تمنا جب تک تمنا رہتی ہے بہت خوبصورت لگتی ہے۔جب پوری ہو جاتی ہے تو اپنی کشش کھو دیتی ہے۔مجھے خوبصورتی سے پیار ہے۔شاید اسی لیے تمنا کی خوبصورتی قائم رہتی ہے۔سامنے میدان میں بسیرا کرنے والے لوگوں کو دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے لیے گھر بنوا دوں۔مگر میرے گھر کے تو فرش خود ٹوٹے ہوئے ہیں اور ان ٹوٹے فرشوں کو دیکھ کر میری ایک سہیلی نے کہا تھا۔

''تم اپنے گھر کے فرش ٹھیک کیوں نہیں کراتی ہو بشریٰ؟''

میں نے اسے کچھ جواب نہیں دیا تھا۔بس ہنس کے چپ ہو رہی تھی۔میں جانتی تھی کہ اس کا بنگلہ چھ کنال پر ہے اور ماڈرن ہے اور اس کے فرش بے حد چکنے اور چھلواں ہیں کہ اس کے گھر کے رہنے والوں کا احساس بھی پھل پھل پڑتا ہے۔میرے گھر کے فرش ٹوٹے ہوئے ہیں اور میرا احساس میرے دل کی گہرائیوں میں انکار رہتا ہے۔تبھی میں چاہتی ہوں کہ خیموں میں رہنے والے خاندانوں کے لیے گھر بنا دوں۔جہاں وہ سُکھ سے رہ سکیں۔آرام سے سو سکیں اور تحفظ محسوس کر سکیں۔آرام سے تو شاید اب بھی سوتے ہیں کہ میں نے ان کی پلکوں پر کبھی نیند کو جھلملاتے نہیں دیکھا جبکہ میری سہیلی کی پلکیں ہمیشہ نیند سے بوجھل رہتی ہیں۔وہ کہتی ہے میں کئی کئی گولیاں کھاتی ہوں مگر نیند پھر بھی نہیں آتی۔یہ سچ ہے نیند اور دولت کا ازلی بیر ہے۔دولت آتی ہے تو نیند اُڑ جاتی ہے۔جن کو نیند آتی ہے ان کے پاس دولت نہیں آتی۔میں اپنے گھر کے ٹوٹے فرش پر پیر پسار کے خوب مزے سے سوتی ہوں۔مگر میری سہیلی کے گھر کے فرش چھلواں اور چکنے ہیں۔اس لیے اس کی نیند بھی پھل جاتی ہے وہ خیموں میں رہنے والوں سے نفرت کرتی ہے۔کہتی ہے یہ گندے غلیظ لوگ ہیں مگر میں ان کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ان کے مسائل معلوم کرنا چاہتی ہوں مگر میں عورت ہوں نا۔ایک متوسط گھرانے کی عورت۔ہم درمیانہ درجے کے لوگوں کو اپنی عزت بہت پیاری ہوتی ہے۔ہماری عزت کانچ کے برتن کی طرح بہت نازک ہوتی ہے جسے اپنے سے نچلے طبقے کے ساتھ مراسم پیدا کرنے سے ٹوٹ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے لیکن جو چھ کنال کے بنگلوں میں بسنے والوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے پر اور بھی مضبوط ہوتی ہے جبکہ احساس کرچی کرچی ہو جاتا ہے مگر عزت قائم رہتی ہے۔یہ اس دنیا کا اصول ہے۔خیمہ میں رہنے والی سکینہ شاید اسی لیے مجھ سے تعلقات بڑھانا چاہتی ہے کہ اس کی عزت کو سہارا ملے۔میرے گھر کے ٹوٹے فرشوں کے باوجود وہ مجھے بڑی عورت سمجھتی ہے اور بیگم صاحب کہتی ہے۔میں نے کئی مرتبہ اسے کہا کہ میرا نام بیگم صاحب نہیں بشریٰ ہے مگر وہ سنتی ہی نہیں اور بیگم صاحب ہی کہتی ہے۔شاید وہ اس لیے ایسا کرتی ہے کہ میرا ایک گھر ہے۔اینٹ اور سیمنٹ کا بنا ہوا گھر۔اور وہ کھلے میدان میں پھٹے خیمے میں رہتی

ہے۔اس کا خاوند دن بھر مزدوری کرتا ہے اور وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کے جھوٹے برتن مانجھتی ہے۔ان کے میلے کپڑے دھوتی ہے۔ان کی خدمت کرتی ہے اور اس کے بدلے میں ان کا بچا کھچا جھوٹا کھانا کھاتی ہے اور کھلے خیمے میں بیٹھ کر اپنے نوزائیدہ بچے کو اپنی تجلبجی خشک چھاتی چساتی ہے۔ایک دن میں نے دیکھا میرے ہمسائے کا خانسامہ گرم گرم چاولوں کی پلیٹ لے کر سکینہ کے خیمے میں گیا ہے اور بہت دیر تک اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا ہے پھر ادھر اُدھر دیکھتا دبے پاؤں نکل کر اپنی لمبی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گیا ہے۔ پھر یہ معمول بن گیا وہ روز کچھ نہ کچھ چیز لے کر سکینہ کے خیمے میں جانے لگا اور روز اسے گرم گرم تازہ کھانا کھلانے لگا اور رفتہ رفتہ سکینہ کی سوکھی چھاتیاں بھرنے لگیں اور ان میں سے گرم گرم دودھ کی دھاریں نکلنے لگیں اور رفتہ رفتہ سکینہ کا بچہ بڑھنے لگا اور سکینہ کا رنگ روپ نکھرنے لگا اور اس کے کپڑے صاف رہنے لگے اور سکینہ نے بڑے گھروں کے جھوٹے برتن مانجھنا چھوڑ دئے اور ہر وقت کھاٹ پر پڑی رہنے لگی۔ پھر اس کے پیٹ کا حجم بڑھنے لگا اور اس کے گالوں پر چکنائی آ گئی۔ایک دن میں نے اس سے کہا۔

''سکینہ ابھی تو تیرا بچہ بہت چھوٹا ہے اور تو پھر۔۔۔۔؟''

اس نے شرما کر چہرہ اپنے ملگجے دوپٹے میں چھپا لیا اور ہنس کر بولی۔

''بیگم صاحب جی! آنے والا جی تو آ کے رہتا ہے نا۔''

اور پھر ایک صبح میں اٹھی تو میدان خالی پڑا تھا اور گائے بھینس بڑی خاموشی سے گھاس پھوس چر رہی تھیں اور ایک چرواہا لاٹھی ٹیکے چپ چاپ کھڑا خالی جگہ کو تک رہا تھا جہاں کل تک ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی۔ کچھ خیمے تھے کچھ گدھے اور بکریاں تھیں۔ روتے بسورتے ننگے بچے تھے اور سکینہ تھی۔ میں سوچتی ہوں اگر میرے پاس کچھ پیسے ہوتے اور میں سکینہ کو ایک گھر بنا کے دے سکتی تو سکینہ ایک چہاردیواری میں مقید ہو کر رہ جاتی۔اور دنیا دیکھنے کی حسرت اس کے دل کو حساس بنا دیتی اور گرم چاولوں کی محض ایک پلیٹ یومیہ اس کے گالوں کو گلال نہ بناتی اور قدرت کی تخلیق کاری کو ''فیملی پلاننگ'' کی مدد سے روکتی اور سونے کے لیے اسے نیند کی درجنوں گولیاں کھانا پڑتیں۔اسے بڑے اور چھوٹے گھر کے طعنے ہنس ہنس کے سہنے پڑتے اور پھلواں اور ٹوٹے فرش کا فرق سدا اس کے حساس دل کو ملتا رہتا اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میرے پاس بہت سے پیسے نہ ہوئے۔اس سے دنیا میں بہت سی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ سکینہ اپنا خیمہ اٹھا کر کہیں اور چلی گئی ورنہ اسے مکان بنا کر دینے کی تمنا مجھے بے چین کیے رکھتی اور میرے پاس ایسا ذریعہ نہیں تھا مجھے کوئی ایسا طریقہ معلوم نہیں تھا جس سے مجھے اتنا فاضل پیسہ ملتا کہ میں سکینہ کو گھر بنا کر دے سکتی۔ میں تو آج تک اپنے لیے گھر نہ بنا سکی اور کرائے کے ٹوٹے فرش والے مکان میں رہتی ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے صرف وہ آنکھ ہے جو ضمیر کے اندھے کنوئیں میں جھانک لیتی ہے۔جو کسی سے گرم چاولوں کی پلیٹ لے کر کھانے سے روکتی ہے اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میرے پاس پیسوں کی کمی ہے ورنہ دنیا میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

بقیہ :بامشقت

چوٹ وحید نے اُس کی روح پر لگا دی۔وہ برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ وحید کام نپٹا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ ہوش میں آ کر مریم نے بچوں کو سنبھالا جو روئے جا رہے تھے اور محلے کی عورتیں اُن کو بہلا رہی تھیں۔اُس نے جیسے تیسے بچوں کے لیے کچھ بنایا اور ساری رات بت بنی بیٹھی رہی۔ اگلی صبح اپنے اور بچوں کے کپڑے پیک کر کے گھر کی چابی پڑوسیوں کو دے کر اپنے مائیکے چلی گئی۔ مریم کے ابّو تو عرصہ ہوا گزر گئے تھے۔ ماں اُس کے اکلوتے بھائی کے سہارے زندگی کاٹ رہی تھی۔ بھابھی بظاہر تو بہت پیار اور اپنے پن سے بات کرتی تھی مگر تھی بہت زہریلی عورت۔ مریم کو تو وہ برداشت ہی نہیں کرتی تھی۔ بھائی اُس سے پیار کرتا تھا مگر وہ زن مرید تھا۔اُس نے مریم سے سارا قصہ سنا تو وہ تڑپ اُٹھا۔مریم ٹوٹ کر بکھر چکی تھی اُسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔وہ جھوٹے الزام کی تپش سے پگھلی جا رہی تھی۔ بھائی جو بینک میں ملازم تھا اپنے ایک وکیل دوست کی مدد سے اُس نے مریم سے قانونی کارروائی شروع کروا دی۔ وہ بار بار کہتا رہا کہ دیدی طلاق تو ہوئی ہی نہیں، طلاق تو تین مہینے میں تین بار ہوتی ہے۔ وہ اس وہم میں رہی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا وہ اب بھی وحید کی بیوی ہی ہے۔ مقدمہ چلا محلّہ والوں نے تین طلاق کی گواہیاں دے دیں اور یہ بھی کہا کہ اُن کے سامنے وحید نے مریم کی پٹائی بھی کی۔ آخر کار مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ عدالت نے وحید کو تین سال قید کی سزا سنا دی اور مریم کو بچوں کو لے کر وحید کے گھر جانے کی صلاح دی کیونکہ طلاق ہوئی ہی نہ تھی۔ فیصلے کے بعد بھابی نے اُسے زیادہ دن اپنے گھر ٹکنے نہ دیا۔ چار و ناچار مریم کو اپنے گھر لوٹنا پڑا۔

مریم پریشان تھی کہ آج رات تو پچھلے سال کی ہولناکیاں اُس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھیں۔اُس کا گلا خشک ہونے لگا اُس نے اُٹھ کر پانی پیا اور چارپائی پر بیٹھ کر ببّو پر دائیں ہاتھ سے پنکھا کرنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ وحید تو سال بھر میں جیل کے ماحول سے سمجھوتہ کر چکا، دن بھر کام کرتا ہے، سادہ پہنتا ہے، سادہ کھاتا ہے، سو جاتا ہے۔اُس کے مقابلے میں اُسے آٹھ نو گھنٹے فیکٹری میں محنت کرنا پڑتی ہے۔اس کے علاوہ گھر آ کر کھانا بنانا، بچوں کا ہوم ورک دیکھنا، گھر کی صفائی، کپڑوں کی دھلائی، پھر اُن کو پریس اور دیگر کام کرنے پڑتے ہیں۔ اس ساری مشقت کے ساتھ ساتھ اُسے سماج کے ان بھوکے بھیڑیوں سے اپنے آپ کو بچانا۔ کس قدر محنت اور جدوجہد سے بھری ہے اُس کی زندگی۔ قانون نے آنکھیں بند کر کے تین طلاق دینے کی سزا اُس کے شوہر کو نہیں بلکہ اُسے دی ہے وہ بھی۔۔۔بامشقت۔

بازارکابُت

طاہرہ اقبال
(فیصل آباد)

وہ نکلتا تو روز ہی تھا لیکن ہر روز اُس کے نکلنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے بازار کو یوں اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی جیسے یہ آگ پہلی اور آخر بار لگی ہو۔ پورا بازار ہیجان بھرے دھک دھک کرتے ایک بڑے سے دل میں تبدیل ہو جاتا جس میں بے شمار دھڑکنیں بجتیں جیسے بازار کے وسط میں نصب سینما سکرین پر کوئی آئٹم سانگ چل رہا ہو اور سبھی نگاہیں گزروں گزروں اُس میں دھنسی ہوں۔

نوعمر سیلز مینوں کے دل جیسے سینوں سے نکال کر چہروں پر گاڑ دیئے گئے ہوں۔ گردشِ خون کی رفتار اتنی تیز ہوگئی ہو کہ ان دلوں کو منوں منہ لہو پمپ کرنے کی اضافی مشقت کرنا پڑ رہی ہو، اسی لیے گل دم کی پشت جیسے سُرخ انگارہ چہروں پر تپتی ہوئی ہونٹوں کی دو گرم سلاخیں گڑھی ہوں۔ سیاہ جین کے اُوپر ٹماٹر رنگ کی کھلے گلے والی ٹاپ جس میں سے شفاف عنابی گلابی قمقمے سی جلد جھلملاتی۔ پتہ نہیں وہ تھریڈنگ کرواتا تھا کہ ویکسنگ کہ اُس بت کی گھڑت ہی قدرت نے ایسی ملائم ایسی شفاف بنا دی تھی کہ اُنگلیاں چھو لینے کی اضطراری حالت میں مڑنے اور اینٹھنے لگتیں۔ گردن سے اُٹھا کر بنایا ہوا پونی ٹیل کندھوں کی چکنی ڈھلانی سطح جیسے کسی مرمریں دیوی کے شانوں سے پھسلتی موتیوں بھری آبشاریں۔

ترشی ہوئی کمان بھنویں، لمبی سایہ دار پلکوں میں جگمگتے روشن سیاہ جگنو صراحی دار شفاف گردن سے لپٹی سفید پرلز کی لڑی جیسے پورے وجود پر سہ طرفی آئینے جڑے ہوں آر پار سب دِکھتا ہو۔ یہ شیش محل جدھر سے جھلک دِکھلا جاتا آنکھوں کے دِیئے دماغ کی جمالیاتی حسیات کو کچھ یوں بھڑکا دیتے کہ پھر سے دیکھنے کی تمنا اُس کے پیچھے پیچھے دید کی سوالی بن کر چل نکلتی۔ مجمع جلوس کی شکل اختیار کر لیتا اور جو نکل نہ پاتے وہ تخمینے لگاتے رہ جاتے۔

آج شام کو وہ سکنی جین پر ستاروں جڑا سیاہ کوٹ پہنے نکلے گا۔ آج وہ ترک لمبی پونی ٹیل کو ست رنگ موتیوں سے سجائے گا جن میں بازار والوں کی ہزار ہزار زاویے سے رال ٹپکاتی شبیہیں جھلکیں گی۔ آج وہ پنک کیپری پر نیلے جارجیٹ کی شرٹ پہنے گا جس میں بدن کی آتش بھڑک اُٹھے گی جیسے گلاب کی پیالی میں شبنم جو پیاسے لبوں پر تھور کا نمک اُگا دے گی۔ آج وہ اُونچی ہیل والا سُرخ سینڈل پہنے نکلے گا جس کی پینسل ہیل بازار میں بچھے دھک دھک دلوں کو ٹک ٹک چھیدتی گزر جائے گی۔ کترنیں اور سوراخ دار پسلیاں بچی رہ جائیں گی۔ وہ جو رنگ پہنتا پورا بازار اُس رنگ میں رنگ جاتا جیسے رنگ ساز مختلف رنگوں کے کڑاہے دہکائے بیٹھے ہوں اور ہر ہر شئے کو اُسی رنگ میں بھگو دیتے ہوں جو اُس روز اُس بت کے پیراہن کا رنگ ہوتا۔ صبح گلابی تو شام فیروزی، دوپہر عنابی تو رات قرمزی رنگ میں ڈوب کر طلوع ہوتی پورا بازار اسی کے رنگوں میں نجانے کیسے ملبوس ہو جاتا تھا۔ سارے رنگ جیسے اسی میں سما جانے کو بے قرار ہوتے تھے کہ وہ جس رنگ کو اوڑھ لیتا وہی اپنی تابناکیاں دوچند کر لیتا اور پورا بازار اُسی رنگ میں ڈوب جاتا۔ وہ رنگوں کو اس تناسب سے استعمال کرتا کہ عام رنگ بھی خاص ہو جاتے۔ ہرا کچ، لال انگارہ، پیلا زرد، چٹا سفید، کالا سیاہ، عنابی بھڑکیلا آتش ہی آتش ہر سُو۔

یہ جنسِ نایاب سڑکوں، دُکانوں، ریستورانوں تھڑوں کو اپنے رنگ میں رنگنے لگا۔ بڑے بڑے اسٹوروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے کھوکھوں تک میں اُس کی مورتی سجنے لگی۔ پجاری تھالیاں سجائے آرتیاں اُتارنے کو بھیڑ لگانے لگے جو سبھی اُسی رنگ میں ملبوس ہوتے جو اُس روز اُس بت کی پوشاک کا رنگ ہوتا۔ جس دُکان، ریستوران یا کھوکھے پر وہ روزانہ جلوہ گر ہوتا اُس پر جتنی بھیڑ جمع ہوتی اُتنی ہی بکری بھی ہوتی۔ اُسے اپنی دُکان کی سمت راغب کرنے کو کئی اسکیمیں لڑائی گئیں۔ پیشہ ورانہ رقابت بڑھنے لگی تو تکرار سے فائرنگ تک جو ایک دو قتل ہوئے وہ بھی اُسی کے نام لگے۔ بوتیکس اُسے اپنے اپنے رنگ دینے کو رقابت میں جلنے لگے۔ پارلرز اپنے رنگوں میں اُسے سجانے کو ایک دوسرے کو مات دینے لگے۔ روز وہ اُس محل سے پیدل ہی نکلتا جس کی طویل و عریض فصیل میں تین اطراف نصب گنبدوں میں سے مرسیڈیز، فراری اور لینڈ کروزر کچھ دیر پہلے ہی نکل چکی ہوتیں اور باوردی گیٹ کیپر سیکورٹی کیمروں والے گیٹ ابھی بند ہی کر رہے ہوتے۔ شروع شروع میں یہ گارڈز اُس کے نکلنے میں مزاحم ہوتے لیکن وہ اُن پر کبھی چیختا چلاتا نہ تھا۔ عجیب راکھ میں دبی چنگاری جیسا دھیما مزاج نہ امارت کا تکبر نہ حسن کا گھمنڈ، نہ اسٹیٹس کا دھیان۔ شاید یہ سبھی محرومیاں اور برتریاں خالص جنس کی فطرت ہیں۔ ناخالص جنس تو خوشگوار مغالطے میں ہی رہ جاتی ہے، پھر شاید اُس محل کے باسی اُس کے انجام سے متفق ہو گئے کہ اب تو گارڈز بھی اُسے لذیذ نظروں سے بس گھورتے رہ جاتے۔ شہر کے مہنگے اسکول میں اُس کے کلاس فیلوز بھی اُسے ہنسی مذاق میں اُڑا اُڑا کر بور ہو گئے کہ جواباً نہ غصہ نہ احتجاج کہ طبیعتیں مچل سکیں۔ ہائی سوسائٹی کی ہر پل بدلتی تھرل اور انجوائے منٹ کے پیمانوں سے بھی باہر نکل گیا تھا کہ یہ روٹین تفریح کس قدر بورنگ۔۔۔

اب جہاں کی وہ جنس تھی اُسی بازار کے سپرد تھی، جس نے کھلی بانہوں اُسے وصول لیا تھا۔ بازار کی حوالگی کے بعد اُس کے جسم کی پوشیدگیاں زیادہ معنی خیز ہو گئیں۔ سینہ عورتوں کی ساخت اوڑھنے لگا۔ بڑھے ناخنوں والی اُنگلیوں میں عجب لچک آ گئی جیسے سبھی جوڑ کھل گئے ہوں۔ سڈول کلائی میں برسلیٹ، کان میں بُندا، کھلے گلے والی شوخ رنگ زنانہ ٹاپ ہر اُبھار ہر قوس، نفاست و نزاکت کی انتہا میں سینچی ہوئی متوسط طبقے اور امیر طبقے کی مامتا میں بھی دونوں طبقوں کے فاصلے جیسا ہی بُعد، کئی بار یہ امیر مامتا بازاریوں میں گھرے اِس بُت کو دیکھتی بھی ڈرائیور گاڑی کی رفتار کم بھی کرتا۔ میک اَپ پر پسینے کے قطرے نمودار بھی ہوتے۔

''چہارسُو''

گاڑھے میک اَپ سے بوجھل آنکھیں جھک جاتیں۔

''ڈرائیور اے سی اور گاڑی کی رفتار ذرا بڑھا دو۔''

وہ کیوں رُکیں۔ یہ بہزاد تھوڑی تھا جسے اُنھوں نے مہنگے ترین گائنی ہسپتال میں پیدا کیا تھا اور اُس کے گھڑے گھڑائے نقش ونگار کو دیکھ کر سبھی نے بیک زبان پکارا تھا۔

''بہزاد۔۔۔'' لیکن وہ تو بہزاد کا صنم ہو گیا۔ یہ بت اس بہزاد کے اندر فطرت کے کسی غیر متوازن رویے نے چھپا رکھا تھا کہ بہزاد پر صنم حاوی آ گیا۔ صنم کہ یہ شناخت بازار والوں نے اُسے دی تھی۔ بلکہ ہر بازار کی ہر گلی کا دیا ہوا اپنا اپنا نام تھا۔ گلابو، پنکی سویٹی، زری، نازو۔۔۔

کیسے شرمندہ کر دینے والے لچر نام تبھی تو پورے گھرانے نے بہزاد کے نام سے آنکھیں اور کان لپیٹ لیے تھے۔ ایسے ہی جیسے وہ کسی بھی بازاری تماشے سے منہ پھیر لیا کرتے تھے۔

وہ زیادہ لچکیلا، زیادہ شرمیلا، زیادہ نازک اندام ہوتا چلا گیا جیسے بگھی کے گھونگھٹ میں چھپی کوئی نازنین دھیرے دھیرے عیاں ہوتی چلی جا رہی ہو۔ فطرت بھی کیسی دھوکے باز اپنی منافقت میں ذومعنویت میں، دوغلے پن میں گھات لگائے دُشمن کی طرح شکار کرتی ہوئی۔ چھپ کر وار کرنے والی، جو نظر آتا ہے وہ اُچک لینے والی اور جو نظر نہیں آتا وہ ٹھونس دینے والی۔۔۔ بہزاد کے قالب میں صنم کو بھرنے والی۔ بعض اوقات قدرت بھی آسمانوں سے انسانی لطیفے ارسال کرتی ہے۔ پھبتیاں گھڑتی ہے، جنس آدمیت کے ساتھ مخول کرتی ہے۔ انسان کو خود اسی کی ہیئتِ ترکیبی کے ہاتھوں مجبور کر دیتی ہے۔ عوام الناس کی تفننِ طبع کے لیے لطیفائی رُوپ میں ڈھال دیتی ہے کہ جہاں سے گزریں پیچھے تفریحِ طبع ''اوئے اوئے'' کی بدروؤں میں انقباض کا نکاس کرتی رہے۔ یہ بھی ذہنی صحت کے لیے کتنے ضروری ہیں۔ خود کو مکمل اُتم اور باوقار کا تفاخر حاصل کرنے کے لیے یہ بگاڑ یہ کمتری کتنی ضروری یہ ناخالص جنس، انسان اور جانور کے بیچ، عورت اور مرد کے بیچ کا رُوپ۔۔۔ معاشرے کی ذہنی صحت کے لیے لطیفائی معالجہ قدرتی کلونگ۔۔۔

دودھڑ والا بچہ پنجرے میں بند جس کے دیکھنے کو ٹکٹ لگا ہوا اپنے ذرا ذرا ہاتھوں سے تماشا گاہ کی طرف راغب کرتا پچکے ہوئے چہرے اور اعضا والا بونا۔ تالیاں پیٹتا چہرہ پینٹ کیے ہوئے ناچتا گاتا وجود کی بھیک مانگتا ہوا ہیجڑا۔ ریچھ اور بکری کا تماشا، سانپ اور نیولے کا تماشا بندر اور بندریا کا تماشا اور یہ مہنگے بوتیکس اور پارلرز سے سج کر نکلتا ہوا تماشا، جس کے رنگ میں پورا بازار رنگ جاتا تھا، جیسے سمندر کے نیلگوں پانیوں میں ڈوب جاتا ہو جیسے برف کی سفید چادر کو اوڑھ لیتا ہو، جیسے سُرمئی شام کو پہن لیتا ہو۔ اتنا قیامت خیز حسن کسی عورت کو کیوں نہ ملا آج تک۔ حسن کا کوئی علیحدہ ہی پیمانہ، الگ ذائقہ الگ ہی کوئی حساب اور تناسب۔ الگ ہی عناصر اور ترکیبِ استعمال، جسے اس حسن کی چاٹ لگ گئی پھر کسی نازک اندام حسینہ میں مزا نہ رہا۔ قدرت نے منفرد وحشی لذت کے سامان کیوں بھر دیئے۔

بازاری تماشا، دودھڑ والا بچہ، ریچھ اور بکری کی دوستی، نیولے اور سانپ کی لڑائی بندر اور بندریا کا رُوٹھنا، منانا کیسے عجیب اور دلچسپ کھیل پورا بازار کھیلتا۔

اٹھارہ برس کا ہوئے اسے ایک سال گزرا لیکن اُس کا شناختی کارڈ نہ بنوایا جا سکا تھا، ورنہ جس بازار کی وہ جنس تھا اُسے اُدھر ہی دھکیل دیا جاتا۔ اُدھر امریکہ و یورپ کے بازاروں میں جہاں اس انوکھی ترکیب والی فصل کی خوب کھپت تھی، یوں یہ باعزت خاندان اس طعنے سے نجات پا سکتا تھا، وہاں جہاں وہ بزنس ٹورز لگاتے اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے بازار کھوجتے تھے، جہاں شناخت کا عمل بالکل ذاتی تھا، لیکن اُس کا بے فارم اُس کا ردتھا۔ وہ جب بھی تصویر اُتروانے جاتا، ہونٹوں پر لالی، آنکھوں پر آئی شیڈز، ترشی ہوئی بھنویں۔ ناک میں کیل کان میں بالی، گلے میں مالا، اُونچا پونی ٹیل، کھلے گلے اور اُبھرے سینے والی چست شرٹ۔

اُس کی ولدیت کے خانے میں جو نام لکھا جاتا وہ مُلک کی ایک معروف سیاسی شخصیت کا تھا جو ہر الیکشن میں ایک باعزت سیاسی نمائندہ کے طور پر اسمبلیوں میں براجمان ہوتے تھے۔ کتنا باعثِ شرم تھا وہ جتنا چھپایا جاتا اُتنا ہی عریاں ہوتا جتنا انکار کیا جاتا اُتنا ہی اصرار کرتا۔ یہ پکا ثبوت سیاسی ساکھ اور خاندانی وقار کو تباہ کر دینے والا ثبوت۔ یہ بگڑے ہوئے مسخ شدہ مکمل انسانوں کی بھیڑ میں اس قدر نمایاں کیوں ہو جاتے ہیں۔

وجود کی غلاظتوں کو گٹر برد کر دیا جاتا ہے۔ چشم پوشی ناک پر کپڑا، ایئر فریشنر، اگزاسٹ، فین، تیزاب، فنائیل، گندے جرثومے مارنے کے لیے کو ایجاد ہوئے ہیں۔ اچانک ایک روز بازار میں لوٹ سی پڑ گئی جیسے ڈھاٹے دار بندوق برداروں نے ایک ہی ہلّے میں سب نوچ کھسوٹ لیا ہو۔ تمام تر سجاوٹوں اور ہمہ رنگیوں سے بازار چھلکتے رہے لیکن زندگی اور رس کسی نے نچوڑ لیا تھا۔ دو روز سے صنم کا کہیں اتہ پتہ نہ تھا۔ انتظار کی سولی سے ٹنگی نگاہیں مندنے لگی تھیں۔ سگریٹ پان کے کھوکھوں پر گرم موضوع سوگواری میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ سارے شوخ رنگ حیران تھے۔ سُرخ اور قرمزی گلابی کلیجی گوڑھے رنگ پھیکے پڑ رہے تھے۔ نیلے سبز رنگ شب خوابی کا لباس اوڑھنے لگے تھے۔ سفید پیلا پڑ مردہ چہرہ لیے جیسے صف ماتم میں بیٹھے ہوں۔ وہ جس کی بازار میں رل پڑی تھی جو کم یاب ہوتے ہوئے بھی پایاب تھا۔ کھوکھوں، ٹھڑوں، ریڑھیوں، تنوروں سے شاپنگ مالز تک کساد بازاری، مندی کا سودا، بھلا کبھی بت بھی بکے ہیں۔ بت فروشی نہیں بت شکنی شعار ہے یہاں کا۔ اغوا کاروں کے فون آتے رہے تاوان کی رقم دس کروڑ سے گھٹتے گھٹتے دس لاکھ ہو گئی۔ دس لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ کے قعرِ مذلت میں جست لگا گئی لیکن وارثوں کی جانب سے کوئی جوابی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ کسی پولیس اسٹیشن پر رپورٹ تک درج نہ ہوئی۔ بازار والے ہزار دو ہزار بھی چندہ جمع کرتے تو دو کروڑ کے باعزت تاوان کے بعد وہ پونی ٹیل والی صراحی دار گردن اکڑا کر تفاخر سے رہا ہوتا اور یہ قرض جانِ ناز پر رکھتا تھوڑی چکا ہی دیتا بازار کی مندی کو اپنے تیز رنگوں میں رنگ دیتا،

لیکن کسی تجوری کا منہ کھلا وہ جن تجوریوں میں تیز بکری ڈلوانے کا باعث رہا تھا۔ مہینہ بھر جب اُس کا کوئی وارث پیدا نہ ہوا تو ایک روز سویرے سویرے وہ خود بخود ہی بیچ بازار آن کھڑا ہوا۔ پرنچا راج ہنس سا خود پر گزرنے والی روداد رو رو کر سناتا ہوا، اور قریبی چوکی پر بیٹھے سپاہی اُس کی برہنہ پنڈلیوں کے سیخ کباب نگلتے ہنس ہنس سنتے تھے۔ بازار کی اُداس فضاؤں نے انگڑائی کھول کر اُسے خوش آمدید کہا۔ اغوا کاروں نے تاوان کی رقم شاید اُس کے بدن کی لوٹ کھسوٹ سے ہی وصول پالی تھی، پھر بھی اُس کے کھانے پینے اور رکھنے کے اخراجات دوبھر ہو گئے تھے۔ بنہراد کے صنم کو شاید یہی بے توقیری اُداس کر گئی تھی۔ اس دورانیے میں باوردی ڈرائیور اور گن مینوں کی حفاظت والی چار گاڑیاں بازار میں سے گزریں، جنھیں دیکھ کر پولیس کے سپاہی اپنی اپنی پوزیشن پر اٹین شن ہو گئے۔

سیٹھ عنایت اللہ کی مرسیڈیز، شیخ شاہد اللہ کی لینڈ کروزر، مسز عنایت اللہ کی ہنڈا اکارڈ، اور مس فاطمہ اللہ کی فراری۔

ہر گاڑی کے ہر ڈرائیور نے اس مجمعے میں ایستادہ بت کو پہچان کر حیرت کی بریکیں لگائیں، لیکن مالکان نے بندشیشوں پر چڑھی دُھند میں سے فطرت کی ڈھٹائی اور بے حیائی سے آنکھیں چرالیں۔

''زندہ چھوڑ دیا کم بختوں نے۔۔۔''

فاطمہ پہلو میں بیٹھے منگیتر سے ہنی مون پلین کرنے لگی۔ شیخ عنایت اللہ آج کی شیڈول میٹنگز کے بارے میں سیل فون پر استفسار کرنے لگے۔ شیخ شاہد اللہ شام کی فلائیٹ کا ٹائم کنفرم کرنے لگے اور مسز عنایت اللہ نے کہا تو صرف اتنا:

''ڈرائیور گاڑی ذرا ڈاکٹر کے کلینک کی سمت موڑ لو۔ لگتا ہے، بی پی شوٹ کر گیا ہے۔۔۔''

صنم آٹھ کنال کی کوٹھی میں یہ اطمینان کر کے داخل ہوا کہ گھر میں اپنا کوئی نہیں ہے۔ نوکروں، نوکرانیوں کی فوج نے گھیر لیا، جیسے ٹکور کرنے ہلدی لون لگانے، دودھ میں کچا انڈا گھول کر پلانے اور کئی مرہم تعویذ اور ٹوٹکے پہلے ہی تیار رکھے بیٹھے تھے۔ کیا ہوا کہاں ہوا کا شور۔ ٹکوریں سینک اور مرہم۔

''بس منور نجن کیا اور چھوڑ دیا کہتے تھے تجھے مارتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔۔۔''

''یعنی وہ کہتے تھے۔ بت کو توڑنے کا فائدہ پجاری بے نوا ناراض ہو گئے تو خدا اُن کے دھندے میں بے برکتی ڈال دے گا۔ وہ جب بھی اغواء برائے تاوان کی پلاننگ کریں گے کوئی بت جال میں پھنس جائے گا کبھی کوئی پورا مرد یا عورت قابو میں نہ آئے گا، جس کے لیے لواحقین منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو جائیں۔۔۔''

وہ پہلی بار ادھورے پن کا تماشا جیسے دُکھ سے دوچار ہوا تھا، لیکن ان دنوں بازار والوں کو ایک دوسرا تماشا ہاتھ لگ گیا تھا۔ اسی لیے اُس کے گوشہ نشین ہونے کی خبر اپنی پوری اہمیت نہ بنا سکی۔

الیکشن کا تماشا، ایسا کاروبارِ بازاری جس میں ہر نشئی ہر معذور ہر بے کار کو کام مل گیا تھا۔ نعرے لگانے جھنڈے لہرانے کا کاروبار۔ جھنڈیاں بنانے، جھنڈے پوسٹر لکھنے، وال چاکنگ کرنے، جلسوں میں کرسیاں لگانے، چرانے برسانے مخالفین کو گالیاں دینے اُن کے خاندانی حسب نسب اور شجروں کے اشتہار بنانے، کالم لکھنے، لفافے وصول کرنے، ٹاک شوز کو بھرپور ڈرامہ اور تھرل بنانے کے لیے افرادی قوت کی مانگ بے پناہ بڑھ گئی تھی۔ روزگار کے اتنے متنوع ذرائع ہاتھ آ گئے تھے کہ صنم کی تفریح کے لیے تو فرصت ہی نہ بچی تھی کسی کو یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ پُرکشش اُبھاروں والے اُس سینے میں بھی ایک دل ہو سکتا ہے جس کے اندر بھی کچھ ٹوٹتا اور بکھرتا ہے۔ وہ تو بازار کا بت تھا۔ کرتب دکھانے والا ریچھ، بندر، نیولا اور سانپ، پنجرے میں بند دو دھڑ والا بچہ، دو سر والا بچہ، سڑکوں پر ناچنے والا ہیجڑا، مسخرا، ان تماشا گاہوں کے اندر دل جیسی شئے کا کیا کام۔ اس کھوئے ہوئے دل کا سراغ لگانے کی فرصت کس کے پاس ہے۔ الیکشن کے اُبلتے کڑاہے میں ہر فرصت، ہر احساس، ہر جذبہ، ہر اصول، ہر قدر جھونک دیئے گئے تھے۔

صنم کا مٹا سا چڑی جتنا دل بھی انجانے میں ٹوٹ گیا تھا، لیکن اُس کے ٹوٹنے کی صدا اس پُرشور ہنگامے میں کوئی سماعت نہ رکھتی تھی۔ وہ بے سماعت صداؤں کو کرچی کرچی بت میں دفن کر دینے کی کوشش میں تھا۔ وہ ٹوٹے ہوئے بے شمار زرّوں کو بند کمرے میں بکھیرے واپس بت کے قالب میں سمیٹنے میں کئی روز سے مصروف تھا۔ اس کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ کیونکہ جھنڈیوں اور جھنڈوں کے شوخ رنگ مخالفین پر اُچھالے جا رہے تھے۔ الزامات کی تڑپتی پھڑکتی بوٹیاں، کسی زنخے کے لچکیلے بدن جیسے ننگے نعرے۔ مشتعل کرنے والی جذباتی تقریریں جو بین شدہ گیتوں کی نسبت زیادہ لذیذ اور اشتعال انگیز تھیں۔ ہیجانی چیخم دھاڑ کرتا بے ہنگم میڈیا اتنے بے تحاشا رنگوں میں صنم کا رنگ کسے یاد رہتا۔ بازار خود ست رنگا، پٹاخہ بن چکا تھا۔ صنم کے وجود کے ملگجے، سیاہ سُرمئی رنگ شبِ غم کے لبادے میں کیموفلاج کر گئے تھے۔ جڑواں دھڑ والے بچے، دو سروں والا بچہ، پنجروں میں بند تماشہ، سرکس میں تنبو توڑ رش لانے والے بونے، ان دنوں سب تماشے بے کار ہو چکے تھے۔ اُن کی تفریح الیکشن تماشے کے مقابل ماند پڑ چکی تھی۔ سبھی تماشے الیکشن تماشے سے مات کھا چکے تھے۔ اُن تماشوں کے ست رنگ الیکشن پھل جڑی نے راکھ کر دیئے تھے۔

دنوں بعد اچانک یہ خبر لگی کہ وہ بت آج پھر سوئے بازار نکلا ہے۔ پورا بازار شوخ سُرخ رنگ میں نہا گیا۔ لال شوخ رنگ کیپری گھٹنوں سے ذرا نیچے۔ شفاف ملائم پنڈلیاں جس میں سے یوں جھانکتیں جیسے شیشے کی بوتل جس کی آدھی شراب ایک ہی ڈِیک میں کسی شرابی نے چڑھا لی ہو۔ آدھی بھری آدھی خالی شیشے کی بوتل لال سینڈل کے سٹینڈ پر سجی ہوئی جس کے نشے میں سارا بازار بہکنے لگا تھا، جس جس بازار میں گلی میں اِس نشے کی بوتل کا ڈاٹ اُٹھتا پیاسوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ مجمع بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے بنا کر وہ بت کہاں جا رہا ہے کہاں لے جا رہا ہے۔

شیخ عنایت اللہ اپنے ورکروں کی کارکردگی پر اُنھیں بُری طرح ڈانٹنا

چاہتے تھے لیکن مارے صدمے کے لفظ اپنی اصل ہیئت میں ادا ہی نہ ہو پا رہے تھے۔ مخالف کے جلسے میں ایسا رش اُمڈا تھا کہ میڈیا کے کیمرے اور حلق بس وہیں روشنیاں بکھیرتے پوری طاقت سے چیخ رہے تھے۔ یہاں کیمروں کا رُخ ہوتا بھی تو خالی کرسیاں تضحیک اُڑاتیں شہر کے سارے بے روزگار، نشئی، مجرم کئی روز پہلے سے بک تھے لیکن آخری رات دوسری پارٹی دوگنی دھاڑی کی ادائیگی کر کے سبھی کو اُٹھا لے گئی تھی۔

کس لفظ پر تالیاں پیٹنی ہیں۔ تقریر کے کس وقفے پر تنبو توڑ نعرے لگانے ہیں۔ کس مقام پر اُچھل اُچھل کر مخالفین کو گالیاں دینی ہیں۔ ساری ریہرسل پڑی رہ گئی اور اداکار کسی دوسرے ڈرامے کے اسٹیج پر مصروف ہو گئے۔ مِل سے آئے ہوئے سو دو سو مزدور ہزاروں خالی کرسیوں میں دُور دُور یوں سجائے گئے تھے کہ میڈیا کا کیمرہ بس سروں کے اُوپر اُوپر سے گھوم جائے لیکن خالی پنڈال کسی کیمرہ ٹرک سے بھی بھرا بھرا محسوس نہ ہو رہا تھا۔

زبردستی بٹھائے گئے یہ مزدور جمائیاں لیتے معاوضے کے مطابق طے شدہ وقت کے خاتمے کے منٹ گن رہے تھے۔ کئی روز کے تھکے ہوئے حلق اِشارہ پا کر نعرے تو بلند کرتے لیکن اِس آہنگ سے نہیں کہ میڈیا کے کیمروں کو متوجہ کر سکیں۔ کئی بار جہاں تالیاں نہیں پیٹنی تھیں وہاں پیٹ دیتے جہاں نعرے نہیں لگانے وہاں لگا دیتے پورے پورے خاندان کی بکنگ تھی۔ بعض اوقات بچے وہ نعرے بھی بلند کر دیتے جو وہ گزشتہ رات مخالف کے جلسے میں لگا چکے تھے۔ آج کا جلسہ ایسا ہی بے ترتیب اور بدنظم تھا کہ یکدم جلسے میں آگ سی لگ گئی، پورا بازار اُمڈا چلا آتا تھا شاید اسٹیبلشمنٹ کی غیبی امداد آن پہنچی تھی، لیکن ان کے نعرے کرائے کے حلق کے نعرے نہ تھے۔ وہ تو دل سے، شوق سے، جذبے سے عجب رنگین سے نعرے لگا رہے تھے۔ میڈیا کے سارے کیمرے اسی مرکز پر روشنیاں بکھیر رہے تھے۔ مخالف پنڈال سونا ہو گیا تھا سارے رنگ ادھر منتقل ہو گئے۔ ہنگامہ تھرل ہیجان نعرے ناچ گانے، مخالفین کے خفیہ رازوں کی ننگی پھڑکتی ہوئی مصالحے دار بوٹیاں، گالیوں اور طعنوں کے گرم کباب، رقص کے بھاؤ، میڈیا کی دل پذیری کا سارا سامان جمع۔ مخالف کا مجمع بھی ادھر ہی اُمڈا چلا آتا تھا، جیسے کسی نے آواز لگا دیا ہو۔ شے ونڈی دی آئی جاؤ کھائی جاؤ۔

سراسیمہ سے شیخ صاحب کی نگاہ پنڈال کے صدر دروازے پر ترازو ہو گئی عوام کا جمِ غفیر تھا کہ عارضی دروازے اُکھڑ گئے تھے۔ میڈیا کے اینکرز ریسلنگ کے ریفریوں کی طرح اُچھل پھاند کر رہے تھے۔ بھائیں بھائیں کرتی خالی کرسیاں اب انسانی چہروں سے اُبل رہی تھیں۔ کامیاب جلسے کا پورا رنگ اور رس کسی غیبی خدائی سے خفیہ حکم کی بروقت تعمیل معلوم ہوتا تھا۔ تبھی بے قابو نشیبوں کے جھومتے جھامتے کندھوں پر سوار عنابی شراب کی ادھ پی بوتل سی چھلکتی تھی جس کا ڈاٹ کھلا تھا اور جھاگ اُبل رہا تھا۔ ہجوم اسٹیج کی سمت بڑھ رہا تھا اور شیخ عنایت اللہ نے مائیک جھپٹ لیا تھا۔

ہم انتہائی فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے صاحبزادے بہزاد عرف صنم اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں یہ ہر دلعزیز لیڈر پارٹی کا سرمایہ اب ہمارے ہر جلسے کی رونق ہوں گے۔ ہمارا انتخابی نشان۔۔۔

نیچے سے کسی نے آواز لگایا۔

ہمارا انتخابی نشان۔

''بازار کا بت۔''

بقیہ : جشنِ بیقراری

اور کسی کے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا، نہ بابا ہمارے معاملات میں دخل دے اور نہ ہم بابے کے معاملات میں۔

ایک نے تو یہ کہہ کر حد ہی کر دی کہ بابا کے دخل دینے کی تو خیر ہے اگر کسی اور نے دخل دے دیا تو پھر ہاتھ رہ جائیں گے وہ بھی خالی۔

سامنے کھڑے بڑے پوتے رومی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے ''چاچو، چاچو، پتہ ہے! ایک دن کیا ہوا، میں دادا جی کے کمرے میں اچانک دروازہ کھول کر گیا تو دادا جی کے موبائل کی سکرین پر نا۔۔۔ وہ۔۔۔ ایک۔۔۔ اور۔۔۔ دادا جی۔۔۔''

''بوہتی بکواس نہ کر، جتنا ہے اُتارہ، مار نہ کھا لئیں میرے ہتھوں''

باپ نے رومی کی زبان پر دھمکی کا تالا ڈال کر بات رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

فون کی گھنٹی پھر بج رہی ہے۔۔۔ شیخ صاحب آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔۔۔ پہلے اُنہیں یہ فکر ستا رہی تھی کہ بیٹوں کو اکاؤنٹ کے کروڑوں کا حساب کیسے دیں۔۔۔ اب یہ فکر ستا رہی ہے کہ مزید کا بندوبست کہاں سے کیا جائے۔۔۔؟

موبائل بار بار بج رہا ہے۔۔۔

ایک طرف شیخ صاحب ہیں۔۔۔ دوسری طرف۔۔۔ سراپا احتجاج۔۔۔

ڈراوا۔۔۔ دھمکی۔۔۔ خوف۔۔۔

کس چیز کا۔۔۔؟

یہ آپ جانتے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ خوب جانتے ہیں۔۔۔!!!

بامشقت

محمد بشیر مالیر کوٹلوی
(بھارت)

آج کی رات مریم بیگم کی آنکھوں سے جیسے نیند روٹھ کر کہیں دور چلی گئی تھی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اُس کا انگ انگ درد کر رہا تھا۔ موسم سخت گرم تھا۔ ہر روز یہی محسوس ہوتا تھا جیسے آج ہی کا دن موسم کا گرم ترین دن ہے۔ گرمی ہو یا سردی ہر موسم انسان صبر سے جھیل لیتا ہے مگر اس گرمی میں مچھروں کو جھیلنا بہت مشکل ہے۔ یہ مچھر بھی بڑے سرکش ہوتے ہیں پہلے اپنی بھاشا میں انسان کے کان میں آواز لگاتے ہیں کہ ہم حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اپنا بچاؤ کر سکو تو کر لو۔ مچھر کا مقابلہ فرعون نہ کر سکا مریم تو بے چاری ایک ابلا ناری تھی جو ایک ریڈی میڈ گارمنٹس کی فیکٹری میں سلائی کا کام کرتی تھی۔ آج ٹرک میں مال لوڈ ہو کر مہاراشٹر جانا تھا اس لیے مالک کشوری لال نے ورکرز پر صبح سے ہی سختی شروع کر دی تھی۔ کٹر سیکشن میں فٹافٹ قینچیاں چل رہی تھیں سلائی سیکشن میں سلائی مشینوں سے ورکر عورتوں کے پاؤں نہ ہٹ رہے تھے۔ سوتی دھاگے کا کام کرنے والوں نے عجلت میں اپنی انگلیاں زخمی کر لی تھیں۔ پاور کٹ کی وجہ سے سلائی مشین ایڑیوں اور پنجوں سے چلائی جا رہی تھیں۔ فیکٹری کا جنریٹر زیادہ لوڈ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ فیکٹری میں روشنی بھی ضروری تھی جو وہ آرام سے پوری کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے شام چھ بجے کے قریب کام مکمل ہوا تو مریم اپنا بیگ اٹھا کر گھر کی طرف چل دی۔ راستے میں چند اوباش قسم کے لونڈے روزانہ اُس کے گھر لوٹنے پر آوازیں کستے تھے۔ کوئی اُسے مادھوری کہتا تو کوئی ہیما کہتا۔ آج شاید وہ سب مایوس ہو کر چلے گئے تھے مریم ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ زندگی کا بوجھ تو وہ کسی نہ کسی طرح اُٹھا رہی تھی۔ اُس کی خوب صورتی اور پرکشش جسم کی وجہ سے لوگوں کی بھوکی نظروں کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ یہ بات اُس کے لیے زیادہ تکلیف دہ تھی کل تو کشوری لال نے اخلاق کی ساری حدیں پار کر لیں مریم اپنے کام میں مشغول تھی۔ بے خیالی میں اُس کا آنچل اُس کے سینے سے ڈھلک گیا۔ پہلے تو وہ دور کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے اُسے گھورتا رہا پھر اُس کی سلائی کا کام چیک کرنے کے بہانے اُس پر جھکا اور اُس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ مریم خاموشی سے روبوٹ کی طرح بے حس ہو کر کام کرتی رہی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی پیٹھ پر کوئی سانپ رینگ رہا ہو۔ نفرت اور غصّہ سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اُس کا جی چاہا کہ وہ کشوری کا منہ نوچ لے اور جوتا نکال کر اُس کی پٹائی کر دے مگر اُس کی مجبوریوں نے اُسے ایسا کرنے نہ دیا۔ اگر یہ نوکری گئی تو کیا کرے گی؟ یہ سوچ کر وہ برداشت کر گئی۔

گھر آتے ہوئے وہ اپنے بچوں ببّو اور ثانیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ دونوں روزانہ تین بجے گھر آ جاتے ہیں۔ آج وہ اب تک جانے کیسے بیٹھے ہوں گے۔ ببّو ابھی چھوٹا تھا ثانیہ تو دس سال کی سمجھدار لڑکی تھی ایسے وقت میں وہ اپنے بھائی کو سنبھال لیا کرتی تھی۔ مریم گھر پہنچی تو ثانیہ نے ببّو کو کھیل میں لگا رکھا تھا۔ ماں کو دیکھ کر ببّو مریم سے لپٹ گیا اور بولا:

''اِتّی دیر کیو نکر دی ممّا۔ ہم تو بور ہو گئے!'' اُس کا بوسہ لے کر مریم نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: ''بہوت کام تھا آج، میں جانتی تھی میرا بہادر بیٹا۔۔۔ روئے گا نہیں۔۔۔!''

وہ ماں سے الگ ہو کر بولا:

''میں کیوں روتا۔۔۔؟ میں تو سُپر مین ہوں۔۔۔!''

تھوڑی دیر بعد ببّو بولا ''ممّا۔۔۔ آج میں آئس کریم کھاؤں گا۔ کون والی۔۔۔!!'' وہ تھکی ماندی ہاں بیٹے، اچھا بیٹے کہتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ ثانیہ لپک کر ببّو کے پاس آئی اور پیار سے بولی ''ببّو بھیّا۔۔۔! جانتے ہو، آئس کریم اچھی چیز نہیں ہوتی اسے کھا کر بچوں کا گلہ خراب ہو جاتا ہے، پھر بخار آ جاتا ہے۔''

ببّو نے بہن کی بات کاٹی ''نہیں نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ سارے بچے آئس کریم کھاتے ہیں، وہ تو بیمار نہیں ہوتے، پاپا تھے۔۔۔ تو ہم خوب آئس کریم کھاتے تھے، ہمیں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مجھے نہیں پتہ مجھے آئس کریم کھانی ہے کون والی۔۔۔!!''

مریم جو چائے بنا رہی تھی دونوں کی باتیں سن کر رو پڑی اور بڑبڑائی ''کیسے پوری کروں اس کی فرمائش۔۔۔!؟'' ثانیہ اُسے پھر سمجھانے لگی ''دیکھو ببّو بھیّا، ممّا کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے ہم آئس کریم نہیں کھا سکتے'' ببّو مچل کر چلّایا ''پاپا کی تنخواہ تو بہت بڑی ہو گی، وہ سعودیہ گئے ہیں نا۔۔۔ پاپا جب سے گئے ہیں نہ ہمیں چکن کھانے کو ملتا ہے نہ مٹھائی، بس روٹی کھا لو، کھاتے جاؤ۔۔۔!''

چائے کپوں میں ڈال کر مریم نے دل پر پتھر رکھ کر ببّو کے منہ پر طمانچہ جڑ دیا اور بولی ''بولے جا رہا ہے۔ بولے جا رہا ہے۔ نہیں کھلاتی آئس کریم!''

ببّو رونے لگا اور چیختا ہوا باہر چلا گیا۔ ثانیہ بھی اُس کے پیچھے چلی گئی۔

مریم رات کے کھانے کا اہتمام کرنے لگی۔

مریم کی سوچ کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا اُس کے پہلو میں لیٹا ہوا ببّو اچانک چیخ اٹھا۔

''ممّا۔۔۔! مچھر نے کاٹا۔۔۔!''

ہاتھ کے پنکھے سے ہوا کرتی ہوئی اُسے تھپتھپا کر بولی ''سو جا! میں ہوا کرتی ہوں مچھر بھاگ جائے گا!'' ببّو سو گیا تو اُس نے اپنا دوپٹہ اُس پر ڈال دیا۔ ہلکی روشنی میں، کھلی آنکھوں سے وہ اپنے مسائل کی الجھنوں میں کھو گئی۔ اب پینتالیس سو روپے میں اس مہنگائی کے دور میں بنتا کیا ہے۔ دو ہزار روپے ہر ماہ مالک مکان کرایہ لے جاتا ہے۔ بچوں کے اسکول کے اخراجات کے بعد راشن، بجلی اور پانی کا بل بھرنا ہوتا ہے۔ پچھلے مہینے چار دن کرایہ لیٹ ہو گیا تو مالک مکان الٹا سیدھا بولنے لگا۔ مریم کو اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ کم بخت ایسے گھور گھور کر دیکھتا تھا جیسے کھا ہی جائے گا۔ کئی دنوں سے وہ واشنگ مشین بیچنا چاہتی تھی۔ کئی بار بجلی کے سامان والی دوکان

پر گئی۔ وہاں دوکاندار ایک ہی جواب دیتا ''باجی کوئی سیکنڈ ہینڈ سامان خریدنے والا آتا ہی نہیں۔ آئے گا تو آپ کی مشین دکھا دوں گا۔ قیمت آپ خود طے کر لینا!'' مریم چاہتی تھی کہ وہ ایک تو پنکھا خرید لے اور ڈاکٹر کا بل بھی بہت بڑھ رہا ہے۔ وحید کا دوست ہونے کے ناطے وہ بے چارہ کبھی تقاضہ نہیں کرتا۔ دوائیاں دے دیتا ہے۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑاتی ''اب اکیلی عورت کیا کیا کرے، لیٹے لیٹے اُس نے ببّو کو پھر سے ہوا کرنی شروع کر دی، اس خوف سے کہ وہ دوبارہ نہ جاگ جائے۔

ایک سال ہو گیا وحید کو گھر سے گئے۔ سال بھر وہ گھر بیٹھی رہی کام کرنے کے بارے میں اُس نے سوچا ہی نہ تھا۔ اس ایک سال میں جو تھوڑے بہت زیور تھے وہ بک گئے۔ اُس کے جہیز کا سامان صوفہ، بیڈ، الماری اور ٹی وی اونے پونے بیچنے پڑے۔ ابھی وحید کی سزا مزید دو سال باقی تھی۔ مریم کو یہ دو سال بیس سال کے برابر لگ رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب وحید سزا کاٹ کر گھر آئے، وہ آ کر اُسے قبول نہ کرے۔ ایک بار پھر اُسے گرہستی کی خوشیاں نصیب نہ ہوں۔ ایک سال میں، وہ تین بار وحید سے ملنے سینٹر جیل گئی تھی۔ ملاقات کے دوران اُس نے مریم سے اتنا ہی پوچھا کہ ببّو اور ثانیہ کیسے ہیں۔۔۔؟ دونوں بچے سکول جاتے ہیں۔۔۔؟ مریم رو رو کر اُس کی منّت سماجت کرتی رہی کہ وہ کچھ بولے مگر وہ خاموشی سے اُسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ مریم نے بارہا اُس سے معافی مانگی اور بتایا کہ جھوٹے الزام کی وجہ سے وہ غصہ میں تھی۔ بھائی کے کہنے پر وہ یہ قدم اُٹھا بیٹھی، وہ کچھ نہیں بولا۔ ملاقات کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی وہ چلا جاتا تھا۔ تینوں بار وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔ وحید کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ دوسرے قیدی چھٹیوں پہ اپنے اپنے گھر چلے جاتے مگر وحید جیل میں ہی رہتا۔ وہ ایک اچھا الیکٹریشن تھا۔ الیکٹرک موٹریں باندھنے میں ماہر تھا۔ جیل میں رہ کر کام کرتا رہتا۔

دوسری چارپائی پر سو رہی ثانیہ ''اوئی ماں'' کہہ کر بازو کھجاتے ہوئے بیٹھ گئی۔ آنکھیں جھپک کر اُس نے ماں کو دیکھا جو ببّو کو پنکھا کر رہی تھی۔ وہ ماں سے بولی ''ممّا پیاس لگی ہے۔۔۔!'' مریم نے اُٹھ کر گھڑے سے پانی انڈیلا اور گلاس ثانیہ کی طرف بڑھا دیا۔ ایک گھونٹ پانی پی کر وہ بولی ''بس'' اور بستر پر دراز ہو گئی۔ مریم نے اُسے گھور کر دیکھا ''کیا ہوا؟ ابھی تو کہہ رہی تھی پیاس لگی ہے!''

ثانیہ نے کپڑا اوڑھ کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ مریم کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی بیٹی کو پانی گرم لگا۔ گھڑا پچھلے سال خریدا تھا۔ فیکٹری اور گھر سے وقت ملے تو وہ نیا گھڑا خرید لائے مگر یہاں تو سر کھجانے کے لیے وقت نہیں۔ مریم کو اندازہ ہوا کہ آدھی سے زیادہ رات بیت گئی۔ وہ سارے خیالات جھٹک کر سونے کی تیاری کرنے لگی۔ جسم ڈھیلا چھوڑ کر اُس نے پپوٹے بند کر لیے اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جانے کیوں آج ماضی قریب اُس کے ذہن پر سوار تھا۔ ببّو اوں اوں کرتا ہوا کروٹ بدل کر دوسری طرف ہو گیا۔ مریم نے ہاتھ کا پنکھا اور تیز گھمانا شروع کر دیا۔ جاگتی آنکھوں میں پھر وہی مناظر گھومنے لگے۔

مریم کا اچھا خاصہ ہنستا کھیلتا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ مانا کہ اُس کے شوہر وحید کا گھر کرایہ کا تھا اُس کی دوکان بھی کرائے کی تھی مگر اپنی محنت سے اُس نے گھر میں تمام سہولیات مہیا کر رکھی تھیں۔ وہ میاں بیوی اپنے دو پیارے پیارے بچوں کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ وحید صبح کو اپنی الیکٹریشن کی دوکان پر چلا جاتا۔ لنچ کے لیے یا تو وہ خود آ جاتا یا نوکر لڑکے سے کھانا منگوا لیتا۔ رات کو گھر آتے ہوئے وہ بچوں کے لیے مٹھائی، پھل یا آئس کریم لانا نہ بھولتا۔ ہفتہ میں دو تین بار گوشت بھی پک جاتا۔ مریم بلا کی حسین تھی۔ دو بچے پیدا کر کے بھی وہ ہمیشہ تر و تازہ نظر آتی تھی۔ وحید اُسے ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ مریم کا شاپنگ کے لیے بازار جانا بھی اُسے پسند نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی خوبصورت بیوی پر کسی کی غلط نظر پڑے۔ اُن دنوں مریم کے دور کے رشتہ کا بھانجا پرویز جو یونیورسٹی میں سول انجینئر کا طالب علم تھا۔ دس دن کے لیے اُن کے شہر آیا تھا۔ شہر میں اوور برج بن رہا تھا جہاں اُس نے پریکٹیکل کرنا تھا۔ پرویز بچپن سے ہی مریم کو چھوٹی امّی کہتا تھا۔ مریم کا اُس کی ماں سے بہت پیار تھا۔ پرویز بہت ہی خوش مزاج اور ہنسوڑ قسم کا لڑکا تھا۔ ہر وقت اچھل کود، لطیفہ گوئی اور ہنسنا ہنسانا اُس کی فطرت تھی۔ پرویز کی عادت وحید کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اُس کا بچوں کی طرح بات بات پہ مریم کو چھونا، گلے لگنا اور مستی کرنا اُسے پسند نہ تھا۔ ایک دن دوپہر کو وحید لنچ کے لیے گھر آیا تو پرویز مریم کی کمر میں ہاتھ ڈالے اُس کو بال روم ڈانس سکھا رہا تھا۔ وحید کے اندر آگ بھڑک اُٹھی اُس کا جی چاہا کہ دونوں کی جم کر پٹائی کر دے مگر وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اُس دن کے بعد وحید کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا۔ وہ بات بات پہ مریم سے اُلجھنے لگا۔ کام ختم ہوا تو پرویز چلا گیا۔ وحید کا رویہ روز بروز بگڑتا گیا۔ مریم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک رات وحید مریم کی طرف پیٹھ کیے لیٹا ہوا تھا کہ پرویز کا فون آ گیا۔ وحید کو سلام کہہ کر اُس نے فون چھوٹی امّی یعنی مریم کو دینے کے لیے کہا۔ وحید نے خاموشی سے فون مریم کی طرف بڑھا دیا۔ پرویز نے مریم کو کوئی ایسی بات سنائی کہ وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ پرویز بات کرتا گیا وہ قہقہے لگاتی رہی۔ وحید اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ جب اُس سے برداشت نہ ہوا تو اُس نے مریم سے فون چھین کر فرش پر پٹخ دیا اور چلّایا ''حرام زادی۔۔۔! اگر وہ اتنا ہی پسند ہے تو اُسی یار کے پاس چلی جا۔۔۔!''

اس ناگہانی الزام کے لیے مریم تیار نہ تھی۔ وہ بولی ''کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟ وہ میرے بیٹے کی طرح ہے۔ امّی کہتا ہے مجھے۔۔۔ شرم آنی چاہیے آپ کو۔۔۔ ایسی گھٹیا سوچ ہے آپ کی۔۔۔!!؟'' اُس رات وحید نے اپنے اندر کا سارا زہر اُلٹ دیا۔ وہ بت بنی سنتی رہی۔ دو دن وحید نے اُس سے نہ بات کی نہ گھر کھانا کھایا۔ تیسرے دن مریم اپنی صفائی میں کچھ کہنے لگی تو وحید بھڑک اُٹھا، لاتوں اور گھونسوں سے مریم کی پٹائی شروع کر دی۔ بچے سہم کر یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ مریم کی چیخوں کی آواز سن کر محلے والے اُن کے گھر جمع ہو گئے۔ انہوں نے مریم کو وحید سے چھڑایا۔ مریم کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور چہرے پر نیل کے نشان دکھائی دینے لگے۔ وحید غصّے سے پھنکارتا رہا۔ اُس نے سب کے سامنے چلّا کر کہا ''مریم بیگم۔۔۔! اِن محلے والوں کے سامنے میں نے تمہیں طلاق دی۔ طلاق، طلاق، طلاق!!'' جسم کی چوٹوں سے وہ نڈھال تھی یہ آخری

باقی صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ کیجیے

نمازِ قصر

محمد حامد سراج
(میانوالی)

ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں رخصتی کا گیت گا رہی تھیں۔۔۔!

کِناں جمیاں تے کِناں لے جانڑیاں
(کس گھر جنم لیا اور کون ہمیشہ کے لیے لے جائے گا)

میں لڑکیوں کے جھرمٹ میں گیت کے بول سن کر ایک لمحے کو اداس ہوئی اور کسی بہانے کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گئی۔ آسمان تاروں سے جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ فضا میں جھینگر کی آواز ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیوار و در کو غور سے دیکھا۔ اینٹوں کی درزوں سے میرا بچپن نکل آیا۔ میں صحن میں سٹاپو کھیلنے لگی۔ کھیلنے کے بعد نل سے پانی کی بالٹی بھر لائی۔ ماں کے ساتھ چولہے میں لکڑیاں رکھنے میں ہاتھ بٹایا۔ توے پر روٹی ڈالی اور گرم گرم روٹی بابا کے سامنے لا رکھی۔

''بابا۔۔۔ سالن میں مرچیں تیز تو نہیں ہو گئیں۔۔۔؟''

''نہیں بیٹا۔۔۔''

''بابا۔۔۔ ٹھہریں میں دودھ لا دیتی ہوں آپ تو ایسے ہی کہہ دیتے ہیں کہ مرچیں نہیں ہیں۔''

میں نے بابا کے سامنے سے پلیٹ اٹھالی اور دودھ کا گلاس رکھ دیا۔

بچپن اینٹ کی درزوں کا رستہ بھول گیا۔

میں بچپن کا ہاتھ تھام کے رو دی۔۔۔ کیا میں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ یہ درخت، منڈیر پر بیٹھا کوّا، برآمدے میں چڑیوں کا گھونسلہ، ماں، بھائی، بہن، نل سے گرتا تازہ پانی، توے پر سے اترتی گرم روٹی، بابا کا سالن، سہیلیاں، سٹاپو، گڑیاں پٹولے سب کے سب چھوڑ جاؤں گی۔۔۔؟ وہ آزادی جو مجھے اس گھر میں تھی کیا اسے کھو دوں گی؟ ماں باپ سے لڑنا، جھگڑنا، محبت اور ضد، اپنی بات منوا لینے کا مان، کیا یہ سب دیوار کے اس پار جس گھر میں جا رہی ہوں وہاں نہیں ہو گا۔

اینٹ کی درزوں سے جھانکتا بچپن میرے وجود سے لپٹ گیا۔ میں ایک لمحے میں وہ تمام لمحے کھنگال آئی جو میری زندگی کا حاصل تھے۔ بیمار ہونا، میری بیماری میں بابا اور ماں کو بے چین ہونا، ہر موسم میں میری ہر ضرورت کا خیال رکھنا، بابا کا پنسل تراش کے دینا، سکول کے کاپیوں پر خاکی رنگ کے کور چڑھانا، کتابوں کی جلد بندی سے یونیفارم اور سکول کے بستے کے رنگ میرے من میں رنگ بھرنے لگے۔

میں نے کچے صحن کی مٹی کو ہاتھ سے چھوا اور چوم لیا۔

یہ میرے بابا کا گھر ہے۔ اسے کون چھین سکتا ہے مجھ سے۔۔۔؟ میں اسے مکمل اپنے اندر تعمیر کر لوں گی۔ سسرال میں کون روک سکے گا مجھے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مَیں بابا کے گھر کود جایا کروں گی۔

اندر ڈھولک کی تھاپ پر گیت کے بول اٹھاتی لڑکیوں کے قہقہے مجھے سنائی دیے، بچپن چپکے سے اینٹوں کی درزوں میں چھپ گیا۔ میں کمرے میں آ گئی۔

شادی کی تیاریاں جوبن پر تھیں۔ کپڑے سجائے اور دکھائے جا رہے تھے۔ زیور، رنگ برنگی چوڑیاں، میک اَپ کا سامان، رشتہ دار، باتیں، قہقہے، سہیلیاں، کھانے، چائے، رنگ و نور کی برسات تھی۔

رُخصتی کے روز سورج تقریباً نو گھنٹے کا سفر طے کر کے میرے گھر کی دیواروں پر اداسی کے قلم سے ہجر کے نقش و نگار بنا رہا تھا۔ کار ریورس کر کے لگا دی گئی تھی۔ پاؤں کے نیچے سے سرکتی زمین پر پاؤں دھرتی میں کار تک پہنچی۔ ماں کی آنکھیں سرخ تھیں۔ بابا جو سنبل کے درخت کی آدھی چھاؤں میں کھڑا تھا، اس کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ چکا تھا۔

میرا بچپن گھر کی دیواروں سے اتر کر میرے ساتھ کار میں بیٹھنا بھول گیا۔

کار جب بستی کا آخری موڑ مڑی تو منظر دھندلا گئے۔

بابا جو سنبل کے درخت کی آدھی چھاؤں میں کھڑا تھا۔۔۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے دیوار و در کو دیکھا۔

گھر ایک دم خالی ہو گیا۔۔۔ بنجر، اداس، بکھرا، اجڑا سا۔۔۔

گھر کی روح کار میں بیٹھ کر گھر سے رختِ سفر باندھ گئی۔

تیسرے روز کی بات ہے۔

گھر میں چہل پہل تھی، رونق، رنگ و نور کی برسات۔۔۔

میں گھر آئی تھی۔

عصر کے وقت میں نے کھنکتی ہوئی آواز سے پوچھا۔

''بابا۔۔۔ اب یہاں اس گھر میں مَیں مکمل نماز ادا کروں گی یا نمازِ قصر یعنی سفر کی نماز۔۔۔؟''

''بیٹا۔۔۔ یہ گھر اب تمہارا نہیں ہے تم نمازِ قصر ادا کرو گی۔''

دیواروں کی درزوں میں میرا بچپن رونے لگا۔۔۔!

قصہ مختصر (افسانچہ)

میں نے پھولی ہوئی سانسوں سے کہا:'

'شیطان نے ہم کو بہکا دیا"

وہ گھبرا کر بولی:

"اب کیا ہو گا؟"

میں نے بڑی عقیدت سے کہا:

"اللہ مالک ہے!"

شوکت تھانوی

جشنِ بیقراری

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

اس سوال کا جواب شیخ صاحب کبھی نہ دے پائے کہ وہ ہمیشہ الٹی چال کیوں چلتے ہیں۔ یعنی ناشتے میں کھانا اور کھانے میں ناشتے کے لوازمات کن وجوہات کی بنا پر استعمال کرتے ہیں۔ جب بھی جس نے دیکھا شیخ صاحب ہر روز صبح ناشتے میں رات کی بچی ہوئی روٹی اور سالن ترکاری گرم کرا کے چائے کے دو کپ کے ساتھ تناول فرما لیتے۔ دو کپ کا سبب البتہ شیخ صاحب نے کئی بار یہ کہہ کر بتلایا:

''روٹی سالن کھاتے کھاتے چائے کسی قدر ٹھنڈی ہو جاتی ہے جبکہ چائے بالخصوص ناشتے میں گرم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف آنتوں میں جمی رات کی چکنائی کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے بلکہ جوگھی، مکھن اور چربی آپ نان ،بن، ڈبل روٹی، چھولے، پائے، نہاری کے ساتھ کھاتے ہیں وہ بھی کسی قدر چائے کی گرمی کے ساتھ پگھل کر مثانے کے ذریعے خارج ہو جاتی ہے''

رات کے وقت روٹی سالن یا پلاؤ زردہ کھانے کے بجائے شیخ صاحب ہمیشہ گھر کی پلی بھینس کے دودھ کا بڑا پیالہ لبالب بھرتے اور براؤن رسک سے ٹی وی یا موبائل کی سکرین پر نظریں جمائے شوق فرماتے۔ کبھی کبھی بے دھیانی میں رسک نرم ہونے کے باعث اُس کا کوئی حصہ اُن کی داڑھی یا مونچھ میں اٹک جاتا تو اُن کے چھوٹے بڑے پوتے میں سے کوئی نہ کوئی اُن کی توجہ دلا کر زور زور سے ہنسنے لگتا جس پر مذکورہ بچے کی ماں اُسے ڈانٹ کر چُپ کراتی اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ پر دوپٹہ رکھ لیتی۔

آج بھی شیخ صاحب ماڈرن بیکری کے من پسند براؤن رسک دودھ میں ڈبو کر کھانے کے ساتھ بار بار دروازے کی جانب نظر اُٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی موبائل میں لگی مرزا داغ دہلوی کی غزل:

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا
وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں
یہ کام کس نے کیا ہے یہ کام کس کا تھا

پر اس طرح سر ہلا کر داد دے رہے تھے کہ جیسے اُستاد داغ دہلوی نہیں، خود شیخ صاحب محبوب سے شکوہ کناں ہوں۔ شیخ صاحب کا انہماک دیکھ کر لگتا تھا کہ شیخ صاحب کی رات اس غزل کے ساتھ ہی گزرے گی کیونکہ شام کو موبائل کی چارجنگ پوری کرنے کے بعد شیخ صاحب جب صبح نیند سے بیدار ہوتے تو پہلا کام موبائل کو چارجنگ پر لگانے کا کرتے جس کا مطلب یہ تھا کہ شام کو کی گئی چارجنگ رات میں استعمال ہو گئی ہے۔

دروازے کی آہٹ پر شیخ صاحب کی توجہ غزل کے بجائے دروازے پر مرکوز ہو گئی۔ جونہی اُنہیں منجھلا بیٹا مبین نظر آیا تو نہ صرف اُن کی باچھیں کھِل گئیں بلکہ شیخ صاحب نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی سے پوزیشن بدل کر بیٹے کی جانب بے تابی سے ہاتھ بڑھایا تو بیٹے نے قمیض کی سامنے والی جیب میں بے دلی سے ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ شیخ صاحب کی جانب بڑھا دیا۔

''یہ کیا؟''

''چیک''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، پیسے کیوں نہیں لائے؟''

''اگر چشمہ پاس ہے تو غور سے دیکھ لیجیے، پتہ چل جائے گا''

''تمہاری زبان دکھتی ہے بتانے سے؟''

''ابا جی! چیک ڈِس آنر ہو گیا ہے'' کسی قدر اکتاہٹ سے بلند آواز میں ہاتھ ہلا کر۔

''ڈِس آنر ہو گیا ہے، مگر کیوں؟''

''یہ بات تو مجھے آپ سے پوچھنی چاہیے کہ بنک میں موجود اتنی بڑی رقم کہاں اُڑن چھو ہو گئی؟'' اس بار بیٹے نے غصے کے اظہار میں آواز اور چہرے کے تاثر کے ساتھ دونوں ہاتھ بھی استعمال کیے۔

بیٹے کے ترت جواب پر ایک دفعہ تو شیخ صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ پھر جی میں آئی کہ جس طرح بیٹے نے شیخ صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے وہ بھی اسی لئے میں ''سب تمہارا کیا دھرا ہے'' کہہ کر حساب بے باق کر دیں مگر معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے شیخ صاحب نے خاموش رہنا مناسب سمجھا البتہ دودھ اور رسک سے اُن کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ بے دلی سے موبائل قمیص کی سائیڈ پاکٹ میں ڈال کر میز سے اٹھتے ہوئے فقط اتنا بولے:

''سوچ کر بتاؤں گا''

آج کی رات گھر کے دو کمروں میں خاصا تناؤ اور بے چینی کا ماحول بن گیا تھا۔ ایک کمرے میں چاروں بیٹے اور اُن کی بیویاں سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنی بڑی رقم کہاں گئی۔ کس نے اُن کے حق پر ڈاکہ مارا؟ باری باری ہر کوئی کسی جانب انگلی اٹھاتا، کوئی متفق ہوتا، کوئی انکار میں سر ہلا دیتا۔ پھر وہی شخص سامنے والے سے دریافت کرتا۔ وہ بھی قیاس کے گھوڑے دوڑا کر کسی جانب انگلی اٹھاتا اُس کی بابت بھی کچھ اتفاق نہ ہو پاتا۔ رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا جو کسی نتیجہ کے بغیر اس تجویز پر ختم ہوا کہ:

''ابا جی کے جواب کے بغیر خیالی گھوڑے دوڑانا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے برابر ہے''

حال دوسرے کمرے کا، پہلے کمرے سے زیادہ سنگین بلکہ سوگوار تھا۔ اس بات میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ تمام چیک شیخ صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھ

کر باری باری اپنے بیٹوں کو کیش کرانے کے لیے دیے اور ہر بار اُن کی مطلوبہ رقم اُن کو موصول ہوتی رہی۔ سوال اپنی جگہ پہاڑ کی مانند پھر بھی اٹل کہ رقم گئی کہاں۔

شیخ صاحب نے خیال کے گھوڑے دوڑانا شروع کیے ہی تھے کہ موبائل بج اٹھا۔ جونہی شیخ صاحب کی نظر موبائل کی سکرین پر گئی انہوں نے ناگواری سے موبائل کا سوئچ آف کر دیا۔ ایک بار پھر سے شیخ صاحب نے خیالی گھوڑوں کو ہانکا لگایا تو وہ کچھ زیادہ ہی برق رفتاری دکھاتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

☆

حاجی نورالٰہی معاف کیجیے گا نورالٰہی اُن دنوں غربت سے بُری طرح جوجھ رہا تھا اور گیان چند نے مزید سودا دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ نورالٰہی کے اصرار پر لالہ گیان چند نے صاف لفظوں میں کہا:

''دیکھ نورے! مجھے تجھ سے پوری ہمدردی ہے مگر یہ تو بتا کہ گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا؟''

گیان چند کی بات سولہ آنے درست تھی۔ نورالٰہی جواب دینے کے بجائے لالہ کی بات کے بوجھ سے سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ لالہ کو اندازہ تھا کہ نورالٰہی نئے بہانے اور نئے الفاظ تراش کر پھر سے منّت ترلا کرے گا مگر کافی دیر تک نورالٰہی نے سر اوپر نہ اٹھایا تو لالہ کو اُس پر دیا آ گئی:

''میں کیہا، سَوں گیا کہ مَوں گیا''

نورالٰہی کی جانب سے کسی قسم کا ردِعمل نہ ہونے پر لالہ کو تشویش ہوئی تو اُس نے دکان پر کام کرنے والے لڑکے ہریا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اَو ویکھ تاں سہی، کدرے متھے ہی نہ لگ جاوے'' ہریا دکان کے تھڑے سے اچھل کر نورالٰہی کے پاس گیا اور زور زور سے اُس کا موہنڈا ہلا کر ''سُتا ائیں کہ جاگدا ائیں'' ہریا کہ ہلانے پر نورالٰہی نے چہرہ اوپر کیا تو وہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر ہریا کا دل بھر آیا اور اُس کے منہ سے نورالٰہی کی طرف اشارہ کر کے صرف اتنا نکلا ''لالہ جی!''

لالہ گیان چند لین دین کے معاملے میں کٹّر ہونے کے باوجود دردمند دل رکھتا تھا۔ فوراً گدی سے اُٹھ کر نیچے آیا اور نورالٰہی کو گلے لگا کر بولا:

''جھلیا! کدی جوان وی روندے نیں، کیہہ ہویا جے تیرے کول پیسے نئی، بچے تے ساڈے نے، رب دا دِتا سب کجھ اے، چل اُتھروصاف کر، پا اوئے منڈیا'' ہریا کو مخاطب کرتے ہوئے۔ ''نورالٰہی جو کہندا اے جتّا کہندا اے پادے''۔ گیان چند کی ہمدردی اور دریا دلی دیکھ کر نورالٰہی کا دل بھر آیا اور وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ جسے سن کر دکان کی طرف بڑھے لالہ کے قدم پھر سے نورالٰہی کی جانب بڑھ گئے۔

''نہ رو بیبیا، تینوں کیہانا، جو مرضی کھڑ جنّا مرضی کھڑ''

''پر لالہ جی، میں بیکار بندہ واں، کتھوں بھار لاواں گا''

''اوئے توں تھوڑی لانا ایں، لانڑ الا لائے گا'' آسمان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے۔

''لالہ جی میرا ساں روکدا پیہا اے''

''کوئی نئی رکدا ساں واں، رب دے گھر دیر اے، انھیر نئی، شاوا''

سامان کا تھیلا پکڑاتے ہوئے ''جا بچیا نوں روٹی کھُواتے آپ وی رَج کے کھا نالے کھا، نالے سویرے آ جئیں رَب بھلی کرے گا''

دوسرے دن علی الصبح نورالٰہی گیان چند کی دکان پر پہنچا تو گیان چند پیتل کی لٹیا ہاتھ میں پکڑے ''اُوم نماہ شیوائے'' کا جاپ کرتے ہوئے دکان کے آگے چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں نورالٰہی سے آنے کی وجہ دریافت کی تو نورالٰہی نے گیان چند کو اُس کا وعدہ یاد کراتے ہوئے بتلایا کہ گیان چند نے صبح آنے کا کہا تھا۔ نورالٰہی کا جواب سن کر گیان چند بے ساختہ ہنس پڑا۔

''بھولے بادشاہ، سویرے کیہا سی، نور پیرو ویلے نئی''

''گھر دی منجھی اگے ای ٹُٹی اوئی اے، ہور توڑن دی کیہہ لوڑ اے؟''

سر کے اشارے سے بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے لکشمی پرشاد نے سامنے چائے والے کو انگلی سے دو کا اشارہ کر کے نورالٰہی کو مخاطب کیا۔ ''دیکھ بھئی نورالٰہی! بات یہ ہے کہ میں روزانہ مِل سے آٹا منگاتا ہوں جو مل کا مزدور پہنچاتا ہے۔ چار آنے پھیرا لیتا ہے۔ تو اس طرح کر ڈِنگی کھوئی جا (نورالٰہی فوراً کھڑا ہو جاتا ہے) اویار اتنا اوتاؤلا نہ ہو، پوری بات سُن۔ پہلے چائے پی پھر ریڑھی، پَوڑی والے بابا عبداللہ سے کرایے پر ریڑھا لے آ۔ کرایہ جانے تے میں جاناں''

☆

خواب اچھے بھی ہوتے ہیں اور سچے بھی مگر موبائل درمیان میں آ کر ان کا خون کرتے ہیں کاش اس پر کوئی دفعہ لگ سکتی۔ اس بار بھی شیخ صاحب نے چونک کر موبائل کی سکرین پر نگاہ دوڑائی اور کڑوا منہ بنا کر سوئچ آف کر دیا اور پھر سے چیک کی بابت غور کرنے لگے کہ اتنی بڑی رقم اس قدر جلد کیوں کر ختم ہو گئی۔

☆

نورالٰہی نے اپنے اور چھوٹے بھائی کے ہمّٹے کٹّے دوستوں کی ایک ٹولی بنا کر لالہ کی دکان پر بٹھا دی تھی اور گیان چند کو یہ کہہ کر یقین دلا دیا تھا کہ لالہ جی! آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں، آپ کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی تو یہاں لاشیں گر جائیں گی مگر آپ کا بال بیکا نہیں ہوگا۔ نورالٰہی کی تسلی پر لالہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کچھ کہنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اُس کے کانوں میں شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں۔ لالہ نے آناً فاناً دکان کو تالا مار کے گھر کی راہ لی۔ اُس دن کے بعد نہ گیان چند کی دکان کھلی نہ گھر کا دروازہ۔ رات کی سیاہی میں ایک ایک کر کے تمام غیر مسلم گھرانے یا تو سرحد پار کر گئے یا بلوائیوں کے ہتھے چڑھ کے جانیں گنوا بیٹھے۔

شہر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ لٹے پٹے لوگوں کی آمد اور اُن کی دلگداز داستانوں نے مقامی لوگوں میں اشتعال کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ فسادی امن و

''چہارسُو''

امان خراب کرنے کے ساتھ مالی فوائد اٹھانے میں بھی مصروف تھے۔کوئی مکان قبضے میں لے رہا تھا،کوئی دکان ہتھیا رہا تھا۔کسی کے حصے میں مال و دولت آ رہی تھی ،کوئی بچے کھچے اثاثوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

دن، ہفتے، مہینے گزرنے لگے تو نورالٰہی کے گھر میں پھر سے بھوک کا رقص ہونے لگا۔نورالٰہی نے کام تلاش کرنے کی پوری کوشش کی مگر ہر کوئی آپا دھاپی میں مصروف تھا اس لیے نورالٰہی کی ہر کوشش ناکام رہی۔ایک دن رات کو نورالٰہی کے دروازے پر دھڑ دھڑ ہوئی تو اُس کا دل دروازے کی دھڑ دھڑ سے زیادہ زور سے دھڑکنے لگا۔نورالٰہی نے سوچا ہو نہ ہو یہ لالہ گیان چند ہے جو کسی طرح جان بچا کر اپنا مال متاع لینے آیا ہے۔نورالٰہی نے بیتابی کے عالم میں جیسے ہی دروازہ کھولا تو اُس کی خوشی ماند پڑ گئی۔سامنے چھوٹا بھائی منظورالٰہی کھڑا تھا جس کے چہرے پر رونق اور جسم پر عمدہ لباس کے ساتھ ہاتھ میں کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔

پہلا سوال نورالٰہی نے بھائی سے سامان کی بابت کیا تو اُس نے کہا:

''سارے تیری طرح لوٹے تھوڑی ہیں ، قیمے کو دیکھ اُس نے سوہن لال صراف کی دکان اور مکان دونوں پر ہاتھ صاف کر لیا ہے۔کہتا ہے کہ دکان سے سارا سامان لے جا کر گاؤں کے گھر میں داب دیا ہے۔دو چار مہینے خالی دکان کھول کر بیٹھوں گا پھر ہولی ہولی گاؤں سے سامان لا کر دکان بھر لوں گا۔''

''یہ تو گناہ ہے، سراسر گناہ، قیامت کے روز اللہ کو جواب بھی تو دینا ہے۔''

''اُس وقت اللہ کو کیا جواب دے گا جب گیان چند کی دکان اور مکان پر کوئی قبضہ کر کے مالک بن بیٹھے گا۔کل کو گیان چند آ گیا تو وہ تھوڑی موڑے گا گھر یا دکان۔میری مان تو دونوں چل کے، رات کے اندھیرے میں گیان چند کی دکان کا تالا توڑ لیتے ہیں اور گھر کا بھی۔جب تک گیان چند نہیں آتا، چوکیدار بن کے اُس کی راکھی کر، جب گیان چند آ جائے تو خیر میر سے اُس کی امانت اُسے لوٹا دے۔تُو بھی راضی، گیان چند بھی راضی اور۔۔۔''

''ہوں، کہتا تو تُو ٹھیک ہے۔اگر میں راکھی نہ کرتا تو اب تک کئی بار لالہ جی کی دکان لٹ چکی ہوتی''

☆

موبائل کی گھنٹی نے خیالات کا سلسلہ ہی نہیں توڑا بلکہ شیخ صاحب کو ندامت کے گڑھے میں دے مارا۔کہاں وہ دن کہ کال بک کرا کے گھنٹوں انتظار کرو اور کہاں یہ وقت کہ پلک جھپکتے میں آدمی جب چاہے دوسرے کی گردن دبوچ لے۔شیخ صاحب نے پھر سے موبائل کا سوئچ آف کرتے ہوئے بُڑبُڑ کے انداز میں داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کلامی کی۔''کیا کروں، کہاں جاؤں، رقم کی بابت سوچوں یا چہرے پر لگی سیاہی مٹاؤں؟''

☆

شروع شروع میں پاس پڑوس کے لوگوں نے خوب آوازیں کسیں۔بہت سے تو سودا لینے کے بعد یہ کہہ کر پیسے دینے سے انکاری ہو جاتے ''لکھ لے لکھ لے، جب گیان چند آئے گا تو پائی پائی چکا دوں گا'' کوئی کہتا ''باپ کا مال سمجھ کے ہضم کر لیا ہے کچھ ہمارا حصہ بھی تو ہے''

روز روز کی کِل کِل سے تنگ آ کر نورالٰہی نے دکان بند کرنے کا پکا ارادہ کر لیا بلکہ جب دو روز تک دکان نہ کھولی تو بھائی نے آ کر دریافت کیا تو نورالٰہی نے تمام حالات بیان کر دیے۔

''اُن کی تو۔۔۔وہ سارے دودھ کے دُھلے ہیں،کل سے میں بیٹھتا ہوں تیرے ساتھ دکان پہ پھر دیکھتا ہوں کس کے پیٹ میں درد ہوتا ہے؟''

طریقہ وہی اختیار کیا گیا کہ دکان میں موجود سامان بیچ کر پیسے اُنٹی میں لگا لیے اور کچھ عرصے تک خالی دکان میں بیٹھ کر لوگوں کو کنگال ہونے کا تاثر دیا۔آہستہ آہستہ گیان دی ہٹی، شیخاں دی ہٹی میں تبدیل ہو گئی۔دونوں بھائی منہ اندھیرے دکان پر جاتے اور رات اندھیرے واپس آتے مگر گاہک ختم نہ ہوتے۔ایک مکان سے دوسرا، تیسرا، چوتھا بنتا گیا اور نورا، نورالٰہی پھر شیخ نورالٰہی ازاں بعد حاجی شیخ نورالٰہی کے نام سے موسوم ہو گیا مگر دوسرے بھائی جھورے نے منظورالٰہی کے ساتھ کوئی پنج نہیں لگائی۔نہ وہ حج پہ گیا نہ اُسے شیخ کہلوانا پسند تھا۔

نورالٰہی کی شادی کو کئی برس بیت گئے تھے دو بیٹے اور ایک بیٹی آنگن میں کھیلتے کودتے پھر رہے تھے۔نورالٰہی اور بیگم نے باہمی مشورے سے ایک صاحبِ حیثیت گھر میں چھوٹے بھائی منظورالٰہی کا رشتہ طے کر دیا۔بارات کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں ۔شادی سے ایک رات پہلے قصائی گلی کی معروف طوائف بیگم جان کا مجرہ کرایا گیا جس میں اہلِ محلّہ اور رشتے داروں کے علاوہ دور دراز کے لوگوں نے بھی جوش و خروش سے شرکت کی۔شہر میں جشن کا سماں تھا۔ہر کوئی بیگم جان کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا،اچانک دو گروپ آپس میں لڑ پڑے۔گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔تڑتڑ کی آواز میں ہر کوئی اپنی جان بچانے کے لیے محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔کسی کو دولہا کی خبر نہیں تھی جو دل کے قریب گولی لگنے کے باعث ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

☆

اس بار بے خیالی میں شیخ صاحب نے پوری قوت سے موبائل کو دیوار سے دے مارا۔قسمت اچھی تھی موبائل دیوار تک پہنچنے کے بجائے ڈبل بید کے گدے پر جا گرا۔رِنگ ٹون مسلسل بجتی رہی جس پر شیخ صاحب نے منہ ہی منہ میں خود پر صلواتیں بھیجتے ہوئے سنا اَن سنا کر دیا۔

☆

''ابّا جی دیکھیں نا! ہم رقم ضائع تو کر نہیں رہے۔کاروبار میں لگا رہے ہیں۔ایک کے بجائے چار کاروبار ہوں گے تو منافع بھی چار گنا ہو گا۔اس طرح کے چار چار پمپ دوبارہ لگ سکتے ہیں ۔ہر بیٹے کی دلیل کے جواب میں

اُس کی شریک حیات حمایت میں لقمہ دینا نہ بھولتی۔ شیخ صاحب کچھ کہنے کے بجائے کبھی دائیں دیوار کو دیکھنے لگتے اور کبھی بائیں کو۔ جب زیادہ جی اچاٹ ہونے لگتا تو سر سے ٹوپی اُتار کر خارش کرنے لگتے۔

باری باری چاروں بیٹوں نے اپنی سی کر لی مگر معاملہ ڈھاک کے تین پات کی صورت میں جوں کا توں رہا۔ اس طرح کی کئی میٹنگز، محفلیں روز مرہ کا معمول بن گئی تھیں۔ ایک دن جب بیٹوں نے شیخ صاحب کو منہ کھولنے پر مجبور کیا تو شیخ صاحب نے سر سے ٹوپی اُتار کر آلتی پالتی ماری گود میں رکھتے ہوئے کہا:

''دیکھو بیٹا! بات پیٹرول پمپ تک محدود نہیں میرے پاس جو کچھ بھی ہے اُس کے اصل مالک آپ ہو، میں تو چوکیدار ہوں۔ میرا کام آپ کی امانت کی چوکیداری کرنا ہے۔ سیانے کہہ گئے ہیں''کوے کے کھانے کے بجائے دوہ کے کھانا بہتر ہے'' اللہ غریق رحمت کرے جب ورکشاپی محلے کے مکان کے پچاس ہزار مل رہے تھے تو تمہارا مرحوم چاچا اُسے بیچنے کے لیے اُتاؤلا ہو گیا تھا میں نے اُسے سمجھایا اور وہ میری بات مان گیا۔ آج تم منہ سے پچاس لاکھ نکالو اُس مکان کے کھڑا کھڑی مل جائیں گے۔ اسی طرح میں نے پیٹرول پمپ پانچ لاکھ کا لیا تھا جب ایک کروڑ کا ہوا تب سے تم لوگ اسے بیچنے کے درپے ہو۔ اگر میں آڑے نہ آتا تو بتلاؤ، ایک کے پانچ کیسے ہوتے؟

شیخ صاحب کی بات دلیل اور حقائق کی روشنی میں تو سب کے دل کو لگی مگر جب اپنی اپنی شریک حیات کی آنکھوں میں دیکھا تو ہر کسی نے شیخ صاحب کو غلط ثابت کرنے میں پورا زور لگا دیا۔ جان چھڑانے کے لیے شیخ صاحب نے بات اگلی نشست پر ٹال دی۔

اس بار شیخ صاحب کا تجربہ کام نہ آیا۔ شیخ صاحب کے دلائل اور مثالیں پرانی جبکہ لڑکوں کی وجوہات اور اُن سے جڑے پروگرام نئے انداز کے تھے جس میں جوش اور جذبات شامل ہو کر شیخ صاحب کو پگھلانے کے لیے کافی تھے۔ ترپ کے پتے کے طور پر شیخ صاحب نے نئی شرط بیان کر دی:

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، میں نے کونسا قبر میں لے جانا ہے کل کے بیچتے آج بیچ دو مگر ایک بات ذہن میں رکھنا، پیسوں کی تقسیم چار نہیں پانچ جگہ ہوگی۔''

''وہ کیوں؟'' (ایک ساتھ کئی آوازیں)

''وہ اس لیے میرے سپوتو، ابھی میں زندہ ہوں، میری ایک بیٹی ہے، اُس کے تین بچے ہیں، گیارہ پوتے پوتیاں ہیں، ہرج مرج ہے، غمی خوشی ہے۔ کیا ان سب چیزوں کے لیے میں تمہارے آگے ہاتھ پھیلاؤں گا؟''

''ابا جی! آپ کی دکان ہے نا، شیخاں دی ہٹی''

''یار مشتاق تین بچوں کے باپ سے اس طرح کی بچگانہ بات کی مجھے توقع نہیں تھی۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میرے لخت جگر، جس دکان کو پانچ آدمی چلاتے ہوں، کیا ایک ایک آدمی کیونکر چلا سکتا ہے وہ بھی اڑسٹھ سال کا بوڑھا؟''

''ملازم بھی تو رکھے جا سکتے ہیں؟''

''یار خدا کا خوف کرو، ساٹھ میں تو گورنمنٹ بھی ریٹائر کر دیتی ہے تم اٹھاٹھ میں مجھے دوبارہ بھرتی کرا رہے ہو۔''

☆

موبائل بیڈ پر پڑا پڑا خاموش ہو گیا تو شیخ صاحب کو فکر لاحق ہوئی۔ بوجھل قدموں سے اٹھتے ہوئے جیب سے رومال نکال کر ناک صاف کی اور موبائل اٹھا کر دیکھا تو وہ شیخ صاحب کا ہاتھ لگتے ہی پھر سے بول اٹھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دوسری طرف سے شیخ صاحب کو کسی قسم کی سختی یا ناراضگی کا سامنا ہے۔ شیخ صاحب نے منہ سے بولنے کے بجائے ناک، بھوں اور ہاتھ نچا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے پھر سے موبائل کی کنجی دبا دی۔

الغرض یہ کہ موقع کی جگہ، چلتا ہوا کاروبار، منہ مانگی رقم، ہاتھوں ہاتھ رجسٹری اور ہاتھوں ہاتھ بٹوارا ہو گیا۔ ایک بیٹے نے کپڑے کی دکان کھول لی، ایک نے موٹر سائیکل سیل اور سروس کی، ایک نے مرغیوں کی اور ایک بیٹے نے پیزا اور برگر یعنی فاسٹ فوڈ شاپ کھول لی۔

ان دنوں گھر میں نیا سامان، کپڑے اور نئی چیزیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ شیخ صاحب نے اپنے حصے کی رقم اکاؤنٹ میں جمع کرا دی اور دکان سے فروخت ہو کر جو رقم آئی وہ بھی یہ کہہ کر اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر لی کہ یہ اوکھے سوکھے وقت کے لیے تم لوگوں کی میرے پاس امانت ہے۔

پانچ وقت کی نماز کے بعد گھر کے بچے تھے اور شیخ صاحب۔ دن کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ دکان پر تو عام موبائل فون سے بخوبی کام چل رہا تھا۔ ایک دن چھوٹے بیٹے نے شیخ صاحب کا چیک کیش کرانے کے بعد اسمارٹ فون خرید کر شیخ صاحب کو یہ کہہ کر دیا''ابا جی! اس میں پوری دنیا آباد ہے۔ فلم، ڈرامہ، مشاعرے، مذاکرے، گیت، لطیفے جو چاہیں سنیں اور دیکھیں''

پہلے پہل تو شیخ صاحب اکثر جھنجھلا جاتے جب کوئی کال خود بخود کٹ جاتی یا من پسند پروگرام درمیان میں بند ہو جاتا۔ یہ مشکل ٹین ایج پوتے رومی نے بخوبی آسان کر دی۔

اب تو شیخ صاحب اتنے ماہر ہو گئے تھے کہ ہر وقت موبائل کان یا آنکھ سے لگا رہتا اور چہرے پر خاص قسم کی مسکان کے ساتھ ہاں ہاں، ہوں ہوں، ہے ہے، ہو ہو اور کبھی ٹھٹھے مار کر یا ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے اور زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتے۔

گھر کے افراد دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ کوئی کہتا آفتاب نے ابا جی کو اسمارٹ فون دے کر ٹھیک نہیں کیا، کوئی کہتا ابا جی مڑ کے جوان ہو گئے ہیں، کوئی کہتا مجھے تو ڈر لگتا ہے کسی دن ابا جی گھر سے ایک نکلیں اور دو ہو کر واپس آئیں

باقی صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ کیجیے

''عیدِ خمستاں''

شکیب جلالی

(اکتوبر ۱۹۳۴ء تا نومبر ۱۹۴۴ء)

علی گڑھ

سبھی نے عید منائی مرے گلستاں میں
کسی نے پھول پروئے کسی نے خار چنے

بنام اذن تکلم بنام جبر سکوت
کسی نے ہونٹ چبائے کسی نے گیت بنے

بڑے غضب کا گلستاں میں جشن عید ہوا
کہیں تو بجلیاں کوندیں کہیں چنار جلے

کہیں کہیں کوئی فانوس بھی نظر آیا
بطور خاص مگر قلب داغ دار جلے

عجب تھی عیدِ خمستاں عجب تھا رنگ نشاط
کسی نے بادہ و ساغر کسی نے اشک پیے

کسی نے اطلس و کمخواب کی قبا پہنی
کسی نے چاک گریباں کسی نے زخم سیے

ہمارے ذوق نظارہ کو عید دن بھی
کہیں پہ سایۂ ظلمت کہیں پہ نور ملا

کسی نے دیدہ و دل کے کنول کھلے پائے
کسی کو ساغر احساس چکنا چور ملا

بہ فیض عید بھی پیدا ہوئی نہ یک رنگی
کوئی ملول کوئی غم سے بے نیاز رہا

بڑا غضب ہے خداوند کوثر و تسنیم
کہ روز عید بھی طبقوں کا امتیاز رہا

○

یونس شرر

(نیویارک)

ان گلی کوچوں میں بے مصرف گزر جاتی ہے شام
درد تنہائی کو گہرا اور کر جاتی ہے شام

ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں، بیٹھتا جاتا ہے دل
کیسے سمجھاؤں کہ کیا مجھ پر گزر جاتی شام

کھیت ہوں، کھلیان ہوں کہ گاؤں ہوں یا شہر ہوں
غم زدہ آتی ہیں صبحیں، نوحہ گر جاتی ہے شام

دن کے پیچھے بھاگتے اور ڈوبتے سورج کے ساتھ
تیرہ و تاریک رستوں میں اتر جاتی ہے شام

راکھ دل سے جب اڑے تو گرد آنکھوں پر جمے
دل گرفتہ موسموں کے رنگ بھر جاتی ہے

سوکھے پتے جب ہوا سے، تالیاں دینے لگیں
سنگ برساتی فضاؤں میں گزر جاتی ہے شام

بے مہریٔ موسم وہی ہے، رت بدلتی ہی نہیں
بے امانی کی فصیلوں پر ٹھہر جاتی ہے شام

قافلہ میں شور ہے، کیوں سارباں خاموش ہے
ناقۂ لیلیٰ کو لے کر یہ کدھر جاتی ہے شام

چیختی ہے یہ زمیں کہ لوگ پتھر ہو گئے
دستکیں دیتی درو دیوار پر جاتی ہے شام

کیا نئی آیات اتریں گی، صحیفے بھی نئے
کیوں حدیثوں اور مباحث میں گزر جاتی ہے شام

رات آئی دن کی ساری رونقیں لٹنے لگیں
جاتے جاتے زندگی ویران کر جاتی ہے شام

○

ریاض احمد
(پشاور)

رونقِ دنیا کے میلے میں جو مل جاتے ہیں لوگ
دل جنہیں ڈھونڈھے نہ جانے وہ کہاں جاتے ہیں لوگ

کیا ہوئے جن کے تعلق سے یہ روح سرشار تھی
روشنی بن کر میری آنکھوں پہ چھا جاتے ہیں لوگ

ہے یہ دنیا اک سرائے جس میں ہر لمحہ یہاں
کوچ کر جاتے ہیں کچھ تو کچھ نئے آتے ہیں لوگ

امتحانِ زندگی میں موڑ کچھ ایسے بھی ہیں
کچھ سنبھل جاتے ہیں لیکن کچھ پھسل جاتے ہیں لوگ

دوست بن جاتے ہیں اور کچھ مہرباں بھی ہمسفر
کچھ بچھڑ جاتے ہیں لیکن کچھ بکھر جاتے ہیں لوگ

کارواں ہر دم رواں رہتے ہیں راہِ زیست پر
رہنما جن کے ہوں کشتی پار کر لیتے ہیں لوگ

یہ تو خوئے زندگی ہے امتحاں ہر موڑ پر
یونہی چلتے کارواں ہیں کچھ نکل جاتے ہیں لوگ

دل گرفتہ ہوں مگر یہ سوچتا ہوں رات بھر
عمر بھر ساتھ کہہ کر کیوں بدل جاتے ہیں لوگ

جانے جھوٹی آن کی خاطر جہاں میں کس طرح
آفتیں ہر سمت کی دن رات سہہ جاتے ہیں لوگ

زندگی ہے امتحانِ نفس، ہر ذی روح کا
امتحاں ہوتے رہیں، عشرت میں کھو جاتے ہیں لوگ

رات یہ عقدہ کھلا مجھ پر بالآخر یوں ریاضؔ
نفسِ امارہ ہو گر غالب تو رُل جاتے ہیں لوگ

○

اختر شاجہاں پوری
(بھارت)

خیال و فکر میں جو کہکشاں بناتے ہیں
زمیں پہ رہ کے وہی آسماں بناتے ہیں

سلام کرتا ہے سیلابِ وقت اُن کو ہی
جو دوسروں کے لیے کشتیاں بناتے ہیں

وہ جن کو خواب میں صحرا بہت ڈراتا ہے
کبھی وہ پھول کبھی تتلیاں بناتے ہیں

وہ ایک لمحہ جو تیرے کسی گماں میں نہیں
ہمیں تو ہیں جو اُسے جاوداں بناتے ہیں

یہ جانتے ہیں کہ کارِ عبث ہے شوق اُن کا
تو پھر وہ کس لیے بیساکھیاں بناتے ہیں

ہمیں ملے ہیں کچھ ایسے بھی دوست اب اخترؔ
ذرا سی بات کو جو داستاں بناتے ہیں

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

کوئی نسبت ضروری رہ گئی ہے
مری کوشش ادھوری رہ گئی ہے

تری محفل میں سچ اب کون بولے
یہاں جب جی حضوری رہ گئی ہے

کبوتر اڑ گئے ہیں رزق لے کر
فقط طوطے کی چوری رہ گئی ہے

کوئی تصویر آنکھوں میں نہیں ہے
نظر میں بے ظہوری رہ گئی ہے

سُنائی آپ نے تو بات ساری
ہماری نظم پوری رہ گئی ہے

ہمارے ہاتھ میں پڑھنے کی خاطر
کتابِ ناصبوری رہ گئی ہے

قدم اٹھتے نہیں اُس اَور ثاقبؔ
مگر دو گام دوری رہ گئی ہے

○

محمود شام
(کراچی)

یہ جو بیگانہ روی ہے ہم سے
پھر خطا کوئی ہوئی ہے ہم سے

کب جھکا سر یہ کسی کے آگے
کب زمانے کی بنی ہے ہم سے

کبھی جنگل نے کیا ہے اغوا
کبھی دریا کی ٹھنی ہے ہم سے

کہیں مل بیٹھیں بتائیں پھر ہم
زندگی کیسے کٹی ہے ہم سے

جو بھی کہنا ہے تو ڈٹ کر کہنا
یہ روایت بھی چلی ہے ہم سے

جو سمندر نے کہی تھی ہم سے
وہ پہاڑوں نے سنی ہے ہم سے

ہم نہ ہوں تو ہوں گلیاں گم سم
شہر میں زندہ دلی ہے ہم سے

بولنے لگتے ہیں خالی کمرے
بزم تنہائی سجی ہے ہم سے

جب سے دیوارِ انا توڑی ہے
چاندنی کھلنے لگی ہے ہم سے

○

قیصر نجفی
(کراچی)

کسی دامِ نظر میں آ گیا ہوں
میں پھر اک بار دھوکا کھا گیا ہوں

بس اتنی سی خطا ہے آسماں کا
زمیں کو پیرہن پہنا گیا ہوں

یہ کیا بستی ہے ہر اک موڑ پر میں
کسی پرچھائیں سے ٹکرا گیا ہوں

خزاؤں میں نکھار آیا تھا مجھ پر
بہاروں میں مگر مرجھا گیا ہوں

تمہیں شکوہ سرابوں سے ہے یارو
میں دریاؤں سے دھوکا کھا گیا ہوں

سبھی چہرے گلابی ہو رہے ہیں
یہ میں کیوں دھوپ میں سنولا گیا ہوں

ستارہ بن کے ٹوٹا ہوں تو قیصؔر
حصارِ شب سے باہر آ گیا ہوں

○

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل
(لاہور)

آنکھ سے آنکھ ملا اِتنا بھی نایاب نہ ہو
تُو کبھی سامنے آ اِتنا بھی نایاب نہ ہو

وقت اِک موڑ پہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا کبھی
وقت کو کام میں لا اِتنا بھی نایاب نہ ہو

بھولتے بھولتے میں بُھول نہ جاؤں تُجھ کو
اِس قدر دُور نہ جا اِتنا بھی نایاب نہ ہو

منتظر برسوں سے ہے چشمِ تمنّا تیری
رُخ سے تُو پردہ ہٹا اِتنا بھی نایاب نہ ہو

اور بھی سیکڑوں خوش رنگ ہیں تیری صورت
خود کو اِتنا نہ بنا، اِتنا بھی نایاب نہ ہو

ایک انسان ہے تُو اِتنا تُجھے یاد رہے
جیسے ہوتا ہے خُدا، اِتنا بھی نایاب نہ ہو

حُسن میں کوئی یہاں پر نہیں ثانی تیرا
تیرا فرمانا بجا اِتنا بھی نایاب نہ ہو

مار ڈالے گا تُجھے ذات کا زنداں ورنہ
توڑ دے اپنی اَنا اِتنا بھی نایاب نہ ہو

آسماں پھینک بھی سکتا ہے نبیل ایک طرف
پاؤں دھرتی پہ جما اِتنا بھی نایاب نہ ہو

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط.....۲۱

جی ہاں مہاراج۔ میں بنوں بی بی کا ڈیرہ وال تھا۔ یہ تصویر میں نے آج سے برسوں پہلے بنوں بی بی کے کہنے پر بنائی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اتنے عمدہ مصور بھی ہیں باپو، میں نے محوِ حیرت تصویر دیکھتے ہوئے باپو سے کہا۔ میں کہا کا مصور ہوں رے، میں تو ایک ترچھی لکیر بھی نہیں کھینچ سکتا۔ یہ تصویر تو میری دیوی نے مجھ سے بنوائی تھی، باپو نے اسی جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ میں نے باپو کو اتنا جذباتی اب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باپو نے سچ کہا تھا، دیوی دیوتاؤں کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔ اگر وہ شینا جیسی دس سالہ معصوم بچی سے ہزاروں میل دور بٹھوا کر میری تصویر بنوا سکتے ہیں تو ان کے لیے باپو سے کوئی تصویر بنوانا کون سا مشکل ہوگا۔ باپو نے مہاراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، مہاراج آپ کی پوتری واقعی پوتر تھی۔ بنوں بی بی کو اپنے لیے پوتری کی چاہت کا علم تھا اس لیے تصویر مکمل کروانے کے بعد بنوں بی بی نے مجھے سپنے میں حکم دیا تھا کہ اس تصویر کو پنچمی میں لے جا کر اپنے پاس رکھ کر بیٹھ جاؤں۔ تصویر لینے والا میرے پاس خود چل کر آئے گا اور تصویر پہچان کر مجھ سے لے جائے گا اور بالکل ویسا ہی ہوا۔ پنچمی میں موجود لاکھوں لوگوں میں سے صرف آپ کی پوتری نے آ کر مجھ سے تصویر کے بارے میں پوچھا تھا اور بنوں بی بی کی تصویر کو پہچانا تھا۔ مجھے یاد ہے اس روز راجکماری نے سفید ململ کا کڑھا ہوا کرتا اور سادہ پاجامہ پہنا تھا اور مہاراج آپ نے اس روز ملیشے کی لنگی باندھی تھی۔ تصویر دیتے وقت میرا جی چاہا تھا کہ بنوں بی بی کی اس دیوانی کا ماتھا چوم لوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکا تھا۔ باپو نے اپنی بات ختم کی تو وہاں پر موجود ہر فرد عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایک ایسی کیفیت جس کو بیان کرنے کے لیے ابھی تک الفاظ ایجاد نہیں ہوئے ہیں۔ ایسے الفاظ جو آنسوؤں کی زبان سے کہے جاتے ہیں اور دل کے کانوں سے سنے جاتے ہیں۔ مہاراج نے آگے بڑھ کر باپو کو گلے لگاتے ہوئے کہا، تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں معلوم بھی نہیں تھا کہ ہم کسی ان دیکھی ڈور سے نہ جانے کتنے جنموں سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہاں مہاراج، باپو بولے، ابھی تو آپ نے اس ڈور کا ایک اور سرا نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اکرام کی جانب رُخ کرتے ہوئے کہا، اکرام بابو، ذرا مہاراج کو اپنی ماتا جی کی تصویر تو دکھاؤ۔ اکرام نے اپنی جیب سے تصویر نکال کر مہاراج کے ہاتھوں میں رکھی۔ انہوں نے تصویر دیکھ کر اکرام سے پوچھا، آپ کی ماتا جی تو ہو بہو بنوں بی بی جیسی ہیں۔ میری امی کا نام بھی بنوں بی بی ہے مہاراج، اکرام نے جواب دیا۔ ہے بھگوان! یہ سب کیا ہے؟ بابا نے آکاش کی جانب دیکھ کر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ٹام نے کہا، مہاراج ابھی تو آپ نے میرے حصے کی کہانی نہیں سنی۔ چلو وہ بھی مجھے سناتے چلو گورے بابو، بابا بولے۔

ٹام نے اپنی وہی کہانی مہاراج کو سنائی جو ہمیں کلکتہ میں سنا چکا تھا لیکن اس نے کسی وجہ سے بچوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس رشتے سے جینا مہاراج کی نواسی لگتی تھی۔ لیکن ابھی تک ٹام نے مہاراج کو جینا سے اس کے رشتے سے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور میں بھی ٹام کی مرضی کے بنا اپنی طرف سے یہ اعلان نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا۔ مہاراج کو ابھی تک اکرام سے اپنے رشتے کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں تھا۔ ٹام کی کہانی سننے کے بعد مہاراج بولے، مجھے پوتری کی شادی کی خبر سب سے پہلے اس کی سکھی پارو نے دی تھی۔ پارو میری پوتری کی بچپن کی سہیلی تھی۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ پارو بھی مجھے پوتری کی طرح بابا کہتی تھی۔ مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب پارو اپنے پتی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی اور آتے ہی بولی بابا میں آپ کی پوتری کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا، اس کی کون سی ایسی بات ہے جو مجھ سے چھپی ہے؟ وہ تو مجھے اپنے ہر کام میں اور اپنے ہر راز میں شریک رکھتی ہے۔ پارو بولی، آپ کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ اس نے انگلینڈ میں ایک پٹھان لڑکے کو پسند کر کے اس سے شادی کر لی ہے۔

مجھے پارو کی بات تسلیم کرنے میں کافی وقت لگا کیونکہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک برہمن کا خون ہوتے ہوئے میری پوتری کسی پٹھان کی ہو جائے گی۔ لیکن میں ایک بات بڑے وثوق سے جانتا تھا کہ پوتری کا یہ فیصلہ یقیناً جذباتی نہیں تھا۔ وہ ایک پختہ کردار اور پختہ ذہن کی سلجھی ہوئی لڑکی تھی اور اس نے اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ کبھی جذباتی بنیاد پر نہیں کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پوتری نے اپنے لیے لاکھوں میں ایک چنا ہوگا۔ پارو نے پوتری کا ایک خط مجھے دیتے ہوئے کہا، پوتری نے یہ خط آپ کے نام بھجوایا ہے۔ یہ کہتے ہوئے مہاراج نے اٹھ کر کمرے میں الماری سے ایک صندوقچہ نکال کر کھول کر اسے اپنے سامنے رکھا اور اس میں سے ایک خط نکال کر مجھے پکڑاتے ہوئے کہا، ٹام بابو کو پڑھ کر سناؤ۔ میں نے جواب دیا، ٹام بابو ہندی جانتے ہیں بابا۔ اس کے باوجود میں نے پوتری کا پتر زور سے پڑھ کر سب کو سنایا:

بہت ہی پیارے بابا

آپ کی پوتری نے اپنے جیون میں پہلی اور شاید آخری بار آپ کی آشیرباد کے بنا کوئی کام کیا ہے۔ جی ہاں بابا! پارو نے آپ کو سچ بتایا ہے کہ میں نے اپنے لیے ایک جیون ساتھی چنا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ فیصلہ میرا نہیں دیوتاؤں کا ہے۔ میری اس بات کی تصدیق آپ میرے پتی سے مل کر کریں گے کہ میرا کہا کس حد تک سچ ہے۔ میں اپنے جیون ساتھی کو آپ کی آشیرباد کے لیے لانے کی آ گیا چاہتی ہوں۔ باقی تفصیل آپ کو منہ برابر بتاؤں گی۔

آپ کی پوتری

خط پڑھنے کے بعد پارو کو رخصت کر کے میں نے اسی وقت کیلاش کو بلا کر بتایا۔ کیلاش کو پوتری پہلے ہی ناپسند تھی اس خبر سے وہ خاصا مشتعل ہوا لیکن

میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے ساتھ ہی کہا کہ ابھی ابھی تار دے کر پوتری کو اپنے پتی کے ساتھ ہندوستان بلواؤ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب غیر ممالک ٹیلی فون نہیں ہوسکتا تھا اور تار پیغام رسانی کا سب سے تیز رفتار ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ تار کے ایک ہفتہ بعد ہمیں پوتری کا جوابی تار موصول ہوا کہ وہ کلکتہ کے ائیر پورٹ پر پہنچے گی۔ ان دنوں کانپور میں بڑا ائیر پورٹ بھی نہیں تھا۔ باہر کے ملک سے جہاز کلکتے، بمبئی اور دلی جیسے بڑے شہروں میں اترتے تھے۔ کیلاش نے ان کو کلکتہ سے لانے کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ کیلاش کلکتہ میں اپنے ملازم جسونت کے ساتھ دو دن انتظار کرتا رہا لیکن پوتری نہیں آئی۔ کیلاش نے میرے کہنے پر پوتری کو لندن میں ایک اور تار بھجوایا۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

دو ہفتے بعد میں نے کیلاش کو لندن بھجوایا تا کہ وہ اپنی بہن کی خیر خبر لائے۔ کیلاش واپسی پر روتا ہوا آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ اسے اپنی بہن اور اس کے پتی کا لندن میں کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن اسے پشاور سے آیا ہوا یہ پتر پوتری کی مالکِ مکان عورت سے ملا تھا۔ یہ کہتے ہوئے مہاراج نے اسی صندوقچے سے ایک اور خط نکال کر اس بار ٹام کے ہاتھ میں پکڑایا۔ ٹام نے خط دیکھ کر میرے حوالے کیا۔ یہ خط چونکہ اردو میں لکھا ہوا تھا اور ٹام کو اُردو پڑھنی نہیں آتی تھی اس لیے ٹام نے مجھے پڑھنے کو دیا تھا جسے میں سب کو پڑھ کر سنایا:

ناخلف بیٹے

میں تجھے اپنی جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ آج کے بعد تم ہمارے خاندان کے لیے مر چکے ہو۔ میں جلد ہی اپنے بدرقے بھجوا کر تمہیں اور تمہاری کافر بیوی کو مروادوں گا۔

خط کے آخر میں کسی کے دستخط تک نہیں تھے۔ کیلاش کی تحقیق کے مطابق پٹھانوں نے اپنے غنڈے بھجوا کر پوتری اور اس کے پتی کو ہندوستان آنے سے پہلے ہی مروا دیا تھا۔ یہ کہہ کر بابا کی آواز حلق میں پھنس گئی اور اسی پھنسی ہوئی آواز میں انہوں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، اس واقعے کے بعد مجھے میری پوتری کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس سے پہلے کہ میں اس معاملے میں مزید کچھ اقدام کرتا میرے گھر میں کیلاش کی بیماری کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک ہفتے بعد کیلاش نیم پاگل ہوگیا۔ اس کے بعد بابا سب کو کیلاش کی بیماری کے بارے میں بتانے کے بعد بولے، معلوم نہیں میرے کون سے پاپوں کی سزا مجھے اب تک مل رہی ہے۔ میری پوتری کو پٹھانوں نے اور میرے کیلاش کو بھگوانوں نے مجھ سے چھین کر مجھے اس بھرے سنسار میں رونے کو اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ یہ کہہ کر بابا سب کے سامنے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ بابا کی معلومات کے مطابق ان کی بیٹی کو پٹھانوں نے مروایا تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوجاتا کہ ان کی بیٹی کو مروانے والے پٹھان کا بیٹا اس وقت ان کی چھت کے نیچے بیٹھا ان کی باتیں سن رہا ہے تو ان کا کیا حال ہوتا؟ اس وقت مجھے ٹام کی فراست پر رشک آیا کہ اس نے یہ خبر بابا سے چھپا کر اس مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ ہونے سے بچا لیا اور میں دل ہی دل میں شکر کر رہا تھا کہ میں نے بھی بے قابو ہو کر اس راز کو بابا پر نہیں کھولا تھا ورنہ اس ساری پیچیدگی کی ذمہ داری میرے سر آتی۔

بابا کے آخری جملے کے ردِعمل کے طور پر میں نے اکرام کا غصے سے گلنار چہرہ دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی اپنے باپ کے دفاع کے لیے مہاراج پر پھٹ پڑے گا۔ اگرچہ یہ سچ تھا کہ اکرام کے والد نے بیٹے کو اپنے بدرقے بھجوا کر مروانے کی دھمکی ضرور دی تھی لیکن اس نے اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنایا تھا۔ ورنہ اکرام ہمیں یہ سب کچھ بتا چکا ہوتا۔ اکرام کے مطابق آغا جی اس واقعے کے بعد دس سال تک زندہ رہے لیکن اس نے گھر کے کسی فرد کو اپنے بیٹے کا نام تک نہیں لینے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کیلاش کا دوسرا خادم خاص غفار یاد آیا۔ غفار کے بقول اس کے پاس کیلاش کے کئی پاپوں کی ایک بڑی پوٹلی تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ کیلاش کے پاپوں کا زندہ ثبوت تھا اور اس نے مجھے وہ سب کچھ بتانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن میں اُس وقت کیلاش کے پاپوں کی پوٹلی جان کر نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ کیلاش کے پاپوں کی پوٹلی سے کوئی ایسا ثبوت برآمد ہو جائے جو اس عقدے کو حل کرنے میں ہماری مدد کرے؟ میرا جواب یقیناً اثبات میں تھا۔ میں نے پاس بیٹھے ہوئے غصے سے سرخ اکرام کا ہاتھ پکڑ کر دبایا، میری مراد اسے تھوڑا صبر کرنے کی تلقین کرنا تھا۔ اس نے میری جانب دیکھا تو میں نے اسے آنکھوں کے اشارے سے کچھ دیر صبر کرنے کی تلقین کی اور سب سے مخاطب ہو کر کہا، میرے خیال میں یہ کہانی یہاں پر آ کر ختم نہیں ہوتی۔ کہانی نے یہاں ایک نیا موڑ کاٹا تھا اور میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جس نے کہانی کو وہ موڑ مڑتے دیکھا تھا۔

کیا مطلب؟ کیا تمہارے خیال میں میری پوتری ابھی زندہ ہے؟ بابا نے حیران ہو کر پوچھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اس روداد کا ایک اور عینی گواہ ابھی تک زندہ ہے جو اس مسئلے پر شاید کچھ اور روشنی ڈال سکتا ہے۔ سب نے میری جانب اضطرابی نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا، مجھے معلوم ہے کہ راجکمار کیلاش کے دو خاص ملازم تھے۔ ایک کا نام جسونت اور دوسرے کا نام غفار تھا۔ بابا نے میری بات کے جواب میں اپنی گردن تصدیق میں ہلائی تو میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، جسونت کی لاش کیلاش کے پاگل ہونے کے چند ماہ بعد سندر بن کے علاقے سے ملی تھی۔ پولیس رپورٹ کے مطابق اس کی موت سانپ کاٹے سے ہوئی تھی۔ کیلاش کا دوسرا ملازم خاص غفار تھا جو اس دوران کیلاش کا راز دان تھا لیکن انہیں دنوں اچانک کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ وہ کیلاش کے جیون تک روپوش ہی رہا تھا اور کیلاش کے پرلوک سدھارنے کے بعد اچانک واپس آ گیا اور آج کل کانپور میں لکشمی چوک پر ایک کریانے کی دکان چلاتا ہے۔ میں پچھلی بار اس سے ملا بھی تھا اور اس نے مجھے کیلاش کے بارے میں کچھ بتانے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن اس وقت مجھے سننے میں دلچسپی نہیں تھی۔ اگر آپ لوگ کچھ انتظار کریں تو میں ابھی جا کر غفار کو یہاں لاسکتا ہوں اور اگر اس کے پاس

اس سلسلے میں مزید مواد ہوا تو ہمیں شاید اس کہانی کا کوئی اور سرا مل جائے۔

مہاراج نے کہا، ٹھیک ہے تم جا کر غفار کو یہاں لاؤ اور میں کچھ دیر آرام کرتا ہوں۔ نیتو بابا سے بولی، چلیں بابا آپ آرام کریں اور میں آپ کا سر دباتی ہوں۔ بابا نے مسکرا کر اسے اجازت دے دی۔ ٹام، جینا اور باپو اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھے۔ میں وہاں سے اٹھا تو اکرام نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا، میں بھی تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ میں نے جواب دیا، تو چلیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے صدر دروازے کی جانب بڑھے۔ کلو مجھے صدر دروازے پر ملا تو میں نے اس سے پوچھا، خیریت ہے کلو تم آج تاش کی بازی نہیں لگا رہے؟ وہ میری بات سمجھ کر کچھ جھینپ سا گیا۔ زیادہ پریشان کرنے کی بجائے میں نے اسے گاڑی لانے کو کہا۔

چند منٹوں کے اندر اکرام اور میں گاڑی میں جا بیٹھے۔ اکرام نے چھوٹتے ہی پوچھا، مہاراج سمجھتے ہیں کہ ہمارے آغا جی نے ارمہ بھابھی اور انعام بھائی کو مروا دیا ہے۔ کیا تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟ میں نے جواب دیا، ایسی کوئی بات نہیں۔ مہاراج نے جو کچھ بھی کہا ہے اپنی معلومات کے مطابق کہا ہے۔ میرے پاس بھی اگر مہاراج کی طرح کا کوئی ثبوت ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتا۔ پھر میں نے اکرام سے سوال کیا، اگر آپ کے پاس مہاراج کا بالکل ایسا ہی خط ہوتا تو کیا آپ مہاراج کو اپنے بھائی کا قاتل نہ سمجھتے؟ اکرام نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا، ہاں تمہاری بات درست ہے۔ میں مہاراج ہی کو اپنے بھائی کا قاتل سمجھتا۔ میں نے اپنی دلیل کی تفصیل میں جاتے ہوئے کہا، میرے خیال میں مہاراج نے اپنی جانب سے کوئی تحقیق کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ان کا ذہن پچھلے اٹھارہ سالوں سے اس بات پر اٹکا ہوا ہے کہ پٹھانون نے ان کی بیٹی کو مروا دیا تھا۔ اگر آپ مہاراج سے جھگڑ کر اپنے والد کی صفائی میں کچھ کہتے تو بات ان کی سمجھ میں نہ آتی بلکہ اور الجھ جاتی۔ ان کے دل و دماغ میں پچھلے اٹھارہ سال سے پکے ہوئے ناسور کو نکالنے کے لیے زبانی کلامی باتوں سے زیادہ ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کو صبر کرنے کا اشارہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ غفار اس سلسلے میں ہماری لیے کافی مددگار ہوگا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ابھی تک ٹام نے مہاراج کو آپ کے بارے میں حقیقت نہیں بتائی ورنہ یہ باتیں اتنے ٹھنڈے ماحول میں نہ ہوتیں۔ اکرام بولا، تم ٹھیک کہتے ہو، جب مجھے معلوم ہوا کہ میری بھابھی ارمہ مہاراج کی بیٹی تھیں تو میں بھی انہیں بتانے لگا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ میں نے کہا، میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن میں نے بھی اپنا منہ بند ہی رہنے دیا۔ کبھی کبھار بن سوچے منہ سے نکلنے والی بات شرمندگی کا باعث ہوتی ہے۔

انہی باتوں کے دوران ہم لوگ لکشمی چوک پہنچ گئے۔ میں نے گاڑی دکان کے قریب سڑک کے ایک جانب کھڑی کی اور دکان پر گیا تو وہاں کوئی اور بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے غفار کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے گھر پر آرام کر رہے ہیں۔ وہاں سے پیدل چل کر ہم دونوں غفار کے گھر پہنچے۔ میں نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی تو اندر سے ان کی آواز آئی، کون ہے؟ میں نے جواباً اپنا نام بتایا تو انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا، ارے بھانجے یہ تم ہو۔ تمہیں دروازہ کھٹکھٹانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اندر آ جاؤ۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا میرے ساتھ ایک مہمان ہیں ماموں۔ اچھا اچھا ایک منٹ ٹھہرو۔ کچھ دیر بعد آواز آئی، اندر آ جاؤ۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ غفار صحن میں بچھی ایک چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہمیں دیکھ کر نیم دراز ہو کر کہنے لگے، کیسے آنا ہوا بھانجے؟ میں نے جواب میں اکرام کا تعارف کرواتے ہوئے کہا، یہ ہمارے پاکستان سے آئے ہوئے مہمان اکرام ہیں۔ ان کو گھماتا پھرا رہا ہوں۔ کانپور آنا ہوا تو سوچا آپ کی ملاقات ان سے کرواتا چلوں۔ اوہ! اچھا اچھا! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ انہوں نے اکرام سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا آپ پاکستان میں کہاں رہتے ہیں؟ ہم پشاور رہتے ہیں، اکرام نے جواب دیا۔ جی میرا ایک بھائی اور ہمارے کچھ رشتے دار تقسیم کے وقت وہاں گئے تھے۔ میرا بھائی تو منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں ہوتا ہے۔ اس سے کبھی کبھار خط و کتابت رہتی ہے لیکن باقی رشتہ داروں کا کوئی پتہ نہیں۔ کیا آپ بھی یہاں اپنے رشتے داروں سے ملنے آئے ہیں؟ غفار نے اکرام سے سوال کیا تو اکرام نے جواب دیا جی کچھ ایسا ہی ہے۔ غفار نے پوچھا آپ کے رشتہ دار یہاں کس علاقے میں رہتے ہیں؟ جی ہاں میری بیگم کے کچھ جانکار اجمیر میں ہیں، اکرام نے جواب دیا۔

کیا آپ نیلم جی کے کسی رشتہ دار کو جانتے ہیں، میں نے اکرام سے پوچھا، مجھے زیادہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ نیلم کے رشتہ دار نواب کرنا ٹک کے خاندان سے ہیں، اکرام نے جواب دیا۔ میں نے کہا، میں اجمیر شریف میں نواب کرنا ٹک کے خاندان کے کچھ لوگوں کو جانتا ہوں۔ اگر آپ کی نیلم جی سے بات ہو تو ان سے ان کے ہندوستانی رشتہ داروں کے نام ضرور پوچھیں، ہو سکتا ہے کچھ واقفیت نکل آئے اس طرح آپ کو ہندوستان آنے کا ایک اور بہانہ مل جائے؟ میں نے اکرام سے کہا۔ وہ بولے ہاں میں ایسا کروں گا لیکن سرِ دست ایک گتھی تو پہلے سلجھا لیں۔ ایسے میں اندر سے دروازہ کھٹکا۔ غفار اندر گئے اور واپسی پر ایک ٹرے میں پہلے چائے لائے۔ دوبارہ اندر جا کر اسی ٹرے میں سموسے، پکوڑے اور کچھ بسکٹ لائے۔ ہم دونوں نے چائے لی۔ میں نے غفار کے کہنے کے باوجود سموسے، پکوڑے اور بسکٹ نہیں کھائے۔

چائے کے دوران ہی میں نے غفار سے کہا، ماموں میں آپ سے کیلاش کے بارے میں سننا چاہتا ہوں۔ وہ بولے، ضرور تم جب چاہو میں تمہیں اس کی کہانی سنا سکتا ہوں۔ میں نے کہا، یہاں نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ پرکاش بھون چل کر یہ باتیں مہاراج کے سامنے ہمیں سنائیں۔ پرکاش بھون کے نام پر ان کا رنگ زرد پڑنے لگا اور انہوں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا، نہیں، نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گا اور نہ ہی وہاں پر کسی کے سامنے یہ

سب کچھ کہوں گا۔ میں نے کہا، ماموں اگر آپ یہ کہانی مجھے بتا سکتے ہیں تو پھر مہاراج کے سامنے بتانے میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟ کہنے لگے، میں نے مہاراج کا نمک کھایا ہے۔ اس لیے ان کے سامنے ان کی اولاد پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہتا۔ میں نے کہا، کیچڑ تو تب اچھالا جاتا ہے جب کسی پر بہتان لگایا جاتا ہے۔ میں آپ کو کسی بہتان بازی کے لیے نہیں کہہ رہا۔ میں آپ سے سچ کہنے اور سنانے کو کہہ رہا ہوں۔ کہنے لگے، وہ تو ٹھیک ہے لیکن شیطان بھی مرنے والے کا پیچھا تو چھوڑ دیتا ہے۔ پرانے زخم کریدنے اور کیلاش کے کرتوت سن کر مہاراج کو دکھ کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا، مہاراج کو شاید کیلاش کے کرتوتوں سے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو لیکن میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جن کے زخموں پر آپ کی باتیں مرہم بن جائیں گی۔ کیا کیلاش کے کرتوتوں کی گواہی کا بوجھ آپ کے ضمیر پر نہیں پڑتا؟ وہ بولے کبھی کبھی تو یہ بوجھ مجھے کئی کئی راتیں جگائے رکھتا ہے۔ میں نے نصیحت بھری آواز سے کہا، ماموں، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنے ضمیر کو اس بوجھ سے ہلکا کر کے نہ صرف چین کی نیند سوئیں بلکہ اپنے خدا کے آگے بھی سرخرو ہو کر جائیں۔ غفار کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا، تمہاری بات بجا ہے بھانجے، میں کم از کم اپنے خدا کے حضور تو مطمئن ہو کر جاؤں۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو آپ ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔ مہاراج ہم سب کا انتظار کر رہے ہیں۔ غفار نے اندر جا کر اپنی بیوی کو بتایا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔

ہم ابھی بھون جانے کے لیے گاڑی میں نہیں بیٹھے تھے کہ غفار بولا بھانجے بھون جانے سے پہلے میں ایک دو منٹ کے لیے بنک سے ہو آؤں۔ یہ کہہ کر وہ ایک قریبی بنک کی عمارت میں داخل ہوا۔ کچھ دیر بعد واپس آ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا، چلو اب میں بھون جانے کو تیار ہوں۔ بھون واپسی کا راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ گاڑی جوں جوں بھون کے قریب آتی گئی دُوں دُوں غفار کا رنگ گہری پیلاہٹ پکڑتا گیا۔ میں نے اس کا رنگ فق ہوتا دیکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا، ماموں آپ بہت بڑی نیکی کا کام کرنے جا رہے ہیں اس لیے آپ کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گاڑی صدر دروازے کے پاس روک کر ہم اترے تو کلو نے آ کر کہا، مہاراج مہمانوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کہا ہے کہ آپ آئیں تو آپ کو سیدھا وہیں بھجوا دیں۔ غفار بولا، میں نوکر آدمی ہوں آپ مجھے یہیں چھوڑ دیں۔ کھانا کھا کر مجھے یہاں سے لے جانا۔ میں نے کہا، ماموں آپ اس وقت ہمارے مہمان ہیں اس لیے آپ بھی ہمارے ساتھ کھانا کھانے چلیں۔ وہ ہچکچاتے ہوئے راضی ہو گیا۔ ہم تینوں چلتے ہوئے کھانے کے کمرے میں پہنچے، سب لوگ کھانے میں مصروف تھے اس لیے ہم بھی ایک ایک کرسی پکڑ کر کسی سے کچھ کہے بنا کھانے پر جُت گئے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب ایک ایک کر کے اٹھ کر مہاراج کے ساتھ بیٹھک میں جا بیٹھے۔ بیٹھتے ہی غفار نے مہاراج کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا، میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں سرکار، میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اس لیے اب تک میں خاموش تھا۔ اگر میرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے جو آپ کے شانِ شایان نہ ہو تو میرے منہ سے نکلنے والی بات کسی اور کی کہی ہوگی۔ آج میں آپ کو جو کچھ بتانے جا رہا ہوں وہ میں نے اپنے ساتھ قبر میں لے جانے کا عہد کیا تھا لیکن اپنے ضمیر کے بوجھ اور بھانجے کے کہنے پر آپ کو بتانے حاضر ہوا ہوں۔ مہاراج بولے، مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے یہاں آ کر اپنے ضمیر کو ہلکا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ابھی غفار نے کچھ کہنا شروع نہیں کیا تھا کہ میں نے ٹام سے پوچھا کہ آیا اسے غفار کی باتیں سمجھ آ رہی ہیں یا نہیں اور اگر وہ چاہے تو میں ساتھ ساتھ اس کے لیے غفار کی گفتگو کا انگریزی میں ترجمہ کرتا جاؤں۔ ٹام بولا، ابھی تک تو اس کی ساری گفتگو میرے سمجھ میں آئی ہے اس لیے فی الحال ترجمے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس تم ذرا اس دوران میرے قریب بیٹھنا، اگر ترجمے کی ضرورت پڑی تو تم سے پوچھوں گا۔ قریب پڑے ہوئے جگ سے میں نے کچھ پانی ایک گلاس میں انڈیل کر غفار کے ہاتھوں میں تھمایا۔ غفار کا چہرہ پیلا ہلدی ہو رہا تھا، اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور وہ بار بار سامنے رکھے ہوئے پانی کے گلاس سے ہلکی سی چسکی لے کر ہونٹوں پر اپنی زبان پھیرتا تھا۔ اس نے پانی کے چند گھونٹ لئے اور گلاس اپنے سامنے میز پر رکھتے ہوئے مہاراج سے مخاطب ہو کر کہا، سرکار یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ راجکمار کیلاش آپ سے اور راجکماری ارمہ سے کبھی خوش نہیں تھا۔ آپ کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو کہ کیلاش کا خیال تھا کہ راجکماری ارمہ اپنی چالوں سے آپ کو اس کے خلاف کر رہی ہے۔

وہ ہر وقت اس کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح آپ کو اور راجکماری ارمہ کو اپنے راستے سے ہٹا دے۔ اس نے کئی بار آپ اور ارمہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہمیں لاکھوں کی جائیداد کے علاوہ نقد انعام دینے کا لالچ بھی دیا۔ لیکن بھون کے تمام ملازمین آپ اور راجکماری کا سچے دل سے احترام کرتے تھے اس لیے کسی نے کیلاش کے مسلسل اصرار کے باوجود آپ لوگوں کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ آپ کو شاید یاد ہو یا نہ ہو کہ ایک بار راجکماری کی گاڑی کا ایک حادثہ بھی ہوا تھا جس میں راجکماری کو معمولی چوٹیں آئیں تھی۔ مہاراج نے جواب دیا، ہاں مجھے وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ پوتری اس وقت میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں تھی۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گھر آ رہی تھی جب وہ حادثہ ہوا تھا۔ جی ہاں، بالکل وہی حادثہ مہاراج۔ وہ حادثہ راجکمار نے ایک لاکھ روپے دے کر کروایا تھا۔ غفار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، راجکماری کے لندن جانے کے دنوں بھی کیلاش نے ان کا خاتمہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن یہ بیل بھی منڈھے نہیں چڑھی تھی۔

بات اس وقت بگڑی جب راجکماری کی ولایت میں کسی مسلمان سے شادی کرنے کی خبر کیلاش کو ملی۔ کیلاش کا خیال تھا کہ آپ راجکماری کو عاق کر دیں گے اور وہ ایک بار پھر آپ کا حقیقی ولی عہد بن جائے گا۔ لیکن جب آپ نے راجکماری کے پتی کو اپنی آشیر باد دینے کے لیے یہاں بلوایا تو کیلاش کا غصہ نقطۂ

عروج کی ایسی منزل تک پہنچ گیا جہاں سے ہر راستہ انتقام کو جاتا تھا۔ کیلاش نے اپنے خصوصی آدمیوں جن میں جسونت سرِ فہرست تھا پر تین دھاری ہتھیار آزمایا۔ پہلی دھار سے کیلاش نے جسونت کی ہندو رگ مسلمانوں کے خلاف بھڑکائی۔ اس نے جسونت سے کہا کہ ارمہ نے ایک موسلے کی گود میں جا کر ہمارے دھرم کو اور ہمارے دھرم کے ماننے والوں کی غیرت کو للکارا ہے۔ اگر ہم سچے دھرمی ہونے کے داعی ہیں تو ارمہ کے ساتھ اس موسلے کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ ہندوؤں کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان دنوں پاکستان بن چکا تھا اس لیے کیلاش نے ہندوستان اور پاکستان کی دشمنی کو دوسری دھار کے طور پر استعمال کیا۔ کیلاش نے اس دھار کو ہوا دیتے ہوئے کہا کہ ارمہ نے ایک پاکستانی سے بیاہ کر کے ہندوستانیوں کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ ہندوستان کی بیٹی ان کے دشمنوں سے مل کر قوم سے غداری کی مرتکب ہوئی ہے جس کی سزا موت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ تیسری دھار ذات پات کی بنیاد پر تھی۔ کیلاش کے بقول، ایک برہمن کی عزت پٹھانوں کے ہاتھوں لٹوانے والی ارمہ اگر موت کے گھاٹ نہ اتار دی گئی تو برہمن ہندوستان تو کیا پوری دنیا میں منہ چھپاتے پھریں گے۔

جسونت پر کیلاش کے تینوں وار خاصے کارگر ثابت ہوئے اور اس نے کھلے دل سے کیلاش کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ جسونت کا خیال تھا کہ کیلاش کا ساتھ دینے سے وہ اپنے ملک پر، اپنے دھرمیوں پر اور برہمن آقاؤں پر بہت بڑا احسان کرے گا۔ نہ صرف کیلاش بلکہ ہم سب کو راجکماری ارمہ کی بنوں بی بی سے عقیدت کا اچھی طرح علم تھا۔ راجکماری نے انگلستان جاتے ہوئے بھی ایک دن سندر بن بنوں بی بی کے ڈیرے پر جا کر دان دیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ آتے وقت بھی سندر بن میں بنوں بی بی کے ڈیرے پر کچھ دان دینے سے پہلے بھون نہیں جائے گی۔ مہاراج جب آپ کی تار کے جواب میں ہمیں راجکماری کے آنے کا جوابی تار موصول ہوا تو کیلاش نے جسونت کے ساتھ مل کر لائحہ عمل طے کیا کہ کیلاش راجکماری اور اس کے پتی کو سندر بن کے ایک متعین مقام پر لے جائے گا جہاں جسونت پہلے سے چھپا ہوگا جو اُن پر بے خبری سے وار کر کے انہیں ختم کر دے گا۔ سندر بن جیسے عظیم جنگل میں اتنے گوشت خور جانوروں کی موجودگی میں ان دونوں میں سے کسی کی ہڈی تک نہیں ملے گی اور کسی کو اصل واقع کی کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ کیلاش کو یقین تھا کہ سندر بن اتنا گھنا جنگل ہے کہ دو لاکھ انسانوں کی لاشیں بھی اس میں آسانی سے گم ہو جائیں گی۔ ائیر پورٹ سے خالی ہاتھ واپسی پر وہ مہاراج سے کہہ دیں گے کہ ارمہ کسی نامعلوم وجہ سے نہیں آئی اور مہاراج اسے انگلستان میں کھوجتے پھریں گے۔

لیکن راجکماری اپنے پتی کے بجائے اپنے چھ ماہ کے بچے کے ساتھ کلکتہ ائیر پورٹ پر اتری تھی۔ اس نے کیلاش کو بتایا کہ اس کے پتی کچھ دن بعد آئیں گے تو کیلاش کو اپنا سارا پلان فیل ہوتا نظر آیا کیونکہ اسے ارمہ کے بچے کے بارے میں ابھی تک کوئی علم نہیں تھا۔ ارمہ نے حسب توقع سندر بن میں بنوں بی بی کے ڈیرے کی یاترا کا کہا۔ کیلاش ارمہ کو متعین مقام پر لے گیا جہاں جسونت نے پیچھے سے وار کر کے راجکماری کو قتل کر دیا۔ دونوں نے چھوٹے بچے کو قتل کرنے کی بجائے وہیں جنگل کے جانوروں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑا اور کلکتہ واپس آ کر آپ سے کہا کہ ارمہ نہیں آئی۔ اسی روز کیلاش نے مجھے انعام کے نام انگلستان میں ایک تار دینے کے لیے بھجوایا۔ تار کا مضمون تھا تمہارا بیٹا سخت بیمار ہے۔ جلدی پہنچو۔ تار کے تیسرے دن ہمیں انگلستان سے انعام کا جوابی تار ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ ایک دن بعد کلکتہ آ رہا ہے۔ اس تار کو وصول کرنے کے بعد راجکمار کیلاش نے مجھے کہا کہ میں کلکتہ جا کر راجکماری کے پتی کا کام تمام کر دوں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے مجھے اور میرے گھر والوں کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تو میں روپوش ہو کر پاہیرالہ چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ راجکمار نے جسونت کو اس کام کے لیے بھی بھجوایا تھا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ علم نہیں۔

مہاراج نے غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، میرا بیٹا میری بیٹی کے خلاف اتنے گھناؤنے پلان بناتا رہا اور تم نے مجھے اس کی خبر نہیں دی؟ اس لیے کہ میں نہ صرف راجکمار کا پانچ ہزار روپے کا مقروض تھا بلکہ مجھے اپنی جان کا خوف بھی تھا، سرکار۔ یہ کہتے ہوئے غفار نے اپنی جیب سے بنک کا پانچ ہزار روپے کا ایک ڈرافٹ نکال کر مہاراج کے ہاتھ میں پکڑایا اور کہا، سرکار یہ رہی میری قرض کی رقم۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ غفار یہاں آنے سے پہلے بنک کس لیے گیا تھا۔ میں اس رقم کا کیا کروں گا مہاراج نے بنک ڈرافٹ غفار کو دیتے ہوئے کہا۔ اگر تم ان چندروپوں کے ادھار سے خوفزدہ ہونے کی بجائے مجھے اس کی باتوں سے آگاہ کر دیتے تو آج میری پوتری زندہ ہوتی۔ غفار روتے ہوئے بولا، آپ درست کہتے ہیں مہاراج، ان دنوں میں جوان تھا اور جوانی میں انسان جذباتی فیصلے کرتا ہے اور میرا وہ فیصلہ بھی جذباتی تھا۔ ایک جانب مجھے اس بات کا مان تھا کہ میں اتنے بڑے راجکمار کا خاص آدمی ہوں دوسری جانب میں اس کا مقروض تھا اور تیسری جانب میں اس سے خوفزدہ تھا۔

اگر میرے کندھوں پر آج والا تجربہ کار سر ہوتا تو میں یقیناً آپ کو کیلاش کے گندے پلان سے آگاہ کرتا۔ آپ یقین کریں مہاراج یہی باتیں سوچ سوچ کر مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ اگر نیند آتی بھی ہے تو ڈراؤنے سپنے دِکھتے ہیں۔ میں خود کو راجکماری، اس کے معصوم بچے اور اس کے پتی کا قاتل سمجھتا ہوں۔ اگر میرا بھانجا مجھے زور دے کر یہاں نہ لاتا تو شاید میں یہ سب کچھ اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس گناہ کی سزا میرا رب مجھے ضرور دے گا۔ مہاراج آپ کا مجرم حاضر ہے اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کیجیے۔ آپ چاہیں تو مجھے کوئی بھی سزا دیں۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے معاف کر دیں۔ لیکن جب تک آپ مجھے شما نہیں کریں گے میں آپ کے چرنوں سے اپنا سر نہیں اٹھاؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے غفار نے اپنی گردن مہاراج کے قدموں پر رکھ دی۔ بات سزا جزا کی نہیں غفار میاں۔ تمہیں سزا دینے سے

میری پوتری لوٹ کر نہیں آ سکتی۔ جو کچھ ہونا ہو تو ہو چکا ہے۔

مہاراج نے غفار کو اپنے چرنوں سے اٹھاتے ہوئے کہا، تم اٹھو، میں نے تمہیں معاف کیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا خدا یا بھگوان جانے۔ بابا کے چرنوں سے اٹھا تو غفار کی حالت واقعی دیدنی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو کر چند منٹوں کے لیے اندر سوج گئیں تھیں اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ میں اس کی اندرونی حالت کا اندازہ تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ اندر سے بُری طرح ٹوٹا ہوا لگتا تھا۔ ایسے میں بابا کی آواز آئی، مجھے تو اب اس بات کا دکھ ہے کہ میری پوتری کا ایک بچہ بھی تھا۔ میرے نواسے کو ان ظالموں نے چھ ماہ کی عمر میں سندر بن کے جانوروں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

آپ کی ایک نواسی بھی تھی مہاراج۔ راجکماری ارمہ کے ایک نہیں دو بچے تھے، ٹام نے کہا۔ دو! آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ مہاراج نے بے چینی سے پوچھا۔ ہاں مہاراج، ارمہ کی ایک بیٹی تھی اور ایک بیٹا۔ ارمہ اپنے بیٹے کو ساتھ ہندوستان لائی تھی جبکہ اپنی تین سالہ بیٹی کو بیماری کی وجہ سے اپنے پتی کے پاس لندن میں چھوڑ گئی تھی۔ اس کے پتی کو جب اپنے بیٹے کی بیماری کا تار ملا تو وہ اپنی بیمار بیٹی کو لندن میں اپنے مکان کی مالکہ کے پاس چند دنوں کے لیے چھوڑ کر اکیلا ہندوستان آیا تھا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پوتری کے پتی کا نام انعام تھا۔ اگرچہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ انعام کے ساتھ کیا ہوا تھا اس کے باوجود میں اتنا قیاس لگا سکتا ہوں کہ ارمہ کی طرح کلکتہ کے ائیر پورٹ پر جسونت نے انعام کو اٹھا کر سندر بن کی راہ لی ہوگی۔ انعام چونکہ ہندوستان میں پہلی بار آ رہا تھا اس لیے اسے راستہ معلوم نہیں ہوگا۔ جسونت نے اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے سندر بن لے جا کر ختم کر دیا ہوگا اور کانپور آ کر کیلاش کو اپنی کامیابی کی اطلاع دی ہوگی۔

نہیں۔ آپ کے قیاس کا آخری حصہ کچھ یوں ہونا چاہیے تھا کہ جسونت انعام کو مار کر سندر بن سے زندہ نہیں نکل سکا۔ کیونکہ اس کی لاش اس واقعے سے کوئی تین ماہ بعد یعنی کیلاش کے پاگل ہونے کے دو ماہ بعد سندر بن سے برآمد ہوئی تھی۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق اس کی موت سانپ کاٹے سے ہوئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جسونت کی لاش کسی اور علاقے سے برآمد ہوتی، میں نے ٹام کے قیاس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ٹام بولا، رامو کا قیاس درست ہے، میں دراصل جسونت کی لاش کی سندر بن سے برآمدگی کے بارے میں بھول گیا تھا۔

میری نظر اکرام پر پڑی۔ وہ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے جذبات سے پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹ اپنے دانتوں میں بھینچ رکھے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ کو تھام کر زور سے دبایا۔ مجھے معلوم تھا اس پر اس لمحے کیا بیت رہی ہوگی۔ اگر پیارے لاپتہ ہوں تو انتظار کرنے والوں کو ان کی زندگی کی ایک موہوم سی آشا کا سہارا رہتا ہے۔ اکرام بھی اسی آشا کے سہارے میرے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ اسے شاید امید ہوگی کہ اس کا بچھلی ربع صدی سے روٹھا اور بچھڑا بھائی ہندوستان کی کسی گلی کے موڑ سے اچانک نمودار ہو کر اس سے لپٹ جائے گا۔ اتنے عرصے کے بچھڑے اور روٹھے ہوئے ایک بار پھر مل کر من جائیں گے۔ وہ اپنی ماں اور بہنوئی کو یہاں سے بھائی کے مل جانے کی خوش خبری سنانے کے لیے فون کرے گا۔ پیاروں کے مرنے کی خبر ایک جانب تو دکھ دیتی ہے دوسری جانب صبر کی راہ بھی کھولتی ہے۔

موت جیسی اٹل حقیقت کے آگے سب بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مرنے والے کو رونے دھونے کے بعد جینے والے اپنے اپنے معمولات میں ایک بار پھر غرق ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکرام کے لیے انعام کی موت ابھی چند لمحے پہلے واقع ہوئی تھی۔ ابھی اس نے اور اس کے پیاروں نے انعام کا ماتم کرنا تھا۔ جہاں تک مہاراج کا تعلق ہے تو وہ اپنی پوتری کو کافی عرصے سے رو دھو کر صبر کر چکے تھے۔ اگرچہ ان کو ابھی معلوم ہوا تھا کہ ان کی پوتری کے قاتل پٹھان نہیں تھے بلکہ ان کا اپنا خون تھا۔ لیکن قاتل کے اختلاف سے قتل کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ اس لیے مہاراج کا ردِعمل اکرام سے مختلف تھا۔

میرے خیال کا تسلسل بابا کی آواز سے ٹوٹا جو کہہ رہے تھے، میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی، اگر آپ کا اور غفار کا قیاس درست ہے اور اگر غفار سچا ہے تو پٹھان کے اس خط کو کس کھاتے میں رکھو گے؟ مہاراج نے ٹام کے سامنے آغا جی کا خط لہراتے ہوئے پوچھا۔ ٹام نے جواب دیا، اس کے لیے آپ کو میری کہانی کا دوسرا حصہ سننا ہوگا۔ ضرور ضرور، مہاراج بولے، ٹام نے اپنی کہانی شروع کرتے ہوئے کہا، مہاراج میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ ارمہ اور انعام کے مکان کی مالکہ کا نام مسز براؤن تھا۔ انعام کو جب اپنی بیوی کی جانب سے بیٹے کی بیماری کا تار ملا تو اس نے اپنی بیمار بیٹی کو مسز براؤن کے پاس چند دن کے لیے چھوڑا اور خود جلدی سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔ اس واقعے کے دو ہفتے کے بعد کیلاش وہاں پہنچا۔ مجھے اس بات کا علم مسز براؤن کے اس بیان سے ہوا تھا جو اس نے ان کی لڑکی کو لندن پولیس کے حوالے کرتے ہوئے لکھ کر دیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ٹام نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کو دکھاتے ہوئے کہا، اس بیان میں مسز براؤن نے قلم بند کیا تھا کہ کیلاش نامی ایک ہندوستانی نوجوان نے اپنا تعارف ان کے کرائے دار کے ایک جانکار کی حیثیت سے کراتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ لندن اپنے کسی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ اس نے سوچا کہ مسز براؤن کو بتا دے کہ اس کے کرائے دار ہندوستان میں ہندو مسلم بلوائیوں کی زد میں آ کر موت کا شکار ہو گئے ہیں۔ مسز براؤن نے جب ان کی ساڑھے تین سالہ بچی کا ذکر کیا تو کیلاش نے بتایا کہ بلوائیوں نے اس بچی کے خاندان کا کوئی فرد زندہ نہیں چھوڑا۔ اس لڑکی کا اب وہاں کوئی نہیں ہے اور وہاں لے جانے میں بچی کی جان کو بھی خطرہ ہوگا۔ اس لیے وہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ ہندوستان نہیں لے جا سکتا۔ نئی نئی آزادی کے بعد ان دنوں ہندوستان نسلی اور مذہبی فسادات کی زد میں تھا اور یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی اس لیے مسز براؤن نے کیلاش کی بات پر یقین کر لیا۔ اس کی موجودگی میں ایک ڈاکیا پاکستان سے آیا ہوا ایک خط چھوڑ گیا تھا۔ کیلاش نے مسز

باقی صفحہ ۹۵ پر ملاحظہ کیجیے

ترجمانی کا فن

(میکسیکن کہانی)

ظفر قریشی (نیویارک)

بنجامن الیرے سائنز(Benjamin Alire Seanz) میکسیکن نژاد امریکی ہیں۔''کینٹکی کلب میں ہر چیز کا آغاز اور انجام ہوتا ہے'' (Everything begins ends at the kentucky club) ان کی مختصر کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔اس مجموعے کو پین/ فاکنر ایوارڈ برائے فکشن (Penn/Faulkner award for fiction) مل چکا ہے۔ بنجامن الیرے سائنز شاعر، مضمون نگار اور مختصر کہانی نویس ہیں۔ان کی کہانیاں امریکی آبادی کی مجموعی نفسیات میں بیٹھی جغرافیائی اور معاشرتی حدود عبور کرتی ہیں۔وہ یونیورسٹی آف ایل پاسو(Elpasso) میں تخلیقی تحریر کے شعبے کے سربراہ ہیں۔ بنجامن الیرے سائنز کو دنیا کے پانچ متاثر کن ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

☆

کچھ لمحے ایسے بھی تھے جب مجھے احساس ہوتا تھا کہ میری ماں اور میرا باپ میرے قریب بیٹھے ہیں اور مجھے، بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔یوں لگتا تھا جیسے ایک طوفان گزر گیا ہو اور وہ اس کی پھیلائی ہوئی تباہی میں سے کارآمد چیزیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا شاید میرے ٹکڑے، میرے اعضا ڈھونڈ رہے ہوں۔میری ماں مجھے چھوتی ہے، میرا ہاتھ تھام لیتی ہے، بہت آہستگی سے مجھے کچھ کہتی ہے۔وہ کیا کہہ رہی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنی آواز کھو بیٹھا ہوں۔جیسے میرا جسم بھی وجود نہیں رکھتا۔جب میری ماں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میرا ماتھا چومتی تو میں اس کے تقریباً مانوس چہرے کو دیکھتا ہوں۔ وہ جب میرا نام لیتی ہے تو مجھے اس کی آنکھوں میں دکھ دکھائی دیتا ہے۔مجھے لگتا ہے جیسے میں ایک زخم بن گیا ہوں، وہ زخم جو اس کی تکلیف کا سبب ہے۔

میرے بہن بھائی مجھے دیکھنے آتے ہیں۔میں ایک ایک کر کے ان سب کے چہرے باری باری دیکھتا ہوں۔سارے ہی میرے لیے اجنبی ہیں۔میں ان کی آوازیں سنتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ ساری آوازیں میں پہلے سن چکا ہوں۔ یہ ساری آوازیں میری یادداشت میں کہیں محفوظ تھیں۔ پھر میں اپنی انگلیوں کی طرف دیکھتا ہوں اور انہیں گنتا ہوں۔ایک۔۔۔دو۔۔۔تین۔۔۔چار۔۔۔پانچ ۔ ہر انگلی گنتے ہوئے میرے منہ سے کچھ نام برآمد ہوتے ہیں۔میں ہسپتال میں اپنے بستر میں لیٹا ہوں ۔کمرے میں تاریکی ہے۔سیسیلیا، اینجلا، مانیکا، الفریڈو، رکارڈو، ایک، دو، تین، چار، پانچ۔اور پھر میں بار بار یہ نام دوہراتا ہوں اور ساتھ ساتھ گنتی کرتا جاتا ہوں۔شاید میں کبھی ان کے بہت قریب تھا۔شاید میں ان سب سے محبت کرتا تھا۔کس نوعیت کی محبت تھی وہ؟ لیکن اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔میری یادداشت میں یہ نام چپک کر رہ گئے تھے اور ان کے شناسا متوقع چہرے۔اینجلا بار بار ایک ہی بات کہتی: کیسے ظالم لوگ تھے؟ انہوں نے مار مار کر تمہارا یہ حال آخر کیوں کیا؟ اسے آخر اپنے سوال کا جواب کیوں نہیں مل رہا تھا؟ وہ مجھ سے آٹھ سال بڑی تھی۔کیا اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ دنیا بہت سنگ دل ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ دنیا سنگ دل نہ ہو، دنیا رحم دل بھی تو نہیں ہے۔لیکن وہ لڑکے جنہوں نے مجھے اس بے دردی سے مارا تھا وہ یقیناً ظالم تھے۔انہوں نے دنیا کا ترجمہ یہی کیا تھا۔انہوں نے غصے، گھونسوں، لاتوں، مکّوں اور تشدد کے ذریعے دنیا کی ترجمانی کی تھی۔اور جب کوئی ان باتوں کے بارے میں سوچے تو اس کے ذہن میں سوال کیوں آتا ہے جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

کیا یہ سچ نہیں کہ ان کے نام کا آخری حصہ گویرا تھا؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ گویرا کا مطلب جنگ ہے؟ اور کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نام کے لوگ پیدا ہوتے ہی لڑنے کے لیے ہیں؟ لیکن لڑنے کے لیے پیدا ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ جنگ میں شرکت انہیں ہر صورت میں فتح سے ہمکنار کرے گی۔اپنے بھائی بہنوں کے نام لیتے ہوئے مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ نام تو میری زبان کی نوک پر ہیں۔

(Cecilia, Angela, Monica, Alfredo, Ricardo)

میں ان کے ناموں کے بارے میں سوچتا ہوں کہ ان کے معنی کیا ہوں گے۔کیا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ وہ بھی کچھ زخم چھپائے ہوئے ہیں؟ کیا وہ اپنے زخم مجھ سے چھپا رہے ہیں؟ اور میرے ماں باپ کو ان کا علم نہیں ہے؟ کیا دنیا کو بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟ اور کیا یہ درست ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے؟ زخم پوشیدہ ہونے چاہئیں۔زخموں کا اعلان نہیں ہونا چاہیے۔ان لوگوں نے کیسے کیسے غم مجھ سے، میرے والدین سے اور دنیا سے چھپائے ہوں گے۔ہم سب اگر فرض کر لیں کہ دنیا بے عیب ہے اور حسین ہے اور موسم بہار کے پہلے بہترین دن کی طرح ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟ یہ امریکہ ہے۔اس ملک میں مسرت ہے اور شادمانی ہے۔ہم میکسیکو سے آئے ہیں۔اس ملک کو دنیا کا غمزدہ ترین ملک کہا جاتا ہے۔امریکہ میں مجھے اور مجھ جیسے لوگوں کو صرف اس بات کی اجازت ہے کہ ہم شکر گزار ہوں۔جن لڑکوں نے مجھے مارا پیٹا تھا وہ ایک مختلف زبان بولتے تھے اور یہ وہ زبان تھی جو میں سمجھتا نہیں تھا اور شاید کبھی نہ سمجھوں۔

میرے بہن بھائی مجھے دیکھنے ہر شام آتے ہیں۔میں ہسپتال کے اس کمرے میں اپنے بستر پر پڑا ہوتا ہوں۔میں واقعی پوری کوشش کرتا ہوں کہ ان سے بات کروں۔میں ان سے بہت آہستگی سے بات کرتا ہوں، مجھے علم نہیں کہ میرے منہ سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں اور پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر ان کو میرے الفاظ سنائی نہیں دے رہے یا انہیں سمجھ میں نہیں آ رہے تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ مجھے تو کبھی کبھی یہ بھی لگتا ہے کہ جو الفاظ میرے منہ سے برآمد ہو رہے ہیں وہ میرے منہ سے نہیں کسی اور کے منہ سے نکل رہے ہیں اور میں ان الفاظ کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔وہ زبان میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ہاں اتنا میں جانتا ہوں کہ میرے بہن

بھائی جو بات کر رہے ہیں اس میں میرے لیے ہمدردی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں پہلے سے بہت بہتر لگ رہا ہوں۔ دوسری طرف میں حیران بھی ہو رہا ہوں کہ میں ان کی باتیں سمجھ بھی رہا تھا۔ میں مسکرایا۔ میں نے ان کے ہاتھ دبائے جواب میں انہوں نے بھی میرا ہاتھ دبایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہے ہوں گے کیونکہ میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال آتا تھا کہ مجھے زدوکوب کرنے والے مجھے مردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ البکر کی (Albuquerque) نہر کے مضافات کا کوئی علاقہ تھا۔ وہ شام قدرے گرم تھی اور میں ایک خط سپرد ڈاک کرنے گھر سے نکلا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کام تھا جس کے لیے مجھے ڈاکخانے تک جانا تھا۔ چلتے ہوئے اچانک میرے کانوں میں کچھ آوازیں آئیں۔ جیسے کوئی مجھے برا بھلا کہہ رہا ہو۔ گالیاں دے رہا ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مجھ پر کچھ لوگ جھپٹ پڑے اور مجھے گھسیٹ کر کہیں لے جانے لگے۔ وہ مجھے لاتیں مار رہے تھے۔ مجھ پر گھونسوں اور مکّوں کی برسات ہو رہی تھی۔ اور پھر یک لخت سب کچھ بدل گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں ہسپتال کے اسی کمرے میں ایک بستر پر پڑا ہوں۔ میں مرا نہیں تھا لیکن جانتا تھا کہ میرے اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ وہ جو میرے اندر ہلاکت ہوئی تھی وہ کیا چیز تھی اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے کوئی اور ہی شخص ہوں، میں کسی اور کے قالب میں ڈھل گیا ہوں اور میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ لوگ اس تبدیلی کے باوجود مجھے پہچان رہے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ جسے یاد کر رہے ہیں وہ جا چکا ہے۔ وہ لڑکا جس سے وہ محبت کرتے تھے اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

میں نے اپنے باپ کے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں وہ لڑکا ہوں جو اس شخص کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ میرے باپ کے چہرے پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی مگر اس چہرے پر سختی تھی اور غصہ بھی تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہسپتال کے کمرے پر مسلسل خاموشی مسلط کر دی گئی ہے۔ دنیا کی کوئی آواز بھی تو اس کمرے کے اندر نہیں آ پا رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ آشنا الفاظ اور قہقہے میکسیکو ارسال کر دیئے گئے ہیں اور مجھے زبردستی ایک ایسی سرزمین پر چھوڑ دیا گیا ہے جو مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ میری پشت میں چھرا اتارتے ہوئے انہوں نے یہی تو کہا تھا ''تم وہیں کیوں نہیں واپس چلے جاتے جہاں سے آئے ہو؟ مادر چود، واپس جاؤ۔ واپس جاؤ۔'' لیکن مجھے واپسی کا راستہ معلوم نہیں تھا اس لیے میں وہاں رکنے پر مجبور تھا۔

ڈاکٹر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا میں اپنا نام جانتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ میں دراصل یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ کیا یہ شخص جو مجھ سے یہ سوال کر رہا ہے واقعی وجود رکھتا ہے یا یہ خواب ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر میرے جواب کا منتظر تھا۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ خواب نہیں ہے اور یہ ڈاکٹر جواب لئے بغیر کہیں نہیں جائے گا۔ میں نے کہا ''ہاں میں اپنا نام جانتا ہوں''

''کیا آپ مجھے بتانا پسند کرو گے کہ آپ کا نام کیا ہے؟''

''آپ نہیں جانتے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ ہی مجھے بتاؤ!'' ڈاکٹر نے زور دے کر کہا۔

''میرا نام نِک (Nick) ہے۔''

''یہ تو پہلا نام ہوا۔ آخری نام کیا ہے آپ کا؟''

''گویرا (Guerra)'' میں نے کہا۔

''یہ کونسا سال ہے؟''

سوال و جواب نے میری خود اعتمادی کچھ کچھ لوٹا دی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر برا آدمی نہیں لگتا۔ یہ ان لڑکوں کی طرح مجھے مارے پیٹے گا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس مرتبہ میں ڈاکٹر کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ ''نِک (Nick) یہ کون سا سال ہے؟''

''1985'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر میرا جواب سن کر سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید اس کا میری عمر کا بیٹا ہو۔

''نِک (Nick) تمہیں معلوم ہے امریکہ کا صدر کون ہے؟''

میری آنکھیں اب بند ہونے لگی تھیں ''رونالڈ ریگن'' میں نے کہا۔

''نائب صدر کون ہے؟''

''بش؟ بش ہی ہے نا؟ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

ڈاکٹر مسکرایا۔ ''نِک (Nick) تمہیں بہت زبردست چوٹیں لگی ہیں'' وہ بولا۔

''کیا اسی لیے میں یہاں ہوں'' میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں محفوظ ہوں، میرا کندھا چھوا۔ غیر ارادی طور پر مجھے جھٹکا سا لگا۔

''گھبراؤ نہیں نِک (Nick)۔ تمہیں یہاں کوئی نہیں مارے گا۔'' ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں مجھے اتنی ہمدردی دکھائی دی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''نِک (Nick) تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' ڈاکٹر نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی بات پر یقین کر لوں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں سونا چاہتا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں تاریکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنی ہی آواز پر میں جاگ گیا ہوں۔ ایک نرس دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ شاید میرے چہرے پر سوال تھا ''تم چیخ رہے تھے!'' نرس نے کہا۔

''اوہ۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے'' میں بولا۔

اس نے مجھے پانی کا گلاس دیا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ یہ بدسلوکی کی۔'' نرس نے کہا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ میں چلّا رہا تھا؟'' میں نے نرس سے پوچھا۔ نرس کے اقرار پر میں نے اسے بتایا کہ میں ایک خوفناک خواب دیکھ رہا تھا۔ شاید اسی لیے میری چیخیں نکل گئیں۔

''نِک (Nick) تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے کیا تم اس کے حوالے سے کچھ یاد کر سکتے ہو؟'' وہی مشفق ڈاکٹر واپس آ گیا تھا۔ رات جا چکی تھی اور اب میرا اطمینان کچھ کچھ واپس آ رہا تھا۔

''کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہیں البکر کی (Albuquerque) کے اس ہسپتال میں کیسے منتقل کیا گیا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

البکر کی (Albuquerque)؟ میں نے تقریباً سرگوشی میں سوال کیا ''کیا یہ انگریزی زبان کا کوئی لفظ ہے؟'' ڈاکٹر کے چہرے پر تشویش کی ایک لہر آئی۔ ''میرا نہیں خیال کہ یہ انگریزی کا کوئی لفظ ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''اس کے کیا معنی ہیں؟''

''مجھے علم نہیں، نِک (Nick)'' ڈاکٹر نے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی خاموشی کا کیا مطلب ہے۔ ڈاکٹر کی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں اور خاموش تھیں۔ ''نِک (Nick) تمہیں یاد ہے کہ یہاں کیسے لایا گیا تھا؟'' ڈاکٹر نے پھر سوال کیا۔

''نہیں'' میں نے کہا۔

''پھر تمہیں کیا یاد ہے؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مجھے کیا یاد ہے اور کیا یاد نہیں ہے؟''

''کیا تم جانتے ہو کہ تم کس شہر میں ہو؟''

''یہ میرا گھر ہے'' میں بولا۔

''گھر؟'' ڈاکٹر نے سوالیہ انداز میں میرا جواب دہرایا۔

''ایل پاسو (El Paso)'' میں نے کہا۔

''کیا یہ تمہارا جواب ہے؟ یا تم اندازاً بتا رہے ہو؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سر ہلا کر رہ گیا لیکن کچھ وقفے کے بعد میں نے پوچھا ''آپ مجھے یہاں سے نکلنے کی اجازت کب دیں گے؟''

''نِک (Nick) مجھے تمہاری حالت پر تشویش ہے۔''

''لیکن میرا تو خیال ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

جب ڈاکٹر وہاں سے چلا گیا تو میں نے اسپینش (Spanish) میں ''تشویش'' کے معنی یاد کرنے کی کوشش کی۔ میرے دماغ میں کوئی مترادف نہیں آیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں بالکل خالی الذہن ہو گیا ہوں۔ ایک لفظ کے معنی دوسری زبان میں ڈھونڈنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آپ کو دونوں زبانیں آتی ہوں۔ جو زبانیں مجھے آتی تھیں وہ اب غائب ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کیا اب مجھے الفاظ کے بغیر زندہ رہنے کا طریقہ سیکھنا ہوگا؟

پھر یہ ہوا کہ ایک دن میری ماں نے مجھے بتایا کہ ہسپتال کی طرف سے مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی ہے۔

''ہم تمہیں گھر لے چلیں گے۔'' میری ماں نے کہا۔ میں جواب میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''نِک (Nick) تم بات کیوں نہیں کر رہے؟ تم بولتے کیوں نہیں ہو؟'' میری ماں نے پوچھا۔

''میں بولتا تو ہوں'' میں نے کہا۔

''تم نہیں بول رہے''

اپنے پرانے محلے میں مجھے اپنی واپسی کا سفر یاد ہے۔ مکان جانے پہچانے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں دور کھڑا خود کو اپنے باپ کی موٹر کار سے اترتے دیکھ رہا ہوں۔ باپ کے گھر کا صاف ستھرا لان اور کیاریوں میں لگے میری ماں کے گلاب کے پودے جن پر پھولوں کی بہار آئی ہوئی تھی جنہیں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ گلاب کے پھول تو بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔ لفظ خوبصورت کے میں نے ہجے کیے اور سوچنے لگا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہوگا اور کہاں سے آیا ہوگا۔ خواب دیکھنے والے کس شخص نے یہ لفظ تشکیل دیا ہوگا اور دنیا میں کھینچ لایا ہوگا۔ گھر کے مختلف کمرے میں نے جھانک جھانک کر دیکھے۔ کوئی چیز اجنبی نہیں لگی لیکن کسی چیز کے ساتھ انسیت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے دیواروں پر لگی تصویریں دیکھیں ایک تصویر میرے بچپن کی بھی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایسٹر کی باسکٹ تھی اور میری بہن اینجلا (Angela) میرا گال چوم رہی تھی۔ میں تھک گیا تھا۔ مجھے نیند نے آ لیا۔

میری پشت پر لگی پٹیاں اتر گئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ نوکدار چاقوؤں سے انہوں نے میری پشت پر جو الفاظ درج کیے تھے کیا وہ بھی غائب ہو گئے ہوں گے؟ لیکن یہ خیال میری خوش فہمی تھا۔ مجھے علم تھا کہ میری کھال پر درج کیے گئے الفاظ اب کبھی نہیں مٹیں گے، زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ پھر میں یہ سوچ کر ہنس پڑا کہ اگر انہوں نے املا کی غلطیاں کی ہیں تو ان الفاظ کا کیا ہوگا؟

ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت کیا ملی کہ میرے گھر پہنچتے ہی اخباروں کی دفاتر سے میرے لیے ٹیلی فون کالوں (Calls) کا تانتا بندھ گیا۔ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں؟ میں اپنے والدین کو دیکھتا رہا کہ وہ کس طرح لوگوں کے اور اخبار والوں کے سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔ نہیں، وہ ابھی انہیں مجھ سے گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہاں، انہیں اتفاق تھا کہ میرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ نہیں، خاندان کے لوگ اس واقعے پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ اور نہیں نہیں، بالکل نہیں بتا سکتے کہ ہمارے تاثرات کیا ہیں۔

مجھے اچھا نہیں لگا کہ میرے ماں باپ میری نگہداشت اس طرح کر رہے تھے جیسے میں چڑیا کا وہ بچہ ہوں جو ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ انڈے سے نکلا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی گھنٹی بجتی میری ماں اس طرح چونک کر اچھلتی تھی جیسے کوئی بھیانک خواب سے گھبرا کر جاگتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک مقامی ٹیلی ویژن اسٹیشن کا ایک رپورٹر اپنے کیمرہ مین کے ہمراہ ہمارے دروازے تک آ گیا۔ میری

ماں کی جانب ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا ''ہم آپ کے خاندان پر ایک فیچر بنانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ ایک مختصر انٹرویو دینا پسند کریں گی؟ اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو کیا آپ کا لڑکا کچھ کہنا پسند کرے گا؟''

''میرے بیٹے کا نام نِک (Nick) ہے'' میری ماں نے جو دروازے پر کھڑی تھی، سخت لہجے میں بولی اور وہ لڑکا نہیں مرد ہے'' یہ کہہ کر میری ماں نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اسی وقت اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ رو پڑے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ نہیں روئی۔ اگر اس نے رونا شروع کر دیا ہوتا تو میں نہیں سمجھتا کہ میں کس طرح سے دلاسہ دیتا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ میری وجہ سے وہ یہ غم محسوس کر رہی ہے۔ منع کرنے کے باوجود رپورٹر باز نہ آیا اور اس نے ہمارے گھر کو پس منظر بنا کر اپنی رپورٹ پڑھنا شروع کی اور میں گھر کے اندر ایک کونے میں کھڑا تھا تو میں نے دیکھا کہ میری بہن اینجلا (Angela) غصّے میں چنگھاڑتی ہوئی باہر نکلی، رپورٹر کے ہاتھ سے مائکروفون چھینا اور کیمرے میں دیکھتے ہوئے آگ بگولہ ہو کر بولی ''کسی نے میرے بھائی کی پیٹھ کو بلیک بورڈ بنایا تھا۔ جاننا چاہتا ہے کہ اس کی پیٹھ پر چاقو سے کیا لکھا تھا؟ تجھے میں بتاؤں کیا لکھا تھا، کتے کے بچے؟ کیا میں تجھے بتاؤں کہ میرے احساسات کیا ہیں؟ ہم خوشی سے ناچ رہے ہیں حرامزادے!''

یہ کہہ کر اس نے مائکروفون پڑوسی کے گھر کی طرف اچھال دیا اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر رپورٹر کو کھا جانے والی نظروں سے اس طرح گھورا کہ رپورٹر کیمرہ مین کو لے کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ دروازے کی درز سے میں اس کے قہر کا مظاہرہ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میری بہن کو اس قدر غصّہ اگر وراثت میں ملا تھا تو کس کے ذریعے ملا تھا، ماں کے یا باپ کے ذریعے؟ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ میں اس غصّے کا مالک بننا چاہتا تھا لیکن میرے اندر نہ غصّہ اور نہ کوئی اور جذبہ۔ اینجلا (Angela) اندر واپس آئی تو غصّے سے کانپ رہی تھی۔ میں حالانکہ کمرے کے کونے میں، دروازے کے قریب، اس درخت کے مانند کھڑا تھا جو عین موسم بہار کے وسط میں اپنے پتے جھاڑ بیٹھتا ہے۔ اپنی بہن کے ساتھ اظہار ہمدردی کے طور پر آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہچکیوں کے ساتھ اس کے آنسو ایک ریلے کی طرح اس کے جسم سے نکل رہے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں کہ اپنے یہ آنسو عاریتاً ہی سہی لیکن مجھے دے دو۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

شکاگو سے شائع ہونے والے ایک رسالے کی طرف سے ٹیلی فون موصول ہوا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ کیا وہ مجھے انٹرویو کر سکتے ہیں؟ ''نہیں'' میری ماں نے کرخت لہجے میں کہا۔ میگزین کے رپورٹر کو درخواست کے رد کئے جانے کا فیصلہ تسلیم کر لینا چاہیے تھا مگر رپورٹر غالباً ''نہیں'' سننے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے بات آگے بڑھانی چاہی۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میری صحت اب کیسی ہے؟ میرے مارے پیٹے جانے کے اثرات طویل عرصے تک مجھ پر حاوی تو نہیں رہیں گے؟ وغیرہ۔ کیا میں ان لڑکوں سے کسی قسم کی نفرت پال رہا ہوں؟ اس واردات کے حوالے سے ہسپانوی کمیونٹی کا رویہ کیا ہو سکتا ہے؟ کیا میرے حوالے سے ہسپانوی طلبہ کے مظاہروں کو میری حمایت حاصل ہے؟ میری ماں بڑے صبر و سکون کے ساتھ یہ سوال سنتی رہی اور پھر کچھ کہے بغیر اس نے رپورٹر کی گفتگو کی یکطرفہ کوشش کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

آہستہ آہستہ اس نوعیت کی ٹیلی فون کالیں (Calls) ہماری زندگی کا حصّہ بن گئیں۔ دوستوں کی، عزیز و اقارب کی، شناسا افراد کی اور ایسے لوگوں کی بھی فون کالیں ہمیں ملتی تھیں جنہیں ہم جانتے بھی نہیں تھے لیکن یہ سب ہمدردی کے احساس کے تحت رابطہ کر رہے تھے۔ اس نوعیت کی ہر فون کال (Call) پر میں خود سے سوال کرتا تھا کہ یہ لفظ ہمدردی اچھا ہے یا برا؟ گالی تو نہیں ہے؟ لیکن پھر ہمارے گھرانے کو ایسی ٹیلی فون کالیں (Calls) بھی موصول ہوتی تھیں جو ہمدردانہ نہیں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ کے بیٹے کا رویہ ان لڑکوں کے حوالے سے برا تھا؟ کہیں آپ کے بیٹے نے ان لڑکوں کو کچھ کہہ کر مشتعل تو نہیں کر دیا تھا؟ کوئی ایسی بات تو نہیں کر دی تھی کہ لڑکوں پر جوانی کا طیش غالب ہو گیا؟ لڑکوں نے خوامخواہ تو آپ کے بیٹے پر حملہ نہیں کیا ہو گا۔ ان کے پاس یقیناً کوئی جواز ہو گا! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا لڑکا کوئی نسلی فساد کروانے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ کیا آپ کے بیٹے کے پاس رہائش کا قانونی اجازت نامہ ہے؟ اگر آپ کا لڑکا غیر قانونی حیثیت رکھتا ہے تو ایک پبلک یونیورسٹی کے قریب وہ کیا کرنے گیا تھا؟

میں نے ڈکشنری اٹھائی اور لفظ غیر قانونی کے معنی تلاش کیے۔

ایک نامعلوم کال کرنے والے نے تو یہ بھی کہا کہ آپ کا بیٹا خوش قسمت ہے کیونکہ وہ چاہتے تو اسے کسی درخت کی شاخ سے لٹکا بھی سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس نوعیت کی ٹیلی فون کالوں (Calls) کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ میرے باپ نے گھر کا ٹیلی فون نمبر ہی تبدیل کروا دیا تھا جس کے باوجود کبھی کبھار ایسی فون کالیں (Calls) ہمیں موصول ہوتی تھیں جو اگر نہ آتیں تو اچھا تھا۔ جب بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی، میرے ماں باپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پھر دونوں میں سے کوئی اٹھ کر ٹیلی فون کا جواب دیتا۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے حوالے سے نہیں کسی اور کے لیے ہو رہا ہے۔ اخبار اور میگزین کے صحافی مجھ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس نِک (Nick) سے ملاقات کے متمنی تھے جو اب وجود نہیں رکھتا تھا اور مردے بات نہیں کر سکتے۔ کیا یہ انہیں معلوم نہیں تھا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ زندہ لوگ ان الفاظ کے بوجھ تلے دب کر تھک گئے ہیں جو وہ ڈھو کر ہر اس جگہ لے جانے پر مجبور ہیں جہاں انہیں جانا ہوتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ یہ مسئلہ نہیں تھا۔ میں اس بوجھ سے آزاد تھا۔ میں اسی قسم کے خیالات میں غلطاں تھا کہ میرے کانوں میں اس عورت کی آواز آئی جو خود کو میری ماں قرار دیتی تھی ''تم بولتے کیوں نہیں نِک (Nick)؟''

اگر میں اپنے بستر پر پڑا ہوتا تو سوچتا اگر میں برف کا ٹکڑا ہوتا تو پانی میں گھُل جاتا یا بھاپ بن کر اڑ جاتا، غائب ہو جاتا۔ لیکن میری ماں جو کھانا پکاتی،

''چہارسُو''

اس کی خوشبو مجھے یاد دلاتی کہ جسم کا ہونا اب اتنا بڑا عذاب بھی نہیں۔ میری ماں کے تیار کیے ہوئے سوپ، کاڈیوس اور گوئساڈوس (Sopas, Caldillos, Guisados) کی مہک مجھے بھوک لگا دیتی۔ لہسن، پیاز، دھنیا، سیلانترو (Cilantro) اور بھنے چائل۔ ان کی خوشبوئیں میرے اندر زندہ رہنے کی امنگ پیدا کرتیں۔ زبان ذائقہ محسوس کرتی ہے لیکن ذائقہ لسانیات کی پہنچ سے دور ہوتا ہے۔ یہ بات میں نے ذہن میں آتے ہی لکھ ڈالی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنی تحریر دیکھی اور اس کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے خود کو روک نہ سکا۔ کاغذ کے پرزے پر تحریر کردہ تمام الفاظ اب ناقابل فہم ہو چکے تھے۔

ایک رات میری ماں میرے کمرے میں آئی اور میرے بستر پر بیٹھ گئی ''میں سمجھ رہی تھی کہ تم کوئی کتاب پڑھ رہے ہو گے۔'' وہ بولی۔

''پڑھنے کو میرا دل نہیں چاہتا'' میں نے کہا

''ایک وقت تھا جب تم کہتے تھے کہ کتابوں کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے'' تم کہتے تھے کہ تم ان تمام الفاظ کے معنی جاننا چاہوں گے جو دنیا میں موجود ہیں۔''

''مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کبھی ایسی بات کی تھی۔ غالباً بہت پہلے کبھی کہا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں نِک (Nick) تمہاری یہ بات بہت پرانی نہیں'' ماں بولی۔

''لیکن اب مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہے تھے؟'' میری ماں نے سوال کیا۔

''کیا؟''

''میری ماں نے میرا ماتھا چوم کر کہا'' جب میں کمرے میں داخل ہوئی نِک (Nick) اس وقت تم کچھ سوچ رہے تھے۔''

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیوں کہا'' اپنے زخموں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اب مندمل ہو گئے ہیں مگر ان کے نشان مستقل طور پر میرے ساتھ رہیں گے۔''

''یہ نشان تمہیں تکلیف تو نہیں دے رہے نِک (Nick)'' میری ماں نے پوچھا۔'' یہ سارے زخم تو بھر گئے ہیں''

میری پشت پر جو الفاظ تھے ان کے ترجمے کے الفاظ پر ہمارا اختلاف تھا۔ مجھے لگا کہ میرے بے آواز آنسو میرے گالوں سے ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میری ماں نے مجھے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ جب تک میں سو نہ گیا وہ مجھے ہولے ہولے سہلاتی رہی۔

رات کے کسی پہر بادلوں کی خوفناک گرج سے میں جاگ گیا تھا۔ پچھلی کئی راتوں کے دوران میں ایک ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ چٹا سفید سورج مجھے اپنی حدّت سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری پشت پر خون جم کر بیگن کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بارش کے قطروں کو گھر پر آواز کے ساتھ حملہ آور ہوتے سن رہا تھا۔ چھت کی ٹائلیں (Tiles) جب پوری طرح بھیگ گئیں تو ان میں سے ایک خاص قسم کی بدبو برآمد ہوئی۔ میں نے اپنی بنیان میں ہاتھ ڈال کر اپنے سپاٹ سینے کو سہلاتے ہوئے اپنے ہاتھ کو پشت کی طرف بڑھنے سے روکا۔ پشت پر ابھرے ہوئے الفاظ تھے جو حملہ آور لڑکوں نے گودے تھے۔ میں بستر سے اتر گیا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے میرے باپ کے لگائے ہوئے آڑو کے درخت تھے جو طوفانی بارش میں جھوم رہے تھے۔

دن، ہفتے، مہینے گزرتے رہے۔ میرے اطراف کے ماحول میں تپتے سورج کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہ تھا۔ اب لوگ پانی کے بغیر زندگی گزارنے کے طریقے سیکھ رہے تھے۔ زمین بے حد پیاسی ہو گئی تھی اور سب منتظر تھے۔ ہر انتظار کے بعد آخر کار بارش ہوتی ہے، چنانچہ بارش آ ہی گئی۔

جب میں چھوٹا تھا تو دیکھتا تھا کہ بادلوں کی کڑکدار گرج کے بعد لوگ سہم کر کام کرنا بند کر دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ لوگ گھروں سے باہر نکل آتے تھے اور بارش کے موٹے موٹے قطروں کو اتنے انہماک سے دیکھتے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے وہ ان قطروں کی سرگوشی میں اپنے پیاروں کی آوازیں شناخت کرتے تھے جو موت کی آغوش میں چلے گئے تھے اور اب بارش کے قطروں کے ساتھ ایک ایک کر کے واپس آ رہے تھے۔

میں نے تصور کیا کہ میرے بہن بھائی گھر سے نکل کر بارش میں کھیل رہے ہیں۔ ان کے قہقہے اور ہنسی کی کھنکھناتی آوازیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں اور کبھی کبھی گرج چمک کے شور میں گم ہو جاتی تھی جبکہ ان کے جسم لمحے بھر کے لیے روشن ہو جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میں دوڑتا ہوا ان کی طرف جا رہا ہوں۔ میں اور میرے بہن بھائی ان دنوں کتنے خوش رہا کرتے تھے۔

طوفان جس طرح اچانک آیا تھا اسی سرعت کے ساتھ رک گیا اور بہن بھائیوں کی متحرک تصویریں غائب ہو گئیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان نیلا اور صاف و شفاف تھا۔ کھڑکی سے ہٹ کر میں دوبارہ اپنے بستر پر آ بیٹھا۔ میں نے سوچا کہ باہر نکل کر دوڑ لگاؤں۔ میں دراصل ان تین چٹے گورے لڑکوں کی اپنے دماغ میں مسلسل موجودگی سے تنگ آ گیا تھا۔ یہ وہ لڑکے تھے جنہوں نے میرے جسم کو اپنے قبضے میں لے کر اس پر تابڑ توڑ تشدد کیا تھا۔ ان کے لیے میرے دل میں نفرت اس طرح بیٹھ گئی تھی جیسے مرغی اپنے انڈوں پر بیٹھتی ہے۔ مجھے بھی مرغی کی طرح انڈوں سے بچوں کے نکلنے کا انتظار تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس نفرت کا عادی ہو جاؤں گا بلکہ اگر ممکن ہوا تو اس نفرت سے عشق کروں گا۔ اسی طرح جیسے میں نے ریگستان سے عشق کرنا سیکھا تھا کیونکہ عشق تو آپ کسی بھی چیز سے کر سکتے ہیں، بس سیکھنے کی دیر ہوتی ہے۔

میں نے ہاتھ اوپر کیے جیسے آسمان کو چھونے کی کوشش کر رہا ہوں اور انگڑائی لی۔ میں نے ہاتھ گرائے نہیں تھے انہیں یونہی ہوا میں بلند کیے نیم دراز رہا۔ تھوڑی دیر میں جب تکلیف محسوس ہونے لگی تو انہیں پھر نیچے لے آیا۔ چند لمحوں بعد میں الماری کھول کر اس میں جھانک رہا تھا۔ مجھے اپنی دوڑ کے لیے مخصوص جوتوں کی تلاش تھی۔ الماری کی نچلی شیلف پر میرے تمام جوتے قرینے سے رکھے تھے۔ میری ماں نے میرا سارا سامان پوری توجہ کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ بکھری چیزوں

کو احتیاط کے ساتھ اٹھا کر رکھنا میری ماں کی عادت تھی۔ میں نے دوڑ والے جوتے اٹھائے ایک دراز سے موزے نکالے اور کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے نیچے کچن میں پہنچا تو دیکھا کہ میری ماں ناشتہ تیار کر رہی ہے اور باپ اخبار پڑھ رہا ہے۔ اس کے سامنے کافی کا کپ رکھا تھا۔ دونوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنے سے احتراز کر رہے ہیں کہ کہیں ان کے منہ سے کوئی غلط بات نہ نکل جائے اور میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہو جاؤں۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ وہی بات کہہ دوں جو میرے دل میں تھی اور کھلکھلا کر ہنس دوں لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں تو ہنسنا بھی بھول گیا ہوں۔

''ہائی!'' میں نے کہا۔ مجھے اپنی ماں کی آنکھوں میں کچھ دکھائی دیا۔ یا تو وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش تھی یا پھر وہ اداس تھی۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ اس لمحے کیا سوچ رہی تھی۔ ''میں نے سوچا کہ ایک مختصر دوڑ لگا کر آتا ہوں'' میں نے دونوں سے کہا۔

''احتیاط کرو۔ ابھی تم کمزور ہو''

''زیادہ لمبی دوڑ نہیں ہوگی ماں'' میں بولا

''ناشتہ واپس آ کر کرو گے؟''

''خیال نیک ہے'' میں نے ماں کو جواب دیا اور باپ کو مخاطب کر کے کہا ''ڈیڈ آپ صحیح کہہ رہے تھے!''

''کس بارے میں؟'' میرے والد نے پوچھا۔

''آپ نے کہا تھا کہ تمہیں یہیں رہنا چاہیے اور کسی مقامی کالج میں داخلہ لینا چاہیے۔ آپ کا مشورہ درست تھا۔''

میرے والد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے سیاہ و سفید لیکن گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے رہے۔ ''اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اب تم گھر پر ہو۔''

میں نے اپنے سر کو جنبش دی اور آگے بڑھ کر باپ کے سر پر ایک بوسہ دے کر گھر سے باہر آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے یہ حرکت کیوں کی۔ غیر ارادی ہی سہی لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے جو کچھ کیا صحیح سمجھ کر کیا۔ پرانا نِک (Nick) یہی کرتا۔ ''تم اب گھر پر ہو'' میرے ذہن میں اپنے باپ کے الفاظ گونجے۔ گھر۔ کیا یہ بھی ایک خواب تھا؟

باہر نکلا تو مجھے لگا کہ ابھی زمین پھٹے گی اور مجھے کھا جائے گی۔ مجھے ہڑپ کر لے گی۔ میں آہستہ آہستہ اپنے قدم بڑھاتا رہا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ میرے قدم خود بخود ریگستان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ریگستان تک پہنچ کر میں رک گیا۔ گویا اس مقام سے آگے بڑھنے کی مجھے اجازت نہیں تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو صاف ستھرے مکانوں کی قطار تھی۔ گلی کے دونوں طرف فٹ پاتھ بنے ہوئے تھے۔ ہر گھر کے سامنے ڈاک رکھنے کے ڈبے اور مکانوں کے نمایاں نمبر۔ جنگلی ریگستان کو تبدیل کر کے اس پر پالتو قسم کی سڑکیں بنانے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسی ضرورت تھی اور پانی کا کتنا زیاں تھا۔ ہر گھر کے آگے چھوٹا سا سرسبز لان تھا جس کے کناروں پر رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ میں بیٹھ گیا اور پھولوں کو اپنی بقا کی جنگ میں مصروف دیکھتا رہا۔

میں گھروں کے سامنے سے گزر کر ریگستان کے دہانے تک پہنچا تھا۔ میری نظریں وہ درخت اور پودے تلاش کر رہی تھیں جو ریگستان میں پیدا ہوتے ہیں اور پھلتے پھولتے ہیں، تینوں لڑکے جنہوں نے مل کر میری کٹائی کی تھی اسی طرح کے ریگستان میں رہتے تھے۔ تینوں چٹے سفید تھے اور انہوں نے مجھے مارا تھا۔ خواب میں میں دیکھتا تھا کہ انہوں نے مجھے ایسے ہی ریگستان کے دہانے پر پکڑا تھا۔ اور اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا میں جہاں جہاں ریگستان ہیں وہاں وہاں یہ تین چٹے سفید لفنگے رہتے ہیں۔ انہوں نے ریگستان کا دوسرا نام موت رکھ دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن پھر وہ مجھے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ مجھے پھر ریگستان کے اندر لے جائیں گے جہاں وہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کریں گے۔ ریگستانوں سے مجھے محبت تھی لیکن جب اس قسم کے زیادہ خیالات میرے ذہن میں آنے لگے میں نے ریگستان سے فاصلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ اس خیال کا آنا تھا کہ میں فوراً وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور بوجھل قدموں سے ان ہی مکانوں کے سامنے سے گزر کر اپنے گھر واپسی کی راہ لی۔

گھر میں داخل ہوا تو ناشتہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ ''دوڑ میں اب پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ وہ لطف نہیں آیا'' میں نے اپنی ماں سے کہا ''کھانے کی خوشبو اچھی لگ رہی ہے'' اور پھر ہاتھ دھو کر باپ کے قریب بیٹھ گیا۔ ماں نے ایک پلیٹ میری طرف کھسکائی۔ ''بہت دبلے ہو گئے ہو بیٹا''

میں نے سر کو جنبش دے کر اقرار کیا کہ وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ کچن میں ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے میں نے ناشتہ شروع کر دیا تھا۔ ''یہ آپ نے گھر کے در و دیوار کو کب رنگ کروایا ہے؟'' میں نے نوالہ منہ میں لیتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ دو ہفتے قبل۔ میری ماں نے جواب دیا۔

''مجھے لگتا ہے اس مرتبہ میں آپ لوگوں کی بالکل مدد نہیں کر سکا''

''می ہو! (Mijo) اب تم بہت بہتر لگ رہے ہو'' میری ماں بولی۔

''تم میرے سب سے خوش شکل نوجوان بیٹے ہو!''

''چھوڑیں ماں۔ آپ خوامخواہ ایسی تعریف نہ کیا کریں۔ میں تو کپاس کے پودے کی طرح سادہ ہوں''

''کپاس کے پودے سادہ ہرگز نہیں ہوتے۔ قطار میں دیکھو تو بہت پیچیدہ اور دلکش لگتے ہیں'' ماں نے کہا۔

''کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں بحث کروں؟''

''اگر بحث کرو تو مجھے خوشی ہوگی کہ میرا بیٹا اب اپنی پرانی حالت میں واپس آ رہا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس کندھے اچکا کر رہ گیا۔ گھر کی بنی ہوئی تورتیلا (Tortilla) روٹی اور انڈے بہت مزا آ رہا ہے ماں'' میں نے کہا۔

میں نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔ وہ تقریباً خوش نظر آئی۔

''چہارسُو''

''نِک (Nick) تم اب کیا کرنا چاہو گے؟'' میری ماں نے پوچھا۔

اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے میں مسکرایا۔ میرے باپ کی سیاہ آنکھیں سردیوں کی تاریک رات جیسی تھیں۔ ''آپ کا مطلب ہے، آج؟ ابھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔ ابھی!'' ماں نے کہا۔ ''تم ابھی دوبارہ زندہ ہو رہے ہو۔''

''اچھا۔ آپ کا مطلب ہے کہ میں اس وقت زندہ ہو گیا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے آنکھیں چڑھا کر کہا۔

''یہ دیکھو۔ یہ جو حرکت تم نے ابھی کی ہے، یہ آنکھیں چڑھانے والی۔ تم پہلے ایسے ہی کرتے تھے۔'' میری ماں بولی۔ پھر اپنی کافی کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا کر ایک گھونٹ لینے کے بعد اس نے کہا ''تم ہمیشہ یہی کیا کرتے تھے۔ تم اب اپنے گھر میں ہو نِک (Nick)۔ تم واپس آ گئے ہو۔''

میں نے ڈکشنری نکالی اور اس میں ان الفاظ کے معنی تلاش کرنے لگا جن سے میں کسی زمانے میں واقف تھا۔ الفاظ یہ تھے ''گھر۔ ریگستان۔ موت۔ چاقو۔ کھال۔ خون۔ چھرا۔ نفرت''

میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ کسی ریسٹورنٹ میں بیرے کا کام کروں گا۔ یہ بات نہیں کہ میں کسی کام کو برا سمجھتا تھا لیکن جب نوکری ملی تو میں نے قبول کر لی۔ اس ریسٹورنٹ کا نام کیفے سینٹرل تھا۔ میرا بڑا بھائی اس کے مالک کو جانتا تھا۔ شہر میں اس سے بہتر ریسٹورنٹ اور کوئی نہیں تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں کھانا مہنگا اور خوش ذائقہ تھا اور تنخواہ کھانے سے زیادہ اچھی تھی۔ یہ بات نہیں کہ مجھے اس ملازمت پر کوئی اعتراض تھا لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ جو پیسے میں وہاں سے کماؤں گا انہیں خرچ کہاں کروں گا؟

مجھے اپنا نیا معمول پسند آیا تھا۔ صبح سویرے دوڑ لگانا اور شام میں کام پر ریسٹورنٹ جانا۔ مجھے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ درمیان میں اگر میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ گویا دوسرے الفاظ میں، میں بتدریج خود کو ایک ضابطے کا پابند بنا رہا تھا۔ کبھی کبھی میں شعوری طور پر کام کے بعد بھی سیر و تفریح کے لیے نکل جایا کرتا تھا۔ میرا مقصد تھا کہ خود کو معمولی حالات کے مطابق عمل کرنے والے کے طور پر منوا لوں۔ معمول کے مطابق راتوں کو سڑکوں اور گلیوں میں مٹر گشت کرنا بھی میرے نزدیک عام حالات سے خود کو عادی بنانے کے مترادف تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں اپنے آپ کو ڈالنا خطرناک تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ گھر پر معذوروں کی زندگی بسر کرنے سے بہتر تھا کہ میں باہر نکلوں اور خود کو عام آدمی بناؤں۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بار (شراب خانہ) آتا تھا جہاں دانشور، شاعر اور ادیب جمع ہوتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہفتے کی شب ادھر جاؤں گا۔ یہ بار میرے ریسٹورنٹ کے قریب تھا لیکن پیدل جانے کے بجائے میں نے سوچا کہ اگر اپنی گاڑی پر جاؤں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی پارک کی اور پیدل چل کر بار تک پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے معمولی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اندر داخل ہو کر میں دروازے کے قریب ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھیں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ کونے میں ایک اسٹول (Stool) نظر آیا تو میں نے وہ ہی پکڑ لیا۔ ایک بوربون (Bourbon) کا آرڈر دیا اور جب بارٹینڈر نے گلاس مجھے تھمایا تو تین چار گھونٹ میں میرا مشروب ختم ہو گیا۔ ''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں نروس ہوں'' میں نے خود کو کہا ایک اور بوربون کا آرڈر دیا۔ دوسرا گلاس ختم کرنے میں، میں نے کچھ وقت لیا۔ میں نے سوچا کہ جلدی جلدی پینا ٹھیک نہیں چنانچہ بیٹھا گلاس کو اپنے ہاتھوں میں گھما رہا تھا کہ قریب بیٹھی ایک لڑکی نے جس کی طرف میں متوجہ نہیں تھا مجھ سے پوچھا ''کیا نام ہے آپ کا؟'' اس کی آواز کچھ بھاری ہو رہی تھی۔ شاید نزلے یا زکام کا حملہ اس پر ہونے والا ہو۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باروں (Bars) میں تمباکو نوشی ممنوع نہیں تھی۔ ''میرا نام سلویا (Sylvia) ہے'' اس نے کہا ''خاموش رہنا چاہتے ہیں؟''

''میرے پاس کہنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہے'' میں نے کہا۔

''نام تو ہو گا'' لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ نے اسے خوبصورت بنا دیا تھا۔ کوئی تیس برس کی ہو گی یا ہو سکتا ہے اس سے بڑی ہو۔

''نکولس (Nicholas)'' میں نے کہا۔ ''میرا نام نکولس (Nicholas) ہے'' میں ظاہر کر رہا تھا کہ نیم تاریک بار میں بیٹھ کر دو تین گلاس لنڈھا دینا اور ایک کونے میں بیٹھ کر ایک عورت سے باتیں کرنا میرا معمول ہے۔ عام مرد جو غیر شادی شدہ ہوتے ہیں یہی کچھ تو کرتے ہیں۔

''آپ کے چہرے پر گھبراہٹ ہے'' لڑکی شاید چہرہ شناس تھی۔

''میں تمباکو نوشی نہیں کرتا'' میں نے کہا۔

لڑکی میرے جواب پر ہنس پڑی۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو تمباکو نوشی شروع کر دینا چاہیے۔''

''جی نہیں۔ آپ کے مشورے کا شکریہ'' میں نے جواب دیتے ہوئے سر اٹھا کر بارٹینڈر (Bar Tender) کو دیکھ کر اپنا گلاس بلند کر دیا کہ مجھے ایک اور گلاس درکار ہو گا۔

''کیا آپ میرے لیے بھی منگوائیں گے؟'' لڑکی نے پوچھا اور مزید ایک ڈرنک (Drink) کے لیے بارٹینڈر کو اشارہ کیا۔

''کیوں نہیں؟'' میں نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ بارٹینڈر نے بیئر (Beer) کا ایک گلاس لڑکی کے سامنے رکھ دیا اور بولا:

''سلویا۔ میرا یہ گاہک نیا ہے اور تم سے بہت چھوٹا ہے۔''

لڑکی بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''کیوں؟ کیا تم بہت کم عمر ہو؟'' اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''میں اتنا بڑا تو ہوں کہ تنہا بار میں آ کر شراب کا آرڈر دے کر پی سکتا ہوں، قانونی طور پر۔'' میں نے کہا۔ اس پر وہ پھر ہنس پڑی۔ ''آپ ہنستی بہت ہیں۔''

''دنیا میں ایسا بہت کچھ ہے جسے دیکھ کر ہنس دینا چاہیے۔'' لڑکی نے

گلاس سے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ کونسی بیئر (Beer) ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی میں بڈوائزر (Budweiser) پیتی ہوں۔''

میں نے اس کے ہونٹ ہلتے دیکھے۔ اس کی آواز مجھے مترنم لگی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی اس سے مجھے غرض نہیں تھی۔ اور پھر ویسے بھی مردوں کو عورتوں کی بہتر طور پر ترجمانی نہیں کرنا آتی لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے کچھ اپنی ملازمت اور کچھ اپنے سابق شوہر کے بارے میں کہا تھا۔ ہم نے ایک ایک اور ڈرنک کا آرڈر دیا۔ مجھے ایک بار پھر ایسا لگ رہا تھا جیسے میں، میں نہیں ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہے۔ میں اس لڑکی کو مزید جاننا چاہتا تھا۔ میں اسے پیار کرنا چاہتا تھا لیکن پہلی ملاقات پر ایسا کرنا کچھ مناسب نہیں تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور کہا۔

''میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔''

''ابھی تو ہم شروع ہوئے ہیں'' لڑکی بولی۔

''شروع ہوئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا خیال ہے، ہواریز (Juarez) چلیں؟''

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا۔ میں نے کافی پی لی تھی لیکن پھر میں نے گویا اپنے آپ سے کہا ''تو کیا فرق پڑے گا؟''

لڑکی نے پھر قہقہہ لگایا ''ہاں کیا فرق پڑے گا''

ہم سانٹافے (Santafe) برج سے گزر رہے تھے۔ سلویا (Sylvia) نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے ہم کنٹکی (Kentucky) کلب پہنچے اور ایک بوتھ میں جا بیٹھے۔ مجھے اپنی حالت عجیب لگ رہی تھی۔ مجھے زیادہ نشے میں ہونا چاہیے تھا لیکن شاید میں زیادہ چوکس تھا اس لیے نشے کا اثر کم ہی تھا۔ وہ سوال کر رہی تھی اور میں جواب دے رہا تھا اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ الٹے سیدھے سوالوں کے الٹے سیدھے جواب۔ مرد عورتوں کے ساتھ جھوٹ بولتے ہی ہیں۔ میں کوئی انوکھی بات تو نہیں کر رہا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ہم وہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھے کیونکہ دفعتاً اس نے کہا تھا کہ اس دا فلوریڈا (The Florida) بہتر لگتا ہے چنانچہ ہم وہاں سے اٹھے اور سڑک پار کر کے ادھر چلے گئے۔ شاید وہاں ہم نے مزید ایک ایک ڈرنک اور لیا۔ رات بھیگ گئی تھی اور میں بے حد تھک گیا تھا۔ وہ میرے قریب آ گئی اور مجھے پیار کرنے لگی ناچار مجھے جواب دینا پڑا تھوڑی دیر بعد میں نے کہا بہت دیر ہو گئی اب ہمیں چلنا چاہیے۔

''کہاں؟'' اس نے پوچھا ''تمہارے گھر یا میرے گھر؟''

''تمہارے!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''میں یہاں سے قریب ہی رہتی ہوں'' شاید اس نے میری جھجک پڑھ لی تھی۔

''تمہیں اتنا شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''میں ایسا ہی ہوں'' میں نے کہا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

گرم رات کی طرح اس کا ہاتھ بھی گرم تھا۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ ''گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

اس کا اپارٹمنٹ چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ میں نے کہا اب مجھے جانا چاہیے لیکن اس نے بیئر (Beer) کا ایک یخ ڈبہ میرے حوالے کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک اجنبی جگہ پر کیا کر رہا ہوں لیکن جب وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بے اختیار مجھے چومنا شروع کر دیا تو میرا ردعمل وہی تھا جو اس قسم کے مراحل میں ہوتا ہے۔ میں نے شاید اسے مایوس نہیں کیا تھا۔

میں اسی وقت وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا مگر سگریٹ کی بُو اور بیئر (Beer) کے ذائقے نے میرے پیر من من بھر کے کر دیئے تھے۔ اس کی زبان میٹھی تھی۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا زبان کی مٹھاس اسی کو کہتے ہیں؟ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے پہلے یہ سب کچھ نہیں کیا ہے مگر میری اپنی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ ایک ایک کر کے ہم نے بوس و کنار کے دوران ہی اپنے کپڑے اتار دیئے تھے لیکن جب میری قمیض کے نیچے اس نے ٹی شرٹ دیکھا تو ہنس پڑی اور اسے اتارنے میں میری مدد کی غرض سے ہاتھ بڑھایا۔ میں غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے کہا، نہیں یہ میں نہیں اتاروں گا۔ شاید میرا لہجہ زیادہ کرخت تھا۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا، سب کچھ سوائے بنیان کے۔ میں اس سے جب بغل گیر ہوا تو میرے ہاتھ اس کی پشت پر پھسلنے لگے۔ نہ کوئی ابھرے ہوئے داغ تھے اور نہ کوئی اور نشان۔ ''میری پیٹھ اچھی لگ رہی ہے تم کو؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے جواب نہیں دیا بس اتنا کہا ''میری پشت کو ہاتھ نہ لگانا۔''

رات میں کسی وقت میری آنکھ کھلی۔ اس کی سانسوں کی آواز نے شاید مجھے جگا دیا تھا۔ کسی اور کے بستر میں جاگنے کا میرے لیے پہلا تجربہ تھا۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے خطوط، آنکھوں کے گرد جھریاں۔ تقریباً چالیس سال عمر یا شاید زیادہ۔ اس کے لیے میرے دل میں جو جذبہ تھا اسے کوئی نام دینا یا اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ بتانا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تقریباً خوش تھا۔ میرا اپنا جسم ثابت و سالم تھا اور اس پر مجھے ناز تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ میں نے اسے خوش کیا، مطمئن کیا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسے پرواہی نہ ہو۔ لیکن مجھے بہر حال یہ تجربہ اچھا لگا۔ اب تک مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ جسمانی ملاپ کے معاملے وہ تجربہ کار تھی۔ پھر میں نے اپنی بنیان اٹھا کر اسے سونگھنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بنیان میں اس کی خوشبو میرے ساتھ گھر جائے جہاں ماں کو پوچھنے کی ضرورت محسوس ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ میں ایک اجنبی بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ میری نگاہیں چھت کی طرف تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا مجھے اس کو کچھ رقم دینا چاہیے۔ ساری واردات بہت آسان لگ رہی تھی۔ میرے ساتھ کسی کو سونے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ یقیناً وہ کچھ نہ کچھ معاوضہ چاہے گی۔ میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ میرے کپڑے دوسرے کمرے میں تھے۔ کپڑے پہننے

کے لیے مجھے دوسرے کمرے تک جانا ہی تھا لہٰذا ابھی میں اس چند قدم کے سفر کے لیے تیار ہو ہی رہا تھا کہ اس کی آواز آئی ''بنیان صاحب، جا رہے ہو؟''

میں نے پلٹ کر سلویا (Sylvia) کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ہاں مجھے جانا ہی ہوگا۔ کچھ نیند لینی ہے اور کل کام پر بھی جانا ہے۔ ہاں، میں نے آپ کو کتنے پیسے دینے ہیں؟''

''میں رنڈی نہیں ہوں'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''معاف کرنا۔ میں نے سوچا۔۔۔'' قبل اس کے کہ میں جملہ مکمل کرتا اس نے کہا ''کوئی بات نہیں۔ اس موضوع پر مزید کوئی گفتگو نہیں ہوگی۔ گھر جاؤ۔ مجھے یقین ہے تم ابھی اپنے ماں باپ کے گھر میں رہتے ہو گے۔'' پھر اس نے پوچھا کہ کیا میں اس کا ٹیلی فون نمبر لینا چاہوں گا؟ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکلنے کے لیے تیار ہونے کے بعد اس سے کہا کہ اگر وہ اپنا ٹیلی فون نمبر دینا چاہتی ہے تو میں خوشی سے اپنے پاس رکھوں گا۔ نمبر لکھوانے کے بعد اس نے کہا کہ اگلی مرتبہ جب ہم ملیں گے تو کیا تم مجھے اپنی پیٹھ دکھاؤ گے؟ میں نے کہا ''نہیں'' ''آخر کیا وجہ ہے؟ اس میں کیا خرابی ہے جو تم چھپاتے پھر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی وجہ نہیں۔'' اس کا اگلا سوال تھا ''کوئی وجہ نہیں؟''

''بالکل نہیں''۔ ''میں اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''لیکن بات چیت سے کیا ہوتا ہے؟'' اس کا سوال تھا۔ ''گفتگو سے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔''

''یہ میرا نجی مسئلہ ہے۔'' میں بولا۔

''نجی مسئلے تو تم اپنی پتلون میں لیے پھر رہے ہو'' سلویا نے میری کمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں جوتے پہن چکا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ''بھول جاؤ۔ میں ایسا ہی ہوں۔ کہہ دیا کہ میں نہیں بتا سکتا۔ مجھے افسوس ہے۔ میں خود کو احمق ثابت کر رہا ہوں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں احمق ہوں۔'' اور یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔ اس نے مجھے جو گالی دی، وہاں سے نکلتے ہوئے مجھے سنائی دی۔ میں نے وہاں مزید وقت گزارنا مناسب نہیں خیال کیا۔

گھر واپس آنے کے بعد میں نے ڈکشنری کھول کر مزید الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کی ''جنس۔ ہاتھ۔ بوسے۔ زبان'' کوئی ڈکشنری انسانی جسم کی ضروریات کی ترجمانی نہیں کر سکتی۔ میں نے سلویا (Sylvia) کے معنی تلاش کیے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ تھا اور اس کا مطلب تھا ''جنگل'' میں جنگل میں داخل ہو گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا میں اس جنگل میں خود کو گم کر سکتا ہوں؟

ایک ہفتے کے بعد وہ مجھے پھر ''ریگل بیگل'' میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ حسب معمول اسی کونے میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیئر کا گلاس تھا۔ میں اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا میں اپنے رویے کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔ میں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے اسے اپنی پیٹھ کیوں نہیں دکھائی۔ لیکن میں نے تو اپنے بھائیوں کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنی بہنوں اور ماں باپ کو نہیں بتایا تھا کہ ان تین چٹے سفید لڑکوں نے میرا کیا حشر کیا تھا۔ ہاں، پولیس اور ڈاکٹروں کو میں نے سب کچھ بتا دیا تھا لیکن وہ الگ بات تھی۔ میں آگے بڑھا اور سلویا (Sylvia) کے قریب والے اسٹول (Stool) پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا ''میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔'' وہ مسکرائی۔ تھوڑی دیر ہم وہاں بیٹھ کر گپ لگاتے رہے۔ پھر اس کی دعوت پر ہم وہاں سے اٹھے اور اس کے اپارٹمنٹ کی طرف چل پڑے۔

یہ کہنا بنتا ہے کہ میں نے ایک رات کا مزید کچھ حصہ اس کے ساتھ، اس کے بستر پر گزارا۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ وہ میری بنیان اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ یقیناً دیکھنا چاہتی تھی کہ میں اپنی پیٹھ کیوں چھپاتا ہوں۔ ایک بار پھر شدید غصہ مجھے پر غالب آ گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور نفرت سے اسے پرے دھکیل کر کہا ''کتیا۔ میں نے منع کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میری پیٹھ دیکھنے کی خواہش نہ کرنا۔ مگر تو سمجھتی ہی نہیں۔''

اس نے ایک موٹی سی گالی میری طرف لڑھکائی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ ''نکل جا میرے گھر سے، حرامزادے!'' اس نے چلاّ کر کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کپڑے جوتے پہنے اور اس کے اپارٹمنٹ سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک سخت سی چیز میری پیٹھ سے ٹکرائی۔ درد کی ٹیس سے میں ایک لمحے کے لیے چکرا کر گرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ الٹے سیدھے قدموں چلتے ہوئے میں اپنی گاڑی تک پہنچا اور دروازہ کھول کر انجن اسٹارٹ کر کے تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ جب میں وہاں سے چلا تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ واپس آتے ہوئے اسپینش (Spanish) زبان کے کتنے ہی الفاظ میرے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ ان لفظوں میں اپنائیت تھی۔ اجنبی نہیں لگتے تھے۔ جب تک میں اپنے بستر میں پہنچا، میں ان ہی لفظوں کو جوڑ کر جملے بنا رہا تھا۔ مثلاً ''میرے اندر میری بہن کا خون ہے'' جب مجھے خون کی ضرورت پڑی تھی تو پورے خاندان نے اپنے بازو بڑھا دیے تھے اور صرف میری بہن کا خون میرے خون کے ساتھ میچ (Match) کر رہا تھا۔ سوتے ہوئے میں اپنا نفسیاتی تجزیہ بھی کر رہا تھا کہ میرے اندر اتنی بڑی تبدیلی کیسے ہوئی اور غصے کا زہر کیونکر لبالب بھر گیا۔

میں دوپہر تک سوتا رہا۔ جاگا تو ریگستان کی طرف دوڑتا ہوا چلا گیا۔ وہ تینوں لڑکے وہیں تھے۔ میں جہاں جاتا ہوں وہ آ جاتے ہیں۔ لیکن میں انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ میں دوڑ لگا دوں۔ لیکن کیا انسان گولی سے تیز دوڑ سکتا ہے؟ گولی بھی وہ جو ان کی نفرت کی عکاس تھی۔

گھر واپس پہنچ کر میں جب نہا دھو رہا تھا تو مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے جس طرح زدوکوب کیا ہے، کیا میں دھو کر وہ نشان غائب کر سکتا ہوں؟ میں نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ میری سیاہ آنکھیں بے ستارہ آسمان کی طرح تاریک تھیں۔ کچن میں پہنچا تو ماں نے پوچھا کیا میں ٹھیک ہوں؟ میں نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ ہاں میں ٹھیک ہوں۔

''تم ٹھیک نہیں لگ رہے'' میری ماں نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی خاص بات نہیں ماں۔رات کچھ زیادہ پی لی تھی۔''میں نے کہا۔

''مگر تم پہلے تو نہیں پیتے تھے!''میری ماں بولی۔

''پہلے میں بہت کچھ نہیں کرتا تھا''میں کہنا چاہتا تھا لیکن میں خاموش رہا۔ مجھے لگا کہ میری ماں کو بھی ان الفاظ کی کچن میں موجودگی کا احساس ہو رہا ہے جو رات میں سونے سے قبل میں نے یاد کیے تھے۔

اس شام میں دوبارہ اپنے ریسٹورٹ گیا جہاں میں ویٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔کام سے رات گئے واپس آیا تو لبوں پر نیند کی دعا تھی۔صبح جاگتے ہی مجھے ان زخموں کا خیال آیا جو میری پیٹھ پر تھے۔پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ زخموں کے نشان جو میری پیٹھ پر تھے پیدائشی نشانوں کی طرح ہمیشہ رہیں گے۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ مجھے مار رہے تھے تو میں انہیں خدا کے واسطے دے رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں واسطے کیوں دے رہا تھا۔مجھے تو خدا کے وجود کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں خود سے کہہ رہا تھا کہ کاش میں واسطے دینے کے بجائے ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوتا۔وہ جب میری پشت پر اپنے چاقو کی نوک سے نفرت انگیز جملے درج کر رہے تھے تو وہ گویا میری پیٹھ کو تختۂ مشق بنا رہے تھے۔ان کا خنجر قلم تھا اور میرا خون اس وقت روشنائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں ان سے کہہ سکتا کہ میں تمہاری نفرت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔اس نفرت کے اظہار کی ضرورت کو محسوس کرتا ہوں۔تمہارے خدا بھوکے ہیں اور ظالم ہیں۔ اگر تم چاہو تو میرے جسم کو اپنے خداؤں کی بھینٹ چڑھا دو۔کیونکہ اگر جنگ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے تو جنگ میں قربانیاں بھی دی جاتی ہیں۔ مجھے اب تک احساس نہیں تھا کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ میں سوچتا رہا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر بہتے رہے۔کافی دیر کے بعد جب میرے جذبات قابو میں آئے تو مجھے احساس ہوا مجھے از سرِ نو زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ سیکھنے ہوں گے۔الفاظ، جملے، ادائیگی لیکن یہ سیکھنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں زندہ تھا۔چونکہ میں زندہ ہوں اس لیے میں اہم ہوں۔زندوں کی دنیا میں اپنا مقام پانے کے لیے مجھے جدوجہد کرنا ہوگی۔اسی سے ظاہر ہوگا کہ زندگی کی ترجمانی کے فن میں میں کتنا یکتا ہوں۔

☆

- بقیہ -

زہریلا انسان

براؤن کی اجازت سے وہ خط اٹھالیا۔اس کے ساتھ ہی اس نے پاکستان سے آئے ہوئے چند اور خطوط بھی مسز براؤن سے لیے اور چلا گیا۔

ٹام نے مہاراج سے پوچھا کیا کیلاش اردو پڑھنا جانتا تھا؟ مہاراج بولے، کیوں نہیں! میں نے اپنے بچوں کو اردو، ہندی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی تک پڑھائی تھی۔بس تو پھر پوری بات واضح ہو جاتی ہے۔کیلاش نے پٹھان کا خط پڑھا تو اس کے لیے اپنے کرموں کا الزام کسی اور کے سر تھوپنے کی آسانی ہوگئی۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اگر پٹھان کا خط اس کے ہاتھ نہ آتا تو وہ آپ کے سامنے پوتری کے گم ہونے کا کیا بہانہ بناتا، لیکن اس خط نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ چنانچہ اس نے آپ کو یہ خط لا کر دکھایا جس کی وجہ سے آپ نے اپنی بیٹی کی موت کا ذمہ دار خواہ مخواہ کے ایک بڑی پٹھان کو سمجھنا شروع کر دیا۔اصل میں وہ پٹھان خاندان بھی آپ کی طرح مظلوم ہے۔ان پر آپ کے گھر میں آپ کی پیٹھ کے پیچھے ظلم ہوا تھا۔مہاراج سر جھکائے بیٹھے تھے لیکن ان سے کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔شاید وہ اپنی لاعلمی پر گنگ تھے یا شرمندہ تھے۔ وہ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ ان کی اولاد نے ان کے ساتھ اور کسی اور خاندان کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی تھی۔

ایسے میں ٹام کی آواز آئی، آپ کیا سوچ رہے ہیں مہاراج۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میرے بیٹے نے اپنے کرموں کا پھل تو پایا ہی تھا، اس کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کرنے کی سزا میں بھی پچھلے اٹھارہ ورش سے جھیل رہا ہوں۔ پھر مہاراج نے کیلاش کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سنا کر ٹام سے پوچھا، گورے بابو، میرے سمجھ میں نہیں آیا کہ اب میں یہاں سے کہاں جاؤں، کیا کروں اور اپنی نواسی کو کیسے تلاش کروں؟ آپ اُس دیش میں رہتے ہیں۔کیا آپ اس کی تلاش میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ ٹام نے جواب دیا، مہاراج آپ اپنی نواسی کی جانب سے بے فکر ہو جائیں اور سر دست اپنے سندر بن میں گمشدہ نواسے کی کھوج لگائیں۔مہاراج نے کہا، سندر بن کے جنگلی جانوروں سے ایک بے بس بچہ کیوں کر محفوظ رہ سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب تو شان جی دیں گے۔کیا مطلب؟ مہاراج نے حیرت سے ٹام کو دیکھتے ہوئے کہا۔اگر شان جی ہمیں بتانا پسند کریں کہ راموا نہیں کن حالات میں اور کہاں سے ملا تھا تو ہو سکتا ہے کہ کچھ اور اسرار کھلیں؟ اس کہانی سے میرا کیا تعلق ہے؟ میں نے ٹام کی جانب دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔تمہارے اس سوال کا جواب میں شان جی کا جواب سننے کے بعد دوں گا۔ ٹام معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''حادثوں کی داستاں''

رضیہ اسماعیل

(یوکے)

غموں پہ ہاتھ ملنا آ گیا ہے
کھلونوں سے بہلنا آ گیا ہے

بہت پتھر کیا تھا خود کو میں نے
تو بچھڑا تو پگھلنا آ گیا ہے

محبت کہ تو نفرت ہے، جو ہے
ترے سانچے میں ڈھلنا آ گیا ہے

یہ کیسی درد کی سوغات دی ہے
بنا شعلوں کے جلنا آ گیا ہے

تجھے یہ سن کر دُکھ ہو یا خوشی ہو
مجھے گر کر سنبھلنا آ گیا ہے

گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

○

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

آنکھوں سے کب اشک افشانی نہیں
کون سے دریا میں طغیانی نہیں

زندگی میں کچھ نہیں اِس کا وقار
دل میں جب غم کی فراوانی نہیں

ہم جو کہتے ہیں سمجھ کر سوچ کر
اس لیے کرتے نظر ثانی نہیں

کیا وہ سمجھے گا مرے جذبات کو
جس نے نے میری قدر بھی جانی نہیں

دل میں چبھ جاتی ہے نشتر کی طرح
کس نظر میں قہر سامانی نہیں

وہ اگر کرتا نہیں مجھ سے وفا
مجھ کو اس پر کوئی حیرانی نہیں

وہ نہیں تو اُس کی یادیں ہیں مقیم
دُور تک اس دل میں ویرانی نہیں

جو زمانے نے کیا ہم سے سلوک
ہم بھُلا سکتے بہ آسانی نہیں

اس زمانے میں محبت کے سوا
کون سی ہے چیز جو فانی نہیں

ایسے میں کیا دل سے دل مل پائیں گے
جب محبت کی فراوانی نہیں

اُس کا چہرہ مطلعٔ انوار ہے
اُس کا چہرہ مطلعٔ ثانی نہیں

جانتا ہوں مجھ سے جب بچھڑے گا وہ
اُس کو میری یاد تک آنی نہیں

زندگی ہے حادثوں کی داستاں
زندگی بزمِ غزل خوانی نہیں

ہم کو پہلے سے ہی یہ معلوم ہے
اُس نے دل میں جو ابھی ٹھانی نہیں

زندگی کا مختصر سا ہے قیام
اس کا اس پر بھی کوئی ثانی نہیں

ایسی صورت میں اسے میں کیا کہوں
دل نے میری اک بھی مانی نہیں

کوئی بھی ایسا نہیں ہے اب ستم
زندگی میں جس کا وہ بانی نہیں

ہم نے مانا زندگی صحرا ہے عرشؔ
ہم نے اس کی خاک کب چھانی نہیں

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

محفل کو کچھ سنانا ہے، اُردو غزل تو ہو
شمعِ محفل شاعرانہ ہے، اُردو غزل تو ہو

اصناف سب میں اس کا اِک اپنا مقام ہے
کوئی دور یا زمانہ ہے، اُردو غزل تو ہو

کتنی ہی نوع کے موضوع یہ خود میں سموئے ہے
مصرعوں پہ جھوم جانا ہے، اُردو غزل تو ہو

کچھ سُن کے سنا کے بھی تحریک ملتی ہے
پھر سُن کے مسکرانا ہے، اُردو غزل تو ہو

رنگِ سخن سے بزم ہے سب کے لیے سجی
کون اپنا یا بیگانہ ہے، اُردو غزل تو ہو

کیفِ ادب میں آ کے جب احباب ملتے ہیں
تو لُو کا تھرتھرانا ہے، اُردو غزل تو ہو

کتنے دنوں سے نازلی کچھ بھی نہیں کہا
یہی بات تو بتانا ہے، اُردو غزل تو ہو!

○

عارف شفیق

(کراچی)

آندھیوں میں اک دیا جلتا ہوا رہ جائے گا
میں نہیں ہوں گا تو میرا نقشِ پا رہ جائے گا

خواہشوں کے سب پرندے شور سے اُڑ جائیں گے
تو کھڑا خاموش یوں ہی دیکھتا رہ جائے گا

وار کر سکتا تو ہوں میں اپنے دشمن پر مگر
سوچتا ہوں درمیاں پھر فرق کیا رہ جائے گا

آخری ہچکی سے پہلے گونگے ہو جائیں گے لفظ
میرے ہونٹوں پر مگر حرفِ دعا رہ جائے گا

خواب کی صورت گزرتے جائیں گے یہ روز و شب
زندگی کا بس ہمیں احساس سا رہ جائے گا

میں کسی پرچھائیں کے پیچھے نکل جاؤں گا جب
تو گلی کوچوں میں مجھ کو ڈھونڈتا رہ جائے گا

حرف جب مٹنے لگیں تم دیکھنا اوراق پر
خونِ دل سے جو لکھا ہو گا رہ جائے گا

بدگماں ہو کر بچھڑ جانے کا اس کے غم نہ کر
اب تو مل کر بھی دلوں میں فاصلہ رہ جائے گا

ڈوب کر عارفؔ سمندر پار میں ابھروں گا جب
مجمعِ احباب ساحل پر کھڑا رہ جائے گا

○

سبھاش گپتا شفیق

(بھارت)

تیرگی آٹھوں پہر ہے اور ہم
صرف امید سحر ہے اور ہم

ایک تو باہر بھنور ہے ہر طرف
ایک اندر بھی بھنور ہے اور ہم

جس طرح بھی ہو سکے کر لو بسر
دور خوابوں کا نگر ہے اور ہم

اور کچھ پل کا تماشہ ہے یہاں
کاٹھ کا گھر ہے شرر ہے اور ہم

مدتوں سے اپنے ہونٹوں پر شفیق
اک دعائے بے اثر ہے اور ہم

○

وشال کھُلر

(بھارت)

بارش بن کر خود مہکے ہو — دھوپ ویتھا مجھ سے کہتے ہو
یوں ہی چاند کھلا کرتا ہے — بالکل جیسے تم ہنستے ہو
رات کی رانی کا جل کا جل — زرد ہوا میں بہہ نکلے ہو
تپتی دوپہری دیپک راگ — سورج سورج کیوں جلتے ہو
موم کے بُت پر برسا پانی — رقص کی محفل تیاگ چکے ہو
اب نیندوں کے بستر چھوڑو — خواب میں پلکیں کھو بیٹھے ہو
میں بھی حدِ فاصل کب ہوں — تم بھی کتنے خوش رہتے ہو
چاروں جانب ہو چرچے میں — پھول کی خوشبو سے لگتے ہو
تانا بانا بُنتے رہنا — کھُلر تم میرے اپنے ہو

اشرف جاوید

(لاہور)

ایسا نہیں ہُوا کہ یہیں کا نہیں رہا — اُٹھّا جو تیرے در سے ، کہیں کا نہیں رہا
دستک ہَوائیں دینے لگیں آتے جاتے میں — ڈر بھی اُنھیں ذرا سا مکیں کا نہیں رہا
کرتا ہے بات بات پہ اب شہر داریاں — وہ شخص اعتماد و یقیں کا نہیں رہا
طفلانِ سنگ بار نہ جانے کہاں گئے — پہلے سا رنگ بھی توجبیں کا نہیں رہا
شامِ غریباں آج یقینی ہے ! چاند بھی — دسویں کا ہو گیاہے ، نویں کا نہیں رہا
غیروں سے مل کے ساکھ گنوادی رہی سہی — رہتا تھا وہ جہاں پہ ، وہیں کا نہیں رہا
کرنے لگا ہے نقل مکانی شبانہ روز — اس واسطے بھی ربط قریں کا نہیں رہا
دیمک لگی ہوئی ہے اماؤس کے خوف کی — وہ ناک نقشہ ماہِ مبیں کا نہیں رہا
سب اختیار بانٹ دیے نائبین میں — افلاک کا خدا ہے ، زمیں کا نہیں رہا

ثاقب تبسم ثاقب

(گوجرانوالہ)

طلسماتی جہاں کا اک حسیں منظر تراشوں — میں چشمِ خوں فشاں سے بھی ترا پیکر تراشوں
کہاں اس عمر میں بھی عشق کا مَیں روگ پالوں — کہاں اس عمر میں اب وقت کا گوہر تراشوں
بڑوں نے یہ بتایا ہے یہ میرا ہی وطن ہے — یہ میرا فرض ہے اب ہر گلی، ہر در تراشوں
خدا کے اِذن سے دل کش بناتا ہوں جہاں کو — سو اس کو رات بھر سوچوں کبھی دن بھر تراشوں
ڈھلا سورج، ڈھلا سایہ، ڈھلے جذبات میرے — مگر اس کو قسم سے آج بھی اکثر تراشوں
میں آذر تو نہیں ہوں اس لیے ثاقب تبسم — کیوں تا عمر اس کی ذات کا پتھر تراشوں

رفیع الدین ذکی قریشی

(لاہور)

عیاں کیوں چشمِ حیراں پر ترا جلوا نہیں ہوتا
جمال مُستتر اپنوں سے یُوں پردا نہیں ہوتا

ہمیشہ خواب کی دنیا حقیقت میں نہیں ڈھلتی
حسیں تعبیر بھی ہو ایسا ہر سپنا نہیں ہوتا

یہ دنیا ہم تماشا گاہ عالم جس کو کہتے ہیں
یہاں کیا کچھ ہوا ہے، ہاں یہاں کیا کیا نہیں ہوتا

کسی کا کوئی دکھ بانٹے، کسی کے کوئی کام آئے
امیروں کی یہ دنیا ہے، یہاں ایسا نہیں ہوتا

اسے تقدیر کہیے یا مشیت نام رکھ دیجئے
کہ جیسا چاہتا ہے آدمی ویسا نہیں ہوتا

یہ کیسے شہر نا پُرساں میں آ پہنچا ہوں میں یارب
جسے اپنا سمجھتا ہوں، وہی میرا نہیں ہوتا

حنائی آنسوؤں میں ڈھل کے صبح و شام بہتا ہے
کسی مرہم سے بھی یہ زخمِ دل اچھا نہیں ہوتا

شبِ غم بھی تمہاری یاد میرے ساتھ ہوتی ہے
میں تنہا ہونے پر بھی لمحہ بھر تنہا نہیں ہوتا

مجھے غیروں سے اُمیدِ وفا ہے دشتِ ہستی میں
یہاں تو اپنا سایہ بھی ذکی اپنا نہیں ہوتا

رئیس صدیقی

(بھارت)

عنایتیں بھی اُسی پر خدا نہیں کرتا
وہ آدمی جو کسی کا بھلا نہیں کرتا

کبھی کبھی کوئی صدمہ رُلا بھی دیتا ہے
یہ بہتا پانی کسی سے رُکا نہیں کرتا

خِرد کے ذہن پہ رکھا ہے بوجھ دنیا کا
دِوانہ فکر کسی کی ذرا نہیں کرتا

بدل رہی ہے زمانے کے ساتھ چاہت بھی
کسی کو عشق یہاں با وَلا نہیں کرتا

یہ رکھ رکھاؤ ترے جسم پر ہی سجتا ہے
گلاب جوڑے میں سب کے کِھلا نہیں کرتا

چکانی پڑتی ہے قیمت سفید پوشی کی
رئیسؔ، عیب سبھی کا چھپا نہیں کرتا

رومانہ رومی

(کراچی)

کبھی قد سے بڑا سایا ہوا ہے
فریبِ وقت میں آیا ہوا ہے

شعور و غم ہوا ناپید جب سے
یہ منظر سارا دھند لایا ہوا ہے

محبت ہے سبھی کے غم سے مجھ کو
غمِ ہستی کو اپنایا ہوا ہے

کبھی تو میری جاں تو غور کرنا
یہ شعلہ کس کا بھڑکایا ہوا ہے

نہ فرقت کا ہے جی میں رنج کوئی
نہ دِل وحشت سے گھبرایا ہوا ہے

ہمیشہ دِل کو فرشِ راہ کرنا
محبت نے یہ سمجھایا ہوا ہے

ہر اِک کو اجنبی ہے جانتا یہ
مرا دِل سب سے گھبرایا ہوا ہے

گداگر سب نظر آتے ہیں مجھ کو
کہ دامن سب نے پھیلایا ہوا ہے

ہے طاری دِل پہ میرے حُسن کس کا
اے رومیؔ! کون یہ چھایا ہوا ہے

پوسٹ ماڈرن درویش

جمیل احمد عدیل
(جھنگ)

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی جواں سال نقاد، نظم گو اور روشن بصر دانشور ہیں۔ دس (۱۰) سے زائد وقیع کتب کے سرورق ان کے دستخط سے مزین ہیں۔ مطالعے میں تنوع اور وسعت کے عملی طور پر قائل ہیں۔ یہ حقیقت ہے ان کی تخلیقی نگارشات سے لے کر تنقیدی/تحقیقی مساعی تک کچھ بھی عموم کے زمرے میں اسیر نظر نہیں آتا؛ گویا انھوں نے شعور کی بیداری کے ساتھ مصابرت کے دشوار گزار راستے کا چناؤ کیا ہے اور فی زمانہ یہ جادہ قریب قریب متروک ہو گیا ہے کہ اب سریع الرفتار علیم وادیب وشاعر مسابقت کے جنون میں دائمی گرفتاری کو اعلانیہ ترجیح قرار دے کر ناموری کی جنگ لڑ رہے ہیں؛ ایسے میں کوئی دیوانہ کامل دو برس عزلت گزیں رہ کر محض ایک 'خشک سی' کتاب کے مساوی ترجمہ شدہ مواد کو پیش کش بنا پائے ۔۔۔ بظاہر کوئی غیر معمولی کارنامہ محسوس نہیں ہوتا!! لیکن واقعہ یہ ہے انھوں نے اردو میں یکسر نئے خم کدے کا بنیادی پتھر اپنے ہاتھ سے رکھنے کا اعزاز حاصل کر لیا ہے!! یوں 'مبادی' ہونے کی شناخت ان کی ہمسفر رہے گی!!

ڈاکٹر نیازی کی شبانہ روز کاوش کا ثمر: 'ماحولیاتی تنقید: نظریہ اور عمل' سے معنون ہو کر سامنے آیا ہے۔ فی الاصل یہ دس منتخب علمی/فکری مقالات ہیں[1] جنھیں انگلش سے اردو کے قالب میں ہنرمندی کے ساتھ ڈھالا گیا ہے۔ ہر تحریر کا مصنف جدا ہے لیکن موضوعی تشارک جملہ مشمولات کو ایک منطقے میں یکجا کر رہا ہے۔ مذکورہ موضوع کم از کم انتقادیات کی ترجمان مقامی روایت میں کافی اجنبی ہے: جی ہاں ۔۔۔ Ecocriticism ۔۔۔ اسی کو 'ماحولیاتی تنقید' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس باب میں میسر آنے والی توضیح کی تلخیص یوں بھی ترتیب پا سکتی ہے:

''(Ecology) یہ اصطلاح یونانی لفظ 'Oikes' بمعنی گھر یا رہنے کی جگہ سے ماخوذ ہے۔ ۱۸۷۳ء میں یہ اصطلاح Ernst Haeckel نے علم حیاتیات کی اس شاخ کے لیے وضع کی تھی جو اجسام نامیہ اور ماحول کے باہمی رشتوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ تصور وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ۔۔۔ نباتیات کے سلسلے میں اس علم کو حیوانات کے مقابلے میں زیادہ فروغ حاصل ہوا ۔۔۔ ماحولیات کو متعدد ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے، مثلاً: آبادیاتی، ارتقائی، گروہی، نفسیاتی اور کرداری ۔۔۔'' (تشریحی لغت/ص: ۲۵۸)

مختلف لغات سے ماخوذ الفاظ میں: Ecology/Bionomics[1] شعبہ حیاتیات سے منسلک وہ شاخ ہے جس میں اجسامِ نامیہ اور ان سے وابستہ ذی روح/غیر ذی روح مجموعی قدرتی ماحول کے مابین ارتباط کو مطالعے کا مرکزہ بنایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں دو اساسی سوالات اہمیت اختیار کر جاتے ہیں:

• ارض اور اس کے متعلقات پر ماحول کی معنویت کن جہتوں سے محیط ہے؟
• اس تناظر میں آرٹ اور لٹریچر کے ساتھ کیا نئے رشتے ظہور پذیر ہوتے ہیں؟

یوں غور کیا جائے تو تصدیق کرنی پڑے گی کہ استفہامی زاویے اپنی عمیق زرخیزیوں کے باعث خاص منہاج پر نشوونما پاتے ہوئے ایک مربوط فکری نظام کو برابر تشکیل دیتے چلے جا رہے ہیں ۔۔۔ اور غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں ایک تازہ طرزِ احساس کو فروغ مل رہا ہے وہاں کچھ قدیم کلیے ہاتھ سے پھسلے ہوئے نازک زجاج کی طرح تیزی سے کرچیوں میں تبدیل ہو رہے ہیں ۔۔۔ اور کسی آئیڈیالوجی کے جاندار ہونے کا ایک پیمانہ ردوقبول کی توانائیوں کا یکا یک Generate ہو جانا بھی ہے، جیسے Emotional Intelligence کا کرشمہ!! ہاں! یہ ہوتا دفعتاً ہے لیکن Fool's bolt soon shot والی مضحکہ خیزی کا اس میں شائبہ تک موجود نہیں ۔۔۔ سو، اس مکتبِ فکر پر تحدید کی تہمت عاید ہو گی بھی تو زیادہ سے زیادہ یہی کہ یہاں اثر ونفوذ کا علاقہ اُس بیضوی گولے تک محدود ہے جسے ارض کہا جاتا ہے، کیا ہوا اگر ایک علمی اور عملی مسئلے کی اہمیت کے پیش نگاہ زمین کو ایک زنار کے ذریعے مقید کر لیا گیا ہے ۔۔۔ علاوہ ازیں مانا کہ اکوان وعوالم کے سلاسل لامتناہی ہیں مگر شوقیہ آفاق میں گم ہونا یا بطور تعلی آفاق کو اپنے وجود میں گم کرنے کا ادعا، آخر اس کی معاً احتیاج ہی کیا ہے؟ نیز کیا زمینی عملداری (Jurisdiction) کے تمام قضایا کسی منطقی انجام تک پہنچ چکے ہیں؟ اس سلطنت کا ایک اہم مقدمہ بہررنگ 'ماحول' ہے جس کے تحفظ کی ذمہ داری سے چشم پوشی کا نتیجہ ہمہ اقسام کی آلودگی اور ہلاکت ظاہر و باہر ہے: ''ماحول کو متاثر کرنے والے بعض بڑے حادثات ۔۔۔ مثلاً: ۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کو بھوپال میں یونین کاربائیڈ کے کارخانے سے زہریلی گیس کا اخراج ۔۔۔ پچیس سو (۲۵۰۰) اموات ۔۔۔ اور چرنوبل (روس) کے جوہری ری ایکٹر کا حادثہ ۔۔۔ ۲۶/اپریل ۱۹۸۶ء جس میں چھتیس (۳۶) اموات فوری طور پر ہوئیں، دو سو اکتیس (۲۳۱) افراد شدید ریڈیائی امراض میں مبتلا ہوئے، نیز اندازہ لگایا گیا کہ کم وبیش چونتیس ہزار (۳۴۰۰۰) متاثرہ افراد کی موت اسی مادے کی وجہ سے آئندہ چالیس (۴۰) برس میں متوقع ہے۔'' یوں بجا طور پر نشاندہی کی گئی ہے کہ امریکا اور مغربی یورپ سمیت کئی ممالک میں 'ماحول بچاؤ' قانون سازی توجہ پا رہی ہے ۔۔۔ برسبیل تذکرہ یاد آیا، رحیم گل کے ناول: 'جنت کی تلاش' میں جب جھیل سیف الملوک کا Stunning منظر سامنے آتا ہے تو راوی یہ دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہے کہ ۔۔۔ چاروں طرف دودھ کی طرح سفید برف میں لپٹے ہوئے سر بفلک پہاڑ اور ان کے درمیان ڈیڑھ میل سبز وشفاف پانی کی جھیل یوں لگ رہی تھی جیسے سفید سونے کی انگوٹھی میں سیال زمرد کا نگینہ ۔۔۔ مگر ایک چیز اسے پسند نہیں آتی: ''مجھے وہ ہٹ بری طرح کھل رہا تھا جو جھیل کے مغربی جانب اکیلا ایستادہ تھا۔ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی یہ مصنوعی چیز فطرت کے اس حسین منظر کا جزو بننا مجھے گوارا نہیں تھی۔'' (ص: ۲۱۰)

اگر چہ بادی النظر میں تاثر یہی مرتسم ہوتا ہے کہ Ecology میں نباتات کوفوقیت دی گئی ہے لیکن حیوانات کو بھی 'مظاہرِفطرت' کا جزو تسلیم کیا گیا ہے اور انسان بڑا دلچسپ 'مظہر' ہے کہ ایک طرف حیوانات سے اپنا لگاؤ ظاہر کرتا ہے لیکن جانے کیوں انھیں مطیع کرنے کے چکر میں رہتا ہے؛ شاید منفعت پرستی کا مسلک اپنانے کے باعث اس کا Object یہی رہا ہے کہ چوپایوں کے ہر ہر جزو سے فائدہ کشید کیا جائے۔۔۔اور اس کے متوازی بہائم کے ساتھ باقاعدہ عداوت بھی انسانی وتیرہ ہے؛ اس کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ وہ دیگر ارضی مخلوقات کا رقیب ہے، نیز یہ سمجھتا ہے وحوش وطیور سے اس کی رقابت دوطرفہ ہے[۲]!! ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک جگہ لورین ایزلے کی کتاب: The Immense Journey کے Contents پر بات کی ہے کہ زندگی سمندر سے برآمد ہوئی اور پھر نباتات وحیوانات اور پرندوں کی صورت میں مصروفِ سفر ہوئی اور لاکھوں کروڑوں برس تک کروٹ پر کروٹ لیتی چلی گئی مگر آج سے محض چند لاکھ سال پہلے انسان بھی اس کارروائی میں شامل ہو گیا اور چرند پرند کے لیے یہ ابھی اجنبی ہے!! ایزلے کے الفاظ ہیں: ''جب میں صبح کے جھٹپٹے میں بیدار ہوتا ہوں اور نیویارک کی کسی بلند وبالا عمارت کی چھت پر سے پرندوں کی چہکار کو سنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے پرندے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں: 'کیا وہ (انسان) ابھی گیا نہیں؟'۔۔۔!!''

ماحولیات کے اس خاص پہلو کو طرزِ فکر بنانے والوں کو پڑھیں تو یہ سوال اپنے آپ ابھرتا ہے کہ انسان کے دل ودماغ میں صدیوں سے راسخ یہ خوش فہمی کیا کبھی رخصت ہو سکتی ہے۔۔۔کہ۔۔۔زمین کیا وہ کائنات کا نیوکلیس ہے؟ بلکہ ذرا رومانوی لہجے میں بات کی جائے تو وہ کاسموس کو برات سمجھتا ہے اور خود کو دولھا!! جبکہ واقعہ یہ ہے نیچر کے قوانین انسان نے نہیں بنائے۔۔۔ہاں! اس نے اپنے ہاتھ سے انھیں کتاب میں بڑی توجہ اور ترتیب کے ساتھ درج ضرور کیا ہے۔۔۔جب قانونِ فطرت کے مطابق کوئی فیصلہ سامنے آتا ہے تو ایک سرشاری سی اسے گھیر لیتی ہے اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ اس دستاویزِ آئین کا محض ٹائپسٹ ہے!! ماحولیات کے مخصوص مباحث اس نقطہ ماسکہ کو معروضی انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ متذکرہ 'بشری نرگسیت' فطرت سے دوستی کے معاملے میں سدِراہ ثابت ہو رہی ہے، اس کا سدِّ باب ہونا چاہیے!! اس کتاب میں شامل سکاٹ رسل سینڈرز کا مضمون: 'فطرت کی حمایت میں' بڑے پر لطف استدلال کے ساتھ بعض مغالطوں کو نام زد کرتے ہوئے اس امر کی طرف بلیغ اشارے کرتا ہے۔۔۔مثال کے طور پر اس کا کہنا ہے: ''فطرت کے بارے میں ہمارے نظریات جس قدر بلند اور ٹھوس ہیں، ہمارا ذاتی تجربہ اتنا ہی کھوکھلا ہے!!'' پھر وہ جدید فکشن کو موضوعِ نقد بناتے ہوئے اپنے بیانیے کو قوت پہنچاتا ہے کہ ناول/ افسانہ نگار اکثر انسانی قلم رو سے آگے نہیں دیکھ سکتا۔۔۔اب اس موقف کو یک قلم مسترد کر دینا ایسا سہل بھی نہیں کہ انسان نے Egoistic ہو کر دھرتی کے ساتھ اپنے ناتے کو 'نفسیاتی مسئلہ' بنایا، یوں، 'راکب' اور 'مرکب' کی آویزش نے زور پکڑا، نتیجہ معلوم ایک خاص قسم کا عُجب اور احساسِ عظمت ہمراہ Radicalism اعصاب پر سوار ہو گیا!!۔۔۔!! اس پس منظر میں ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی اصولی صراحت کرتے ہیں:

''ایلڈ ولیوپولڈ نے 'زمینی اخلاقیات' کا تصور پیش کر کے بشر مرکزیت کے اس تصور کو چیلنج کیا جس کی رو سے انسان اس کائنات کا مرکز اور واحد متکلم موضوع ہے اور فطرتی دنیا کی ترتیب میں اسے دیگر مخلوقات اور موجودات پر برتری اور فضیلت حاصل ہے۔۔۔اس مفروضے نے اِنسان اور فطرت کی اس ثنویت اور تشکیلی علاحدگی کی بنیاد رکھی جس نے انسان کو فطرت پر غلبے اور اس کے استحصال کا حق تفویض کیا۔'' (ماحولیاتی تنقید/ص:۷)

اس نقطہ مرکزیہ کی صورت سارا Narrative ایک لمحے میں کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ ادب کے زوایا افرادی سماج ہی سے اکلوتا ناتا نہیں رکھتے، عمرانیات سے ہٹ کر، ایک 'جہانِ دگر' بھی ہے۔۔۔اور 'دگر' کا واحد مفہوم 'غیر' نہیں۔۔۔پھر وہ 'دوسری دنیا' کہیں دور آباد نہیں، یہیں قریب تر ہے وہ شبستاں کھلا ہوا۔۔۔اگر اِنسانی مدرکہ رفاقت کی صداقت پر آمادگی ظاہر کرے اور اسرا/ ہجرت کے اس Big Incentive پر مرکوز ہونے کی توفیق حاصل کر لے جسے 'بٰرکنا حَولَہٗ' (جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے) سے تعبیر کیا گیا ہے، تو شعور کا یہ نور نصیب ہو جائے گا کہ گردوپیش کا قدرتی نقش کیسی حیران کن وقعت کا حامل ہے!! اگر اس اعلا ادراک تک جزوی رسائی بھی میسر آ گئی تو Environmentalism اپنے وسیع مفاہیم کے ایک اور دردلکشا تک لے جائے گا۔۔۔یوں فرد فاتح یا داروغہ ہونے کا زعم ایک طرف رکھ کر طبیعی ماحول کا رفیق اور نگہدار ہو جائے گا!! یہ تو ہوئی اس کی عملی طرف رہی اس کی علمی جہت تو: 'ماحولیاتی تنقید' کا معتدبہ حصہ، اسی کو مضمون بناتا ہے کہ Post Industrial Age میں نباتات وحیوانات۔۔۔حتیٰ کہ جمادات کے بے جان ابدان پر 'کتب مینار' تعمیر ہوئے۔۔۔شعروادب پر آدم زاد بلاشرکتِ غیرے قابض رہا ہے۔۔۔[۳] کیا صرف اس لیے کہ لفظ وحرف کی حرکیات، اس کی دانست میں اُسی کے داہنے ہاتھ کی ملکیت قرار پا گئی ہیں!؟! محرر اور خطیب ہونے کا منصب یہ ثابت نہیں کرتا کہ اب وہ فطرت کا دست نگر نہیں رہا، لائیٹ موڈ کا سچ یہی ہے کہ فطرت (گربہ) شیر کی خالہ ہے جس نے شیر (انسان) کو اصولی طور پر ابھی درخت پہ چڑھنا نہیں سکھایا: ''فطرت ایسی مطابقت پذیر حکمت عملی ظاہر کرتی ہے جس کی پیچیدگی انسانی ذہن کی تدبیر سے کہیں ماورا ہے۔'' (گلین۔اے۔لو) یوں ماحول پسندوں نے ادب کو سماج سے زیادہ بڑا کینوس فراہم کرنے کی مساعی کا آغاز کیا ہے۔۔۔اگر ہمارے ہاں اس جادے کا اثبات ہوا تو اردو ادب اور تنقید کو ایک مختلف Sensibility کے ذریعے نئی کمک فراہم کی جا سکتی ہے جو ایک جدید فکری کلچر کی بنیاد بن سکتی ہے۔۔۔ظاہر ہے یہ متوازی تعبیر بجائے خود مابعد

جدیدیت کے اس خیال کی موید ہے جس میں Single Interpretation کی راجدھانی پر سوالیہ نشان عاید کیا گیا تھا۔ اب اسے چاہے 'طرزِ مطالعہ' ایسا مہذب تسمیہ دیا جائے یا باقاعدہ دبستان/مکتبِ فکر/تھیوری سے موقر کیا جائے لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ وقت کی گزران روایت کے Static Pressure کے درپے ہے۔ اس ہنگامۂ دارو گیر میں تصور تصور سے، نظریہ نظریے سے اور خیال خیال سے متصادم ہو رہا ہے؛ یوں فکری جدلیت کی بدولت نئی سے نئی امتزاج کاری مشاہدے میں آ رہی ہے؛ اسی تغیر کو ثبات عطا ہو رہا ہے؛ حتمیت کے صنم کو غالباً پہلے اتنے خطرات درپیش نہیں تھے!!

Eco critics نے فطرت کے دلدادگان سے اختلاف بھی کیا ہے اور گویا یہ جدت دی ہے کہ ہمدردی کی صفت کے ساتھ اگر سکوتِ[۴] لالہ وگل سے کلام کیا جائے تو ممکن ہے اُدھر سے یہ جواب ساعت سے ٹکرائے: 'میں جمالِ فطرتِ حُسن ہوں، میری ہر ادا ہے حسین تر!' اب تک تو انسان اپنے ہی خطوطِ خمدار پہ سوجان سے لہلوٹ خود کو فطرت کا سب سے حسین انگ قرار دینے میں محو ہے، لیکن یہ حق دوسرے کو بھی ملنا چاہیے!! حُسنِ بے پروا اپنی بے نقابی کے لیے شہر سے زیادہ بن پر بھی انحصار کر سکتا ہے!! ''بن، غیر ذات کے مقابل ذات کی شناخت کے لیے ہماری آگہی کو بلند ترین سطح تک لے جانے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے!!'' (بروس برجر) یہی وہ مقام ہے جہاں رومان زدہ فطرت نگار پیچھے رہ جاتا ہے کہ اس نے جو بھی نغمہ سرائی کی ہے انسان ہی کو مرکزی درجے میں رکھ کر کی ہے۔۔۔ تفصیل کے لیے سکاٹ سلووک کے مضمون: ''فطرت نگاری اور ماحولیاتی نفسیات'' کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنا ہوگا!!

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی یہ کوشش اس لیے بھی متوجہ کرتی ہے کہ انھوں نے سبقت کے توام یعنی عجلت کے طلسم سے خود کو بچا کر بڑی طمانیت کے ساتھ اس کتاب پر کام کیا ہے؛ اسی لیے وہ پورے اعتماد کے ساتھ اردو متن میں علمی، ادبی، فکری، نظری تخلیقی، لسانی شیون کے پیہم پاسبان بنے رہے ہیں!! اس کتاب کو 'محض ترجمہ' کہنے میں مجھے تامل ہے، درحقیقت یہ دستاویز مولف کی تحقیقی/تنقیدی بصیرتوں کا ٹمس ٹیسٹ ثابت ہوئی ہے کہ اگر انتقادی تناظر میں جائزہ لیں تو وہ عمومی تنقیدی کلامیوں کا گہرا درک رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔۔ نیز بطور خاص یقیناً مذکور مباحث کی شعریات سے بھی وہ پورے طور پر واقف ہیں وگرنہ وہ ان ادق قضیوں کے لیے ایسا پُرسہولت اور شاندار اسلوب وضع نہ کر پاتے۔۔۔ البتہ ایک بات کہنی ہے کہ ڈاکٹر نیازی نے قوسین (Brackets) کا استعمال قدرے زیادہ کیا ہے۔۔۔ انگلش کی اصل اصطلاح درج کرنے کی حد تک تو یہ عمل باجواز ہے لیکن جملہ معترضہ یا مجرد توضیح کے نقطۂ نظر سے شاید اسے سراہا نہ جا سکے۔۔۔ اگر بالفرض Original English Text میں بھی صورت حال یہی ہے تب بھی خطوط وحدانی میں موجود عبارتوں کو کسی طرح اصل اردو متن میں جذب کرنے کی مشقت اٹھائی جا سکتی تھی اور بعض صورتوں میں پادرقی حواشی کا اضافہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ بہرکیف اس طرح متن کا بہاؤ مزید رواں ہو جاتا لیکن یہ کوئی نمایاں عیب نہیں ہے؛ کتاب میں خوبیاں واضح رنگ میں غالب ہیں اور یہ کیا کم ہے کہ ڈاکٹر نیازی نے قدم قدم پر تحقیقی ضوابط سے واقفیت کا بھرپور ثبوت دیا ہے؛ حوالہ جات کے اہتمام میں حساس رہے ہیں؛ آخر میں اہم اصطلاحات کی عمدہ تشریحات؛ مضمون نگاروں کا مختصر تعارف؛ مآخذ، بہ ترتیب تختی (Alphabetical) اسما کی دوزبانی جدول بندی۔۔۔ غرض ہر مقام پر محنت شاقہ کلام کرتی ہے؛ چناں چہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے اس تاثر کی تائید کیے ہی بنتی ہے:

''بلاشبہ اس کتاب کو اردو سائنس بورڈ کی چند اہم ترین اشاعتوں میں شمار کیا جائے گا!!''

آخری بات! ماحول دوست مفکرین کی نگاہ میں فطرت سے وابستہ نشوونما کا عمل سبز رنگ کی علامت رکھتا ہے۔۔۔ اگرچہ سرورق کے مصور جناب محمد الیاس کبیر نے اس شیڈ کو زیادہ نمائندگی نہیں دی[۵] لیکن مقاصدِ فطرت کے نگہبان، پوسٹ ماڈرن درویش ڈاکٹر نیازی کی جانب سے ملنے والے اس علمی تحفے کو 'برگِ سبز' کہا جا سکتا ہے!!

حواشی

۱۔ ماحولیاتی تنقید: آغاز وارتقا اور امکانات/شیرل گلاٹفیلٹی
۲۔ فطرت کی حمایت میں/سکاٹ رسل سینڈرز
۳۔ فطرت اور خاموشی/کرسٹوفر میئر
۴۔ فطرت سے متعلق تصورات پر نظر ثانی/گلین اے۔ لو
۵۔ ادب اور ماحولیات/ولیم روئیکرٹ
۶۔ فطرت نگاری اور ماحولیاتی نفسیات/سکاٹ سلووک
۷۔ خواہش کی زبان اور وطن/سوئیلن کیمپ بیل
۸۔ ماحولیاتی بصیرت: باختن کے نظریات کی روشنی میں/مائیکل جے۔ میکڈول
۹۔ ماحولیات اور مابعد نوآبادیات/راب نکسن
۱۰۔ ماحولیاتی تانیث، ماحولیاتی مارکسیت اور سماجی ماحولیات/گریگ گیرارڈ

۲ انسان کے تو جذباتِ نفرت وکراہت بھی اظہار کے لیے جنسی اعضا کے بعد جانوروں کے ناموں سے مدد مانگنے پر مجبور ہیں!!

۳ ''۔۔۔ سبز پودے زمین پر سب سے زیادہ تخلیقی نامیے ہیں؛ یہ فطرت کے شاعر ہیں۔۔۔ نظمیں ہمارے درمیان سبز پودے ہیں؛ اگر شاعر سورج ہیں تو پھر نظمیں سبز پودے ہیں۔۔۔!!'' (ولیم روئیکرٹ)

۴ 'سکوت' ایسی سادہ شکل کا پیش کار نہیں ___ اس کی لطیف اطراف سے آگہی کی جستجو ہو تو کتاب میں شامل کرسٹوفر میئر کا مضمون: 'فطرت اور خاموشی' کی خواندگی کا بطور خاص حصہ ہوا جائے!!

۵ ویسے ٹائٹل بہت جاذبِ نظر ہے!!

''افسانے کا درخشاں دور''

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

افسانہ وہ صنف ہے جس نے ایک صدی سے کچھ اوپر مسافت طے کر لی ہے۔اس دوران اپنے عہد وزماں کے حساب سے اس نے مختلف ارتقائی سفر طے کیے ہیں اور اس کے مضامین واشکال کی رنگ و بو کی کیا کہیے کہ اس گلشن میں ہر رنگ و بو کا گل نظر آتا ہے۔

یہ افسانے کا وہ درخشاں دور ہے جہاں وہ ادیب جواب کہنہ مشق، پختہ کار اور اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں وہ بھی بدستور اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اور نیا لہو بھی افسانے کو مل رہا ہے۔

محمد حامد سراج بھی ایک معتبر ادیب ہیں اور افسانے کا ایک بڑا نام شمار کئے جاتے ہیں۔حامد سراج کے نصف درجن کے قریب افسانوی مجموعے آ چکے ہیں۔''میا'' ان کا لازوال شاہکار ہے ایک ایسا خاکہ کہ جس میں افسانوی چاشنی بدرجہ اُتم پائی جاتی ہے اس کے علاوہ ترتیب وتدوین میں بھی وہ کئی معرکے سرانجام دے چکے۔''براداہ'' ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں بیس مختصر افسانے شامل ہیں۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ''ہوٹل'' ہے۔حامد سراج کی تحریر سے میرا پہلا تعارف بھی ان کے اسی افسانے سے ہوا تھا۔دیہی زندگی کے پس منظر میں معاشرتی قدروں کے زوال وعروج کے بیچ امید وجہد مسلسل کی یہ کہانی دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔

''کھڈیر'' اس مجموعے کا ایک اور خوب صورت افسانہ ہے جس میں حامد سراج کا اسلوب نکھر کر سامنے آتا ہے۔دیہی معاشرت ان کی رگوں میں رچی بسی ہے اور ان کے افسانوں میں یہ رنگ بہت گہرا ہے اور اس افسانے میں بھی دیہی زندگی کی عکس بندی، معدوم روایات کا المیہ''کھڈیر'' اور درندوں کے بدلتے روپ ہیں جو آج اسلحہ تھامے کھڑے ہیں۔

''خراد مشین'' جہاد افغانستان کے پس منظر میں بہت زیادہ تفصیل میں جائے بغیر ایک دلگداز افسانہ ہے کہ کیسے معاشرے کی یہ نوخیز کونپلیں جو کمزور شاخوں پہ کھلتی ہیں جو جنگی خراد مشینوں کا خام مال بن جاتی ہیں۔

حامد سراج کے افسانوں کے خوب صورت جملے جا بجا نظر کو رکنے پہ مجبور کرتے ہیں۔

''برادہ'' اس مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ہے اس کی کچھ سطریں:

''یہ زندگی ایک قلفی ہے تم اس سے لطف اندوز ہونا سیکھو، نہیں تو تھک جاؤ گے اور تھکن موت ہے، مایوسی ہے''

حامد سراج کے افسانوں میں نوسٹلجیا اور زندگی کی مسافت کی تھکن پوری شدت سے نظر آتی ہے۔

''ٹاؤن کمیٹی'' اس مجموعے کا ایک اور عمدہ افسانہ ہے۔اس کا یہ جملہ ملاحظہ کیجئے

''اس معصوم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ مارشل لا کے دور میں جو متاع کھو جائے وہ کبھی واپس نہیں ملا کرتی، یہ تو ایک معمولی سی کمی گھڑی تھی کیونکہ جب اس کو یہ بات معلوم پڑی نصف صدی گزر چکی تھی۔''

''ٹاؤن کمیٹی'' میں مصنف نے کمی گھڑی اور وقت کے استعاروں کو استعمال کرتے ہوئے اک شہر کا نوحہ والمیہ رقم کیا ہے۔

''پھر وہی دشت ستم'' ایک مذاحمتی افسانہ ہے جس میں مارشل لا کے جبر کے انسانی نفسیات پر اثرات کو خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

''نماز قصر'' ایک زندہ رہنے والا شہکار ہے۔مکمل اختصار میں عورت کی زندگی کا المیہ سمٹ کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں سماج، مذہب اور صدیوں کی روایات کو مصنف کس چابکدستی سے مختصر پیرائے میں بیان کر گیا ہے کہ دل سے تحسین برآمد ہوتی ہے۔

اس مجموعے کا مطالعہ کرتے وقت قاری کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ دیہی زندگی، اس کی روایات وپس منظر کا حسن، فرار کی آرزو، لمبے سفروں پہ گامزن زندگی جو روزگار کی مشقت کی تھکن سے چُور چُور ہے؛ مصنف کے مرغوب منطقے ہیں۔

حامد سراج کے افسانوں میں عصر حاظر کی برق رفتاری، انسان کی وجودی تنہائی اور بدلتی قدروں کا نوحہ بہت شدت سے بیان ہوا ہے۔''مولوی قاسم بہت مصروف ہے'' بھی اس المیے کی ایک مثال ہے۔

''ایک اور داؤ'' ایک خوب صورت روایتی رومانوی کہانی ہے جس کا پس منظر دیہی زندگی ہے مگر دہشت گردی کے خلاف ایک موثر آواز ہے جو زندگی سے رومان کا حسن چھین لیتی ہے۔

''موچی جوتے پالش کر رہا تھا'' انسان کی وجودی ازلی تنہائی اور شناخت و پہچان لئے اک خود کلامی جیسا افسانہ ہے۔حامد سراج کا شمار سنئیر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

دوسرا افسانوی مجموعہ''اس کائنات میں کسی جگہ'' محمود ظفر اقبال ہاشمی کی تحریر ہے اور میرا ان کی تحریر سے یہ پہلا تعارف ہے اور افسوس بھی ہوا کہ اب تک ایک عمدہ لکھاری کو پڑھنے سے محروم رہی۔وہ بنیادی طور پر ایک ناول نگار ہیں اور یہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

کتاب کی طباعت واشاعت اتنی عمدہ اور خوب صورت ہے کہ اس پہ کسی حسین پینٹنگ کا گمان ہوتا ہے اور یہی خوبی ان کے اسلوب کی ہے گروہ اپنے تعارف میں یہ نہ بھی بتائیں تو ان کا طرز نگارش ایسا ہے کہ اس کے خوب صورت اور دلکش سٹروکس اسے ایک خوب صورت پینٹنگ کی صورت میں ڈھال دیتے ہیں۔

محمود ظفر اقبال کی تحریر پڑھتے ہوئے بے ساختہ مجھے اے حمید ان کے

بانس اور چائے کے جنگل پیڑھ پودے اور رومانس سے لتھڑی تحریر یاد آئی، یہی رومانس اور رجائیت ظفر اقبال ہاشمی کی تحیر کا اختصاص ٹھہرتی ہے۔ یہاں فطرت، انسان اور خدا سے محبت ہی ہر سو بکھرتی نظر آتی ہے۔اس کی وجہ بھی قاری آسانی سے کھوج سکتا ہے وہ اپنے والد کے خاکے ''میرے ابو'' میں لکھتے ہیں۔

''ایک فیصد امکان اور آدھے فیصد توازن پر ہزار سال قائم رہنے والا امید کا مضبوط پل وہ انجینئرنگ کے تمام اصولوں کو چیلنج کرتے ہوئے بڑی آسانی کے ساتھ تعمیر کرلیا کرتے تھے۔''

جس شخص کی پرورش و پرداخت ایسے رجائیت اور امید بھرے ماحول میں ہوئی ہو اس کے اندر محبت و امید کے ایسے ہی روشن چراغ جلنے چاہیں۔ان کی تحریر کی دوسری بڑی خوبی تحریر کی چاشنی ہے جس میں تلخی نام کو نہیں یوں لگتا ہے وہ کردار تراشتے سمے اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس کجی، خامی پہ کہیں امید اور کہیں پچھتاوے کی صورت علاج و مرہم تھما دیتے ہیں جو اس کو بدی کی علامت بننے سے روکے رکھتا ہے!

جناب ظفر اقبال کے افسانے روایتی و معاشرتی موضوعات کے گرد بنے گئے ہیں جن کو ان کا اسلوب ایک روشنی و چاشنی عطا کرتا ہے۔محبت، روشنی امید، وجودی تنہائی، ہجر اور پردیس ظفر اقبال ہاشمی کے مرغوب منطقے ہیں۔

''ہم'' سے یہ سطور دیکھئے

''محبت پالینے سے پہلے/کبھی نہاں، کبھی فغاں ہے/محبت پالینے کے بعد/مسلسل امتحاں ہے''

''جگت'' اس مجموعے کا ایک اہم افسانہ ہے جو ایک جگت باز اور بھانڈ کے گرد بنا گیا ہے اور ایک بھانڈ کو محبت کی جانبداری سے وہ کرداری عظمت کی بلند مسند پر بٹھا دیتے ہیں اور اس مہارت، چابک دستی سے بٹھاتے ہیں کے آپ خود کو کردار کی محبت میں مبتلا ہونے سے روک نہیں پاتے۔ان کی تحریر میں بلا کی روانی ہے۔اس افسانے کی کچھ اور سطور:

''اصل مزاج تو ہوتا ہی وہ ہے جس کے نتیجے میں صرف ایک تنہائی ہنسی، مسکراہٹ یا قہقہے کی شکل باہر آتے ہیں اور باقی دو تنہائی آپ کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں خوشگوار احساس کے ساتھ مستقل ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔''

اور یہ سطر دیکھئے:

''میاں جی اگر میری جگت میں جگت ہے تو یہ جگ پہ چھوڑ دیں کہ میں نے اپنا رب کا لکھا ہوا سکرپٹ کیسا پرفارم کیا''

غیر روایتی اور جدید افسانے کی ایک عمدہ مثال یہ افسانہ ''جگت'' ہے۔

اسی مجموعے میں ان کا ناولٹ ''گل مہر اور یوکلپٹس'' بھی شامل ہے جو بظاہر ایک سادہ سی فلمی رومانوی کہانی ہے جس کا ہیرو Autism کا شکار ہے اور ہیروئن بھی نفسیاتی پیچیدگیوں سے دوچار ہے مگر ان کی ٹریٹمنٹ نے اسے بلا کی روانی، رومانوی چاشنی اور خوب صورتی بخشی ہے جب کہ خوب صورت فقرے جا بجا موتیوں کی طرح ٹنکے ملتے ہیں۔

''گھپ اندھیرے میں کالی بلی'' بھی ایک عمدہ افسانہ ہے اس میں بڑے دلکش پیرائے میں جدید افسانے پہ طنز کیا گیا ہے۔

''نور'' امید روشنی اور رجائیت سے لبریز ایک عمدہ افسانہ ہے اور قاری دل میں سوچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اس جیسے بہت سے ''محسن ضیا'' محتاج ہیں ضرورت مند ہیں کہ کوئی اور کہیں سے ''نور الٰہی'' آئے اور زندگی کی گاڑی کو پھر سے پٹڑی پہ چڑھا دے۔

''مجھ سے باتیں کرو'' ایک مختصر افسانہ ہے جو دیرپا اور دوررس اثر چھوڑتا ہے۔موت، خاموشی، وجودی تنہائی کو متشکل کر کے مصنف کمال مہارت سے اختصار میں بہت کچھ کہہ گیا ہے۔

''تم کیسے مرے تھے؟'' اور ''خاموشی سے'' اچھے افسانے ہیں۔

آخری افسانہ ''اسی کائنات میں کسی جگہ'' میں ہے ۔اس آخری افسانے میں انسان کی انسانیت پہ سوال ہی نہیں کائنات کا پھیلاؤ بھی زیر بحث ہے اور اس کی نئی بستیاں بھی یہاں بخوبی زیر بحث آگئیں ہیں اور اسی کائنات میں کسی جگہ میں وہ لوگ، وہ مخلوق جو اشراف نہیں مگر پھر بھی ہم سے بہتر ہیں کا ذکر ہے۔

محمود ظفر اقبال ہاشمی کا یہ مجموعہ افسانوی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

سبین علی افسانے کی دنیا کا ایک نسبتاً نیا نام ہے۔ہوا کا اک خوشگوار تازہ جھونکا جس نے آغاز ہی سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔کسی بھی لکھاری کی یہ بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی اپنے فن و ہنر کی جانب اہل قلم کو متوجہ کرلے اور سبین علی اس میں کامیاب رہی ہیں۔سبین علی کی ادبی شخصیت کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ وہ برقی جریدے ''دیدبان'' کی تین خواتین مدیروں میں سے ایک ہیں۔سبین شاعرہ بھی ہے اور ایک عمدہ مبصر بھی۔اس کی تنقیدی صلاحتیں حیران کن ہیں اور آنے والے وقتوں یہ اس کا کلیدی علاقہ ثابت ہوگا۔''گل مصلوب'' اس کا پہلا اور اولین افسانوی مجموعہ ہے اور افسانوی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

''گلوں سے حرف کروں'' میں اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے بہت بے ساختگی سے وہ اپنے فنی سفر کی بابت بتاتی ہیں اور اس کا پس منظر بھی بیان کرتی ہیں۔کتاب کا پیش لفظ مدیر فنون نیر حیات قاسمی نے رقم کیا ہے۔سبین علی اپنے ادبی کیریئر کی ابتدا سے ہی فنون سے وابستہ ہیں۔

''گل مصلوب'' ایک کامیاب افسانوی مجموعہ ہے کہ اس میں انہوں نے کئی ایسے افسانے پیش کیے ہیں جو کہ ناقد کی توجہ کھینچنے میں کامیاب رہے۔افسانوی باب میں یہ افسانے اہم شمار کئے جاسکتے ہیں۔

''گل مصلوب'' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ایک ایسی تحریر جس میں کلمہ و مہمل کے استعاروں سے وہ خوب کھیلیں ہیں بلکہ اس کے مختلف شیڈز ان کی تحریر میں نظر آتے ہیں۔ایک معذور لڑکے کے احساسات کو باریک بینی سے جانچا

ہے اس کے مسائل کو عمدگی سے بیان کیا ہے جو گہرے مشاہدے پر دلالت کرتا ہے۔

یہ جملہ دیکھئے'' تب مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ سماعت کو بصارت پہ فوقیت کیوں حاصل ہے''

''کتن والی'' اس مجموعے کا ایک اور اہم اور عمدہ افسانہ ہے جس میں فیصل آباد کے دستکاروں کا المیہ بیان کیا گیا ہے بلکہ پوری ایک ثقافت اس میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے اور اس کے ساتھ منشیات کا زہر جو اس دستکار طبقے کے تلخ آیام میں زہر گھول رہا ہے اس المیے کا یہاں بخوبی بیان ہوا ہے۔ سبین علی نے مشینی عہد میں گھریلو صنعت و دستکاری کے مسائل کو نہ صرف عمدگی سے سمیٹا ہے بلکہ منشیات کی دستیابی اور اس کے استعمال پر بھی ایک سوالیہ نشان کھڑا کیا ہے۔

اس طرح سبین کا افسانہ ''ان ٹیوشن'' خدائی تخلیق اور انسانی ذہنی تخلیق کے متوازن چلتی ایسی تحریر ہے جو معاشرتی رویوں پہ گہرا وار کرتی ہے اور سوال اٹھاتی ہے'' کیا تخلیق اتنی کم تر ہوتی ہے کہ کچرے میں پھینک دی جائے''

''گگڑی'' ایک روایتی کہانی ہے ایک بیوہ عورت کا المیہ پرسوز و پرتاثیر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''طلوع مہتاب'' کوہستانی علاقوں کے پس منظر میں اس سماج کے رسم و رواج میں جکڑی عورت کے وجود سے اٹھتی مذاحمت کا اعلامیہ ہے اور سبین اپنا پیغام پوری قوت سے بیان کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

''ایتھنے اور سموں'' ایک اور خوب صورت افسانہ ہے قدیم استعاروں کے ہنرمند استعمال کے ساتھ استعماری قوتوں کے استحصال کی کہانی ہے۔ یہاں جولا ہوں کے قدیم ہنر کو سموں کے کردار میں پیش کیا گیا ہے اور ایتھنے جو عقل و طاقت کی علامت ہے وہ ہر دور میں فن کا استحصال کرتی آئی ہے اس کا خوب صورت اظہار ہے۔

''ہلدی بیچاری کیا کرے'' افسانہ ہمارے ملک کے سیاسی نظام کے ساتھ ساتھ نسائیت کا مقدمہ بھی ہے جسے یہاں سبین نے احسن طریقے سے لڑا ہے۔

سبین علی اپنے پہلے ہی مجموعے سے ناقدین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔

اس مضمون کا چوتھا اور آخری افسانوی مجموعہ ''اک چپ اور سو دکھ'' ہے جس کے مصنف آدم شیر ہیں۔ یہ آدم شیر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اپنے پہلے افسانوی مجموعے کے آنے سے پہلے ہی وہ افسانوی دنیا میں اپنی ایک شناخت قائم کر چکے ہیں۔

معروف ناول نگار خالد فتح محمد کی رائے بیک فلیپ پر ہے جس کے مطابق'' آدم شیر نئی نسل کا اہم فکشن نگار ہے۔ اس کے ہاں تصوراتی، ماورائی اور جادوئی دنیا کی کہانیاں نہیں ہیں، وہ ان گٹروں، گلیوں اور محلوں کا جاروب کش ہے جہاں سیلن، بیماری، تعفن اور افلاس پلتے ہیں۔''

آدم شیر پروفیشن کے لحاظ سے صحافی ہیں اور ان کی کہانیوں کے بہت سے تانے بانے ان خبروں سے جنم لیتے ہیں جو معاشرتی المیوں کی صورت ظہور پزیر ہوتی ہیں اور یہ صحافی اور لکھاری ہمیں ان کے افسانوں میں جا کے ملتا ہے۔

پہلا افسانہ ''دبدبھا'' ایک خوب ناک دھندلے میں اور خود کلامی میں ڈوبا افسانہ ہے۔

''عالم تمثال'' ایک تجریدی علامتی افسانہ ہے جو زندگی کے مختلف دنوں کی عکاسی کرتا ہے۔

آدم شیر کی ''سوچیلی آنکھیں'' ہر وقت سوچوں کے دھندلکوں سے اَٹی رہتی ہیں اور معاشرتی ناہمواری، ناانصافی پہ سوچتی رہتی ہیں اور انہی سوچوں کے مرکز سے اس کی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ معاشرتی ناہمواریوں پہ وہ کہتا ہے

''تو اسی لیے تمہارے اندر نفرت کا کاڑھا ابلتا رہتا ہے؟''

''میری نفرت ہی میری محبت ہے'' یہی آدم شیر کے افسانوں کا فلسفہ ہے۔

آدم شیر کے ہاں باپ کی بپتا اتنی بیدار ہے یا ایک بیٹے کا باپ بننے کے بعد یہ حسیات آدم شیر میں دَر آئی ہیں کہ اس پہ ممتا کا گمان ہونے لگتا ہے اور اس کا دکھ اور اظہار جا بجا اس کے افسانوں میں ملتا ہے۔ وہ ''دبدبھا'' ہو جہاں یہ جہان اس کے بچے کے رہنے کے قابل نہیں یا پھر ''اک چپ سو سکھ'' جہاں اس معاشرے کے پھول کیڑوں کی طرح غلاظت میں رینگ رہے ہیں اور اپنی خاموشی پہ وہ خود کو بھی معاف نہیں کر پاتا۔ اسی طرح ''دس ضرب برابر دو'' میں بھی معاشرتی المیے کے ساتھ بچوں پر گالم گلوچ سے اٹی زبان کیسے اثرات چھوڑتی ہے ۔اسی المیے کی کتھا یہاں بیان ہوئی ہے۔

وہ کہتا ہے'' گالیاں دینا ایسے ہی ہے جیسے گٹر سے گندگی نکالنا جو پھنس جائے تو گلیاں بھر جاتی ہیں''

''شکم گزیدہ'' گو کہ روایتی سماجی المیہ ہے جو معاشرے کے ایک ستم رسیدہ نوجوان کی داستان ہے مگر تیکھے کاٹ دار انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ اثر جھوڑتا ہے۔

''بھکاری'' افغان جنگ کے پس منظر میں لکھا افسانہ ہے جہاں دو سپر پاورز برسر پیکار رہی ہیں اور جنگ نے ایک غیور قوم کو بھکاری بنا دیا ہے وہیں یہ موضوع ایک رپورٹر کے لئے محض ایک فیچر کا مصالحہ ہے۔

''صحرا اور ڈوبتا چاند'' تھر کے علاقے میں قحط، بھوک اور مقتدرہ قوتوں کی غفلت کا فسانہ ہے۔

''غرقاب'' سمندر پہ اک انشائیے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ یہاں افسانوی عنصر مفقود نظر آتا ہے۔

آدم شیر نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں کئی کامیاب افسانے پیش کئے ہیں اور آنے والے وقتوں میں ان سے اچھی امید باندھی جا سکتی ہے کہ وہ اردو ادب میں اہم افسانہ نگار ثابت ہوں گے۔

''ایک سپنے کا انت''

مشرف عالم ذوقی
(دہلی، بھارت)

کرشنا سوبتی چلی گیں۔ مجھے حیرت اس بات کی ہے کہ وہ اس ماحول میں زندہ کیسے تھیں۔۔۔؟ یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے۔ اگر آپ کرشنا سے ملے ہیں تو اس درد کی کیفیت کا سراغ مل سکتا ہے۔ اور نہیں ملے تو آپ اس درد کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ زندہ کیسے تھیں۔ جیسے لاکھوں کروڑوں زندہ رہتے ہیں، کرشنا سوبتی ان میں سے نہیں تھیں۔ اور کوئی دوسرا کرشنا سوبتی ہو بھی نہیں سکتا۔۔ وہ ایک چلتا پھرتا آتش دان تھیں۔ اس آتش دان کا ایک نام نظم بھی ہو سکتا ہے، ناول بھی۔ وہ نثر میں شاعری کرتی تھیں اور اپنے اردگرد چھوٹے چھوٹے فلسفیانہ جملوں سے ایک کائنات تخلیق کر لیتی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے بھی اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ آپ اپنے عہد کے اس عظیم مصور سے مل رہے ہیں، جس نے ایک ملاقات میں ہی آپ کو کسی سادہ سے کینواس میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور کینواس پر لہو کے رنگوں سے جو تصویر ابھری ہے، اس عظیم شاہکار میں حیات و ممات کے فلسفوں سے لے کر وہ زندگی بھی گردش کر رہی ہے، جسکو خوفناک موسم تسلیم کرتے ہوئے آپ نے قبول تو کر لیا ہے مگر کرشنا آخری سانس تک قبول نہ کر سکیں۔ اس آتش دان میں ۲۰۱۸ء میں انہوں نے ایک کویتا لکھی۔

ویدک ہے کرانتی
کرانتی بھارت میں
کرانتی نہیں ہے یہ
کوئی غلط فہمی ہے
یہ مہان دھرنا ہے
ویدک کرانتی
گایوں کو بچاؤ
اور شہریوں کو مار ڈالو
دیوی دیوتاؤں کی یہی ہے آگیہا
خبردار
اسکی کوئی نہ کرے نافرمانی
جتنے پاپی مارو گے
اتنا اگلے جنم میں پھل پاؤ گے
خوشحال زندگی کے لئے یہ ثواب ہے
جنم جنمانتر کے لئے
جو ویدک نظریات کے لئے کریگا یہ کرانتی
اسے خوشحالی ملے گی
اگلے جنموں میں شانتی ہی شانتی
اس ویدک یگیہ میں ساتھ دو
ہندوتو کی کرانتی
ویدک ہے کرانتی
کوئی خوش فہمی نہیں ہے
اوم شانتی۔۔ اوم شانتی
اتنے اچھے دن
اس دیش میں پھر کب آئیں گے؟

(۱۸ فروری ۲۰۱۸ء)

انکا ایک ناولٹ تھا ''اے لڑکی'' یہ لڑکی اس وقت میری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ مختصر ہوتے ہوئے بھی ایک طویل داستان ہے موت کا انتظار کرتی ہوئی ایک بوڑھی عورت۔ وہ زندگی کے آر پار دیکھ رہی ہے۔ کوئی ورق سادہ نہیں۔ ہزاروں کہانیاں یادوں کی فصیل پر پھیل جاتی ہیں۔ اس کہانی میں بوڑھی عورت کی پوری زندگی ہے۔ موت کی ساعت جیسے جیسے قریب آ رہی ہے، وہ موت کے جشن کی تیاری کر رہی ہے۔ موت ایک بے خوف دعوت ہے کہ وہ اور لڑکی اس سے ملنے کے لئے تیار ہو۔ موہ مایا، یادیں، زندگی کے بکھرے اوراق، حوادث کے تجربوں کو کنارے کرتے ہوئے وہ ملنا نہیں چاہتی، وہ اپنی تکمیل کے صفحوں پر دستخط کرتے ہوئے ملنے کی متلاشی ہے۔ اور وہ تب ملنا چاہتی ہیں، جب بھیانک وقت اپنے سیاہ پنجوں کے ساتھ ہلاکت کی داستان قلمبند کر رہا ہوتا ہے۔ وہ ناولٹ ایک مکمل نظم ہے، موت سے زندگی تک کے سفر کو جیسے کرشنا نے جیا، وہ انکا ہی اسلوب اور انکا ہی تجربہ ہے۔ کرشنا کو یاد کرتے ہوئے مجھے بار بار وہ لڑکی یاد آ رہی ہے۔ وہ کرشنا نہیں تو کون تھی۔؟

2010 میں کرشنا سوبتی کو حکمت ہند نے سب سے بڑا اعزاز پدم بھوشن دینے کے لئے اعلان کیا تو کرشنا سوبتی نے اس اعزاز کو بہت احترام کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انکے پاس انکار کرنے کا بہتر جواز تھا۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا۔ ''میں ایک بہت سادہ اور معمولی سی فنکار ہوں۔ اور میں یقین رکھتی ہوں کہ دانشوروں کے پاس جو سوچنے کی طاقت ہے، اگر وہ اپنے ملک کے لوگوں کو اور حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں، تو وہ اسے صحیح طریقے سے پڑھ بھی سکتے ہیں، انکا فرض ہے کہ وہ حکومتی اعزاز اور ایسٹیبلشمنٹ سے دور رہیں۔

2002ء میں گجرات سے بھیانک آگ کی لپٹیں اٹھیں اور ساری دنیا میں پھیل گیں۔ گجرات پر میرے خیال سے سب سے زیادہ ہندی زبان میں لکھا گیا۔ اس درد کو جس انداز سے ہندی ادیبوں/ شاعروں نے محسوس کیا، اسکا اظہار بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ درد زندہ ہو گیا تھا۔ تقسیم وطن کی کہانیاں

باقی صفحہ ۱۱۲ پر ملاحظہ کیجیے

''وقت کی گردش''

"Pity the nation "

خلیل جبران

(۶۔جنوری۱۹۸۸۳ءتا۱۰۔۱۔۱۹۳۱)

لبنان

(ترجمہ: فیض احمد فیض)

قابلِ رحم ہے وہ قوم
جس کے پاس عقیدے تو بہت ہیں
مگر دل یقیں سے خالی ہیں

قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو ایسے کپڑے پہنتی ہے
جس کے لیے کپاس
اُن کے اپنے کھیتوں نے پیدا نہیں کی

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو باتیں بنانے والے کو
اپنا سب کچھ سمجھ لیتی ہے
اور چمکتی ہوئی تلوار سے بنے ٹھنے فاتح کو
اپنا ان داتا سمجھ لیتی ہے

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو بظاہر خواب کی حالت میں بھی
ہوس اور لالچ سے نفرت کرتی ہے
مگر عالم بیداری میں
مفاد پرستی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے

قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو جنازوں کے جلوس کے سوا
کہیں اور اپنی آواز بلند نہیں کرتی
اور ماضی کی یادوں کے سوا
اس کے پاس فخر کرنے کا کوئی سامان نہیں ہوتا

وہ اس وقت تک صورتِ حال کے خلاف احتجاج نہیں کرتی
جب تک اس کی گردن
عین تلوار کے نیچے نہیں آجاتی

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جس کے نام نہاد سیاستدان
لومڑیوں کی طرح مکّار اور دھوکے باز ہوں
اور جس کے دانشور
محض شعبدہ باز اور مداری ہوں

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو اپنے نئے حکمران کو
ڈھول بجا کر خوش آمدید کہتی ہے
اور جب وہ اقتدار سے محروم ہوں
تو ان پر آوازیں کسنے لگتی ہے

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جس کے اہلِ علم و دانش
وقت کی گردش میں
گونگے بہرے ہو کر رہ گئے ہوں

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو ٹکڑوں میں بٹ چکی ہو اور جس کا ہر طبقہ
اپنے آپ کو پوری قوم سمجھتا ہو

○

ذات کا سچ

پروین شیر
(امریکہ)

سما کی چادر میں سمٹی سمٹی
زمیں کے بستر پہ بے سکوں کروٹیں بدلتی
یہ کھوئی کھوئی نظر جنوں میں
بھٹکتی پھرتی
تلاش میں غرق ایک شئے کی
جو آئے آ کر
صداقت ذات کر دے روشن
وہ شئے کہاں تھی؟
چہار سو ڈھونڈتیں تھیں آنکھیں
فلک کے نیلے سمندروں میں
زمین کی سبز دھڑکنوں میں
کہیں نہیں تھی
کہ وہ تو اُس کے ہی
دل کے کمرے کے ایک گوشے میں
گھُپ اندھیرے میں سو رہی تھی
وہ شئے جو انمول درد جاں ہے!
یہ اپنی پلکیں جو کھولتا ہے
تو قطرۂ نور دل میں آ کر
متاع عرفاں سے ذہن و دل کو
نوازتا ہے.....!

○

کاش

شاخ سے ٹوٹا ہوا اک زرد رو بیمار پتہ
تیز آوارہ ہوا کی باہیں تھامے
اُڑتا اُڑتا
ڈوبتی نبضوں کے سرگم میں پھنسی
ان خشک شریانوں کو جھک کر دیکھتا ہے
جو کبھی سیراب تھیں جان بخش خوں سے!
اور پھر یہ لامحالہ سوچتا ہے
کاش یہ میری رگیں
شاداب ہو پاتیں تمہارے خون کی شبنم سے
زندگی سرشار ہو سکتی مری
اک بار پھر میں ناچ سکتا
شاخ پر بادصبا کے ساتھ اپنا تال دے کر
جھوم کر میں رقص کرتا
کاش میں اک بار پھر جی کر بہاریں لوٹ سکتا !
ہاں مگر نٹ کھٹ ہوا یہ جانتی ہے
ان سبھی ٹوٹے ہوئے بیمار پتوں کی فقط
خار و خس و خشاک کا اک ڈھیر ہے منزل ہے باقی!

○

ستر ماؤں کا پیار

علی محمد فرشی
(راولپنڈی)

کتابوں کا زینہ بنا کر
مچانی سے میں نے مٹھائی چرائی تو
گھر میں کسی کو بھی غصہ نہ آیا
یہ کمسِن ذہانت کی تاثیر تھی
یا شرارت کی شیریں شکر ریز عمروں کی لذت
ابھی تک وہ خوش ذائقہ واقعہ
جبرِ گجاں میں گھلتا ہے
بچپن کے باغات کی تتلیاں
پھول بن کر برستی ہیں
پتھریلی عمروں کے دن رات کی
زرد، کالی مصیبت کا غم بھول کر
مسکراہٹ کی میٹھی پھواریں
بیاباں کو جل تھل بناتی ہیں، گاتی ہیں:

(ایک، دو، تین
اللہ میاں کی زمین
چار، پانچ، چھ، سات
سارے ملکر کھائیں بھات
آٹھ، نو، دس
پانی میٹھا رس)

پانی کی لہروں پہ ہچکولے کھاتی ہوئی
کاغذی عمر کی ناؤ
کروٹ بدل کر اُلٹ دیتی ہے خواب سارے

کتابوں پہ گرتے ہوئے آنسوؤں سے
سیاہی کے دریا بہتے ہیں!
دریا سمندر بناتے ہیں
سارے سمندر سیاہی، قلم بن گئیں ساری شاخیں
قسم! انگلیوں کی
(محبت بھرا خط مرے اور ترے درمیاں تیر ہے)
میں لکھوں اور لکھتا رہوں تا قیامت
محبت کی نظمیں
مگر جانیاں!
ان کتابوں کو زینہ بنا کر
کئی بار میں نے
ترے آسمانوں پہ جا کر
تجھے ڈھونڈ لانے کی ناکام کوشش میں
آنسو بہائے
سیاہی کے دریا بنائے

کہاں ہے؟
تو خود اپنی شیریں صدا سے
مری تیرہ بختی میں
شُبھ رات کی مصریاں گھولدے

ماں تو ناراض ہے
اب کئی روز سے بولتی بھی نہیں

○

سمجھوتہ

جہانگیر اشرف
(بریڈفورڈ)

میں لاکھ دعوئے کروں
ترکِ محبت کے
ضبطِ شوقِ الفت کے
تیری یادوں کو مٹانے کے
تجھ کو بھُول جانے کے

مگر میرے ہمدم
اگر ان دعوؤں میں صداقت ہے
اور یہی ترکِ محبت ہے
تو پھر تیرا نام سن کر
کیوں دل دھڑکتا ہے
تیرے قدموں کی آہٹ پر
یہ دل کیوں مچلتا ہے
تیرے لوٹ جانے پر
دل کیوں سلگتا ہے

میرے ہمدم
اکثر شب تنہائی میں
تیری یادوں کے جگنوؤں
میرے دلِ مضطرب میں ٹمٹماتے ہیں
کبھی مجھکو رُولاتے ہیں
کبھی مجھکو ہنساتے ہیں
اور میری بے چین آنکھوں کو
رتجگے جگاتے ہیں

میرے ہمدم
میں لاکھ دعوئے کروں
ترکِ محبت کے
ضبطِ شوقِ الفت کے
تیری یادوں کو مٹانے کے
تجھکو بھُول جانے کے
مگر ان دعوؤں میں صداقت نہیں ہے
یہ ترکِ محبت ہے
یہ فقط سمجھوتہ ہے
اپنے آپ سے دھوکا ہے

○

کبھی سوچا نہ تھا

وقت ہم پر ایسا آئے ، یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہونگے اپنے بھی پرائے ، یہ کبھی سوچا نہ تھا
بے مروت، بے لحاظ، اپنے پرائے سب ہوئے
غیر ہونگے اپنے سائے، یہ کبھی سوچا نہ تھا

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

آشفتہ سری

سب میں شامل بھی رہو، اور سب سے جُدا نظر آؤ
رہو میلے میں، مگر تنہا نظر آؤ
تنہائی بھی ایسی کہ تنہائی پتہ پوچھتی پھرے
اور آشفتہ سری ایسی کہ ہر جا نظر آؤ

محمد اقبال بھٹی
(بریڈفورڈ)

ایمالائی ڈوسس

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

۱۹۶۵ء میں میں نے میڈیکل کا سال دوئم پاس کر کے تیسرے سال میں قدم رکھا۔ یہ بڑی ہی امنگوں کا سال تھا اور ہر اس طالب علم کو جو بچپن سے ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھتا رہا تھا، اس سال کا بڑا انتظار تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹری کے پہلے دو سال صرف کلاسوں میں لیکچر ہوتے تھے یا پھر مردے چیرنے کی پریکٹس ہوتی تھی۔ ہسپتال کے واڑدوں میں جانے یا مریضوں کو دیکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ تیسرے سال سے کلینکل پڑھائی شروع ہوتی تھی اور ہمیں گلے میں اسٹیتھس کوپ ڈال کر وارڈوں میں مریض الاٹ ہو جاتے تھے۔ اسی سال ہمارے کورس میں شامل علم طبیات کی ایک بہت موٹی کتاب بھی پڑھنی ہوتی تھی۔ جسے پیتھالوجی کہتے تھے۔

اس کتاب میں پہلی دفعہ ''ایمالائی ڈوسس'' کا چیپٹر بھی پڑھنا پڑھا تھا۔ تو مجھے اس مرض کے بارے میں لکھتے ہوئے وہی گیت اور وہی زمانہ یاد آنے لگا ہے کہ آج پرانی راہوں سے کوئی مجھے آواز نہ دے۔۔ (کیونکہ یہ کوئی چھپن سال پرانی بات ہوئی) مگر گزشتہ دنوں پاکستانی ابلاغ میں ہمارے سابقہ صدر پرویز مشرف صاحب کی ''پراسرار بیماری'' کے بارے میں بہت چرچہ رہا تو جناب گلزار صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں قارئین کی آگاہی کے لئے اس بیماری کے بارے میں کچھ حقائق حوالۂ قلم کروں۔

کچھ دہائیوں پہلے جب مغربی ممالک میں تقریباً تمام مرنے والوں کی آٹوپسی ہوتی تھی تو کچھ ایسے مریضوں کے اندرونی اعضاء جیسے جگر، گردوں اور دل میں سرخ رنگ کا ایک مادہ دیکھا گیا۔ اس کو ایمی لائڈ کا نام دیا گیا اور اس بیماری کو ایمالائیڈوسس کہا گیا۔ شروع میں یہ ان مریضوں کے جسم میں دیکھا گیا تھا جنہیں کوئی قدیم اور دائمی بیماری تھی جیسے تپ دق یا جسم کے کسی حصے میں پڑنے والی پیپ۔ ایسی ایمی لائیڈ کی بیماری کو ثانوی ایما لائیڈوسس کہا گیا یعنی یہ کسی دوسری دائمی بیماری کی وجہ سے ہوتی تھی مگر پھر جب ان بیماریوں کا قلعہ قمہ کر دیا گیا تو یہ دیکھنے میں آیا کہ ایسے بظاہر صحت مند لوگوں میں بھی یہ مادہ دیکھا گیا جو جگر اور جسم کے بہت سے دوسرے حصوں میں پیوست ہو کر انہیں ناکارہ بناتا ہے اور اسکی بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ علوم طب میں ایسی بہت سی بیماریوں کو جنکی کوئی وجہ نہیں نظر آتی انہیں اولیں یا PRIMARY بیماری کہا جاتا ہے، اسکی ایک عام مثال بلڈ پریشر ہے جسکی عام حالات میں کوئی وجہ نہیں ہوتی اس لئے اسے PRIMARY HYPERTENSION کہا جاتا ہے۔ میرا قیافہ ہے کہ مشرف صاحب کو بھی primary amyloidosi ہے۔

ایمی لائیڈ کیا ہے

جب عام قسم کی خوردبین (مائیکروا سکوپ) سے اس مادے کو دیکھا گیا تھا تو یہ ایک سرخ رنگ کا ایسا مادہ نظر آیا تھا جو کچھ موم سے مشابہت رکھتا تھا اور اس میں دھندلے شیشے جیسے آر پار دیکھنے کی صلاحیت تھی۔ یہ متاثرہ اعضاء کے خلیات کے درمیانی جگہوں میں پیوست تھا۔ لیکن جب کچھ سال بعد الیکٹرون مائکروسکوپ ایجاد ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ ایک قسم کی پروٹین ہے۔ مگر یہ پروٹین نا تو نارمل ہے نہ ہی نارمل کام انجام دے سکتی ہے۔ پروٹین کو اردو میں لحمیات کہتے ہیں اور ہمارے عضلات (MUSCLES) اسی پروٹین سے بنے ہوتے ہیں یوں کہئے کہ گوشت دراصل پروٹین ہے۔ مگر پروٹین کئی اشکال میں پائی جاتی ہے۔ خون میں تیرتی ہوئی پروٹین یعنی ال بومن، گلوبی من اور کئی قسم کے ہارمون بھی پروٹین ہی کے ہوتے ہیں مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارا جسم اپنی مدافعت کے لئے جو انٹی باڈیز بناتا ہے وہ بھی پروٹین ہی ہوتی ہیں۔ مگر یہ پروٹین جو ایمائی لوڈوسس میں پیدا ہوتی ہے کسی کام یا جسم کو کسی فائدہ پہچانے کے قابل نہیں ہوتی ہیں بلکہ اعضا میں گھسنے کی وجہ سے ان اعضا کو نقصان پہنچاتی ہیں اور آخر کار انہیں ناکارہ کر دیتی ہے۔ اسکے علاوہ الیکٹران مائیکروا سکوپ سے یہ بھی ظاہر ہوا کے اس پروٹین میں کچھ ریشے ہوتے ہیں اور کچھ گول گول ڈونٹ جیسے اجسام بھی پائے جاتے ہیں جنکی افادیت ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی ہے۔

کون سے اعضاء متاثر ہوتے ہیں

اس بیماری میں اگر چہ پورا جسم ہی متاثر ہو سکتا ہے مگر جگر، گردے، تلی اور زبان زیادہ تر متاثر ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ قلب کا پٹھا بھی متاثر ہو سکتا ہے جس سے دل کے سکڑنے اور خون پمپ کرنے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی جلد بھی متاثر ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پروٹین کہاں اور کیوں پیدا ہوتی ہے۔ خون ہڈیوں کے گودے میں تیار ہوتا ہے اس میں مختلف خلیات ہوتے ہیں جو مختلف عناصر تیار کرتے ہیں انہیں میں ایک خلیہ ایسا ہے جسے ہم پلازمہ سیل کہتے ہیں۔ یہی سیل اپنے نارمل کام سے بہک کر اس پروٹین کو جو نارمل نہیں ہوتی تیار کرنے لگتا ہے۔ یہ خلیہ جسم کو ایک قسم کے کینسر کا بھی سبب ہوتا ہے اسی لئے ایک عرصے تک اس بیماری کو کینسر ہی سے تعبیر کیا گیا مگر اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ایمی لائی ڈوسس کینسر نہیں ہے۔

مرض کی علامات

اس کی علامات بہت مختلف ہیں اور اس پر منحصر ہیں کہ جسم کا کونسا عضو متاثر ہوا ہے۔ اگر گردے اسکا شکار ہیں تو پیشاب میں نارمل پروٹین کا اخراج اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کہ خون میں کارآمد پروٹین کی شدید کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ اچھی اور کارآمد پروٹین کا پیشاب کے ذریعے زیاں ہوتا ہے جس کی وجہ سے جسم پر سوجن چڑھ جاتی ہے۔ یہ کیفیت گردے کی دوسری بیماریوں جیسے ذیابطیس سے

اس قدر ملتی جلتی ہے کہ سوائے گردے کی بایوپسی کے کسی دوسری طرح اس کی تشخیص نہیں ہوسکتی۔

جب دل اس سے متاثر ہوتا ہے تو دھڑکن کی بے قاعدگی، سانس پھولنا اور کمزوری ہوتی ہے۔ جگر کی علامات میں بار بار دل مالش کرنا، قے اور الٹیاں اور بدہضمی کی شکایت ہوتی ہے۔ زبان کے متاثر ہونے سے زبان پھول اور بڑھ جاتی ہے۔ کچھ مریضوں کے چہرے پر گالوں اور آنکھوں کے اطراف گلابی یا نیلے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس بیماری کی علامات اسقدر عام اور دوسری بیماریوں سے ملتی جلتی ہیں کہ مریض ایک عرصے تک اس میں مبتلا رہنے کے باوجود طبیب اس کی صحیح تشخیص نہیں کرسکتے کیونکہ حتمی تشخیص کسی عضو کی بایوپسی ہی سے ہوسکتی ہے۔

جب خوردبین سے دیکھنے پر سرخ مادہ نظر آتا ہے۔ کچھ ایسے مریضوں کو جنکا نظام اعصاب اس بیماری سے متاثر ہوتا ہے ہاتھ پیروں میں مستقل جھنجناہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اگر مرض آگے بڑھ جائے تو اچانک کھڑے ہونے سے انکا بلڈ پریشر اس تیزی سے نیچے گرتا ہے کہ ان پر غشی طاری ہونے لگتی ہے۔

مریض کا مستقبل

یہ بیماری خوش قسمتی سے بہت عام نہیں ہے۔ امریکا میں ایک سال میں چار ہزار افراد میں اس کی تشخیص کی جاتی ہے۔ اس میں مبتلا افراد زیادہ تر پکی عمر کے ہیں یعنی ساٹھ سال سے تجاوز کر چکے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اسکا کوئی علاج نہیں ہے مگر اس سے ہونے والی علامات کو مختلف طریقوں سے بہتر کیا جاسکتا ہے اور مریض عام طور پر کئی سال زندہ رہ سکتا ہے اور اسکی زندگی بھی اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ بڑی حد تک اپنا کام کرسکتا ہے۔ تحقیق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تشخیص کے بعد اوسطاً پندرہ سال تک زندہ رہا جاسکتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا عضو جو زندگی کے لئے اہم ہے متاثر ہو تو اوسط عمر سات سال تک ہوتی ہے۔

علاج

جیسا اپر لکھا جاچکا ہے اسکا کوئی حتمی علاج نہیں ہے لیکن چونکہ یہ ایک قسم کے ہڈیوں کے گودے کے سرطان سے بہت ملتی جلتی ہے جسے multiple myeloma کہتے ہیں اس لئے وہی کیموتھیراپی جو ملٹی پل مایولوما میں استعمال ہوتی ہے اسی کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر مرض نسبتاً کم عمر فرد میں ہو تو ہڈی کے گودے کی تبدیلی یعنی Bone marrow transplant کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

☆

- بقیہ -

''ایک سپنے کا اَنت''

بوسیدہ اوراق سے باہر آگئی تھیں۔ اس درد کو کرشنا سوبتی نے بھی محسوس کیا۔ گجرات پاکستان سے گجرات ہندوستان، ایک ایسی تخلیق ہے، جہاں کرشنا سوبتی کے زخموں اور درد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ گھر تقسیم کئے جانے پر اٹھنے والی دیواروں سے کس قدر اپنی آواز بیگانی ہوکر لوٹتی ہے۔ کس طرح پرائے ہوگئے اپنے ہی صحن کے حصے میں، وجود کا ایک حصہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اور کس طرح کوئی اپنا پرایا ہوجاتا ہے۔ کرشنا نے ٹوٹے خواب سجائے۔ درد کی موسیقی کو آواز دی۔ اور " گجرات پاکستان سے، گجرات ہندوستان میں سب کچھ لکھ دیا۔ جسے لکھنا آسان نہ تھا۔

اس ناول کو شنا سوبتی کی سوانح عمری بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ کرشنا نے یہاں اپنی ذاتی زندگی سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ تقسیم کے دوران اپنی جائے پیدائش گجرات اور لاہور کو چھوڑتے ہوئے کرشنا سوبتی کہتی ہیں، 'یاد رکھنا، ہم یہاں رہ گئے ہیں۔' یہ یاد رکھنا ہی درد کی سوغات کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ ایک گجرات وہ پاکستان میں چھوڑ آئی ہیں۔ ایک گجرات آگ کی لپٹوں کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہے۔ کرشنا جب دہلی پہنچتی ہیں تو ہندوستان کا گجرات انہیں آواز دیتا ہے اور وہ پاکستان کے گجرات کو اپنے یادوں کے سرمایہ میں بھر لیتی ہیں۔ ناول کے ابتدائی حصے میں کرشنا سوبتی لکھتی ہیں، 'پلٹ کر ایک بار پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے، ایک بار پھر اپنے کمرے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں کہا، 'بہتی ہواؤ، یاد رکھنا ہم یہاں پر رہ چکے ہیں۔

ہندوستان زندہ باد پاکستان پائندہ باد

کرشنا سوبتی اٹھارہ فروری انیس سو پچیس کو پیدا ہوئیں۔ ساہتیہ اکادمی اور گیان پیٹھ جیسے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ زندگی نامہ، دل و دانش، اندھیرے کے سورج مکھی انکے مشہور ناول ہیں۔ ہم حشمت، یادوں اور خاکوں کا حسین سنگم ہے۔ اس کے تینوں حصّے لاجواب ہیں۔ ڈار سے بچھڑے، مترو مرجانی، یاروں کے یار انکی طویل کہانیاں ہیں۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ آخری سانس تک وہ ادب کے لئے وقف تھیں۔ چورانوے برس کی عمر میں انہوں نے دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ انکے خوابوں کا گجرات قتل ہوچکا تھا۔ یہ گجرات مختلف علاقوں اور قصبوں میں پیدا ہورہا تھا۔ یہ گجرات اب عالمی نقشے پر بھی آباد تھا۔ اس لہولہان گجرات کو دیکھنے کے لئے وہ زندہ کیسے رہتیں۔ صحافی اور ادیب کو اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ہونا چاہئے۔ انکا پیغام انکی موت کے بعد ہمیں کوئی راستہ دکھائے گا، اسکی امید کم لگتی ہے۔

مِزاح کا ڈاکٹر عبدالقدیر خان

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی
(کراچی)

ہمارے دوست عبدالحفیظ صاحب یوں تو مومن بھی ہیں اور میمن بھی لیکن ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اردو کے خادمِ اعلیٰ ہیں۔ کل حفیظ بھائی نے ہمیں حکم دیا کہ ایک خاکہ لکھنا ہے۔ ہم نے ان سے عرض کیا ''بھائی جو خود خاکی ہو وہ بھلا کسی دوسرے کا خاکہ کیا لکھے گا؟'' تاہم انھوں نے وضاحت کی کہ جس کا خاکہ لکھنا ہے وہ بھی خاکی ہے۔ ہم سمجھے یہ کسی خاکی وردی والے کی بات کررہے ہیں۔ ہم ان سے کہنے والے تھے کہ اس کام کے لیے ہم قطعاً Unworthy ہیں لیکن انھوں نے یقین دلایا کہ اُس کا تعلق آپ ہی کی برادری سے ہے۔ پھر جب اُس ہستی کا نام سامنے آیا تو ہم نے اِس ''اقربا پروری'' کو ایک سعادت سمجھ کر قبول کرلیا۔ چنانچہ یہ خاکہ حاضر ہے۔

صاحبو، مزاح لکھنا کوئی مذاق نہیں۔ ایک سنجیدہ گو شاعر نے کہا تھا

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

اندازہ لگائیے کہ جب ''مصرعِ تر'' اتنی مشکل سے جنم لیتا ہے تو ''مصرعِ شر'' کس طرح برآمد ہوتا ہوگا؟ اور جو اپنی پوری زندگی اسی ''افزائشِ نسل'' میں گزار دے اس کے ڈیل ڈول کا اتنا ہی حصہ بچ رہتا ہے جتنا اب پروفیسر عنایت علی خاں کا بچا ہے یا پروفیسر انور مسعود کا رہ گیا ہے۔ عطاالحق قاسمی کو Exception سمجھئے۔

حاضرینِ کرام! جو کام کسی زمانے میں مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی نثر کیا کرتی تھی وہی کام دورِ حاضر میں انور مسعود صاحب کی شاعری کررہی ہے۔ وہ تڑپا کر رُلاتے تھے، یہ پھڑکا کر رُلاتے ہیں۔ وہاں آہ تھی، یہاں واہ ہے۔ ہم نے اکثر مشاعروں میں انور مسعود صاحب کے سامعین کو ہنستے ہنستے روتے دیکھا ہے خاص طور پر اس وقت جب یہ ''ٹینیوں'' کی کلیرنس سیل لگاتے ہیں اور اُس سے بھی بڑھ کر جب یہ ہانڈی میں ڈالنے کے لیے سبزی کا انتخاب کرتے ہیں۔ جو فیصلہ خاتون ایک خانہ اپنا ڈیپ فریزر کھول کر دو سیکنڈ میں کر لیتی ہے پروفیسر انور مسعود صاحب اُسے پاک بھارت مذاکرات کی طرح طول دیتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایک سبزی کے محاسن و مفاسد اتنی باریک بینی سے ذہن نشین کراتے ہیں کہ محفل میں بیٹھے ہوئے سخن فہم اِن کی ''کچن فہمی'' کے قائل ہوجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے تو گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ان سے پیشے کے انتخاب میں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟ یہی ایک عظیم فنکار کا کمال ہے۔

ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ مزاح کے بعض شعرا کو سُن کر اور پڑھ کر راشد الخیری والے آنسو ہی نکلتے ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے مزاح اور مخول کے فرق کو مٹا دیا ہے اور مخول بھی ایسا کہ ماحول کو مکدّر کردے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاعری کا عام معیار زوال پذیر ہے۔ ایک سینیر شاعر ایک روز اپنی غزل لکھ کر فارغ ہوئے اور پانی پینے کے لیے اپنی اسٹڈی سے باہر نکلے۔ واپس لوٹے تو غزل غائب تھی جو بہت تلاش کے باوجود نہ ملی۔ اُنھوں نے اپنے چار سالہ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی سے شکوہ کیا ''تم اس کا خیال نہیں رکھتیں۔ یقیناً اس کمبخت نے میری غزل چولھے میں ڈال دی ہے۔'' ان کی بیوی نے کہا ''خدا کا خوف کریں، اتنا سا بچہ آپ کی غزل پڑھ سکتا ہے؟''

انور مسعود صاحب جیسے گنے چنے باشعور، تعلیم یافتہ اور صاحبِ بصیرت اہلِ سخن نے نہ صرف شاعری کا معیار بلند کیا ہے بلکہ شاعروں کی توقیر میں بھی اضافہ کیا ہے ورنہ اس سلسلے میں صورتِ حال کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ ان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ صنف کی قید سے آزاد ہیں۔ ہماری مراد ان کی اپنی صنف سے نہیں بلکہ صنفِ ادب سے ہے۔ یہ نظم اور نثر دونوں میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے ہیں لیکن بحرِ ظلمات سے دور رہتے ہیں۔ انہیں بیک وقت کئی زبانوں پر عبور ہے یعنی اردو، پنجابی، فارسی اور انگریزی۔ شاعری ہو یا عام گفتگو، یہ ایک زبان کو دوسری میں، دوسری کو تیسری میں اور تیسری کو چوتھی میں اتنی صفائی سے داخل کردیتے ہیں جیسے کوئی ٹرین شنٹنگ کرتی ہے۔ ایک مثال حاضر ہے۔ کہتے ہیں:

سُن کر بات معالج کی ، کیوں نہ میں اس پہ کر دوں رِٹ
کھجلی پر یہ رائے دی، ''You will have to live with it''

اس طرح کہنا چاہیے کہ انہیں پانچ زبانوں پر دسترس ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان ہوگئی اور اُردو قومی۔ فارسی میں یہ تدریس کرتے ہیں۔ پنجابی مادری زبان ہے اور پانچویں جو اِن سب کی ''معجونِ مغلّظ'' ہوتی ہے ان کی اپنی زبان ہے۔ انہیں بولتے اور شعر پڑھتے سن کر ماننا پڑتا ہے کہ انسان واقعی حیوانِ ناطق ہے۔ انور مسعود صاحب کا کلام اس لیے زیادہ پسند کیا جاتا ہے کہ اس میں مزاح کے ساتھ ساتھ Message بھی ہے۔ دورِ حاضر کے مصائب و مسائل پر ان کی گہری نظر ہے اور عوامی رجحانات و میلانات کا یہ مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ ہم اپنے اس خاکے کو پروفیسر صاحب کے بہت زیادہ اشعار سے بوجھل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہم نقاد نہیں، چھوٹے سے نثّار ہیں لیکن Message والی بات نوکِ قلم پر آہی گئی ہے تو ایک قطعہ پیشِ خدمت ہے فرماتے ہیں:

اُجڑا سا وہ نگر کہ ہڑپّہ ہے جس کا نام
اس قریۂ شکستہ و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہوسکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

انور مسعود کی ایک خوبی ان کی طرزادا ہے۔ آپ ان کا کلام پوری محویت کے ساتھ انہیں دیکھتے ہوئے سنیں تو قائل ہوجائیں گے کہ شاعری ایک

Performing Art بھی ہے۔یوسفی صاحب نے کہیں لکھا تھا کہ گانے والی کی صورت اچھی ہوتو مہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔انور مسعود صاحب کا شعر بامعنی اور بامقصد ہوتا ہے۔ماشاءاللہ صورت بھی ایسی ہے کہ ع آثار یہ کہہ رہے ہیں، عمارت عظیم تھی۔لیکن جب ان کے شعر میں ان کی آنکھوں کی چمک شامل ہوجاتی ہے تو وہ دودھاری تلوار بن جاتا ہے۔اکثر ایسا ہوا کہ ہم نے اسٹیج پر اِن کے پیچھے بیٹھ کر اِن کا کلام سُنا اور پنجابی کا کوئی مشکل لفظ پلّے نہیں پڑا لیکن وہی شعر کسی دوسری نشست میں اِن کی آنکھوں کی زبانی سُنا تو لفظ خود پکار اٹھا ''ھُنٹر دسو، باؤ جی!''

انور مسعود صاحب مشاعروں میں اپنا پُرانا کلام تو سُناتے ہی ہیں، نہ سنائیں تو سامعین انہیں اسٹیج سے نہ اترنے دیں، لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ ہر بار کچھ نہ کچھ نیا مال بھی لاتے ہیں کیونکہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''مزاح کی نموتازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن نہیں۔'' بدقسمتی سے بیشتر شعرا نے برسوں سے کچھ نہیں لکھا اور وہ اپنی Antiques کی رائلٹی کھا رہے ہیں۔ہر مشاعرے میں بلاتکلف اپنا ٹیپ Rewind کر دیتے ہیں۔یہ روایت بہت قدیم ہے چنانچہ علی گڑھ کالج کے ایک مشاعرے میں جب اسّی سالہ رعشہ زدہ نوح ناروی نے اپنی پچاس سال پُرانی غزل کا مطلع پڑھا

نکلنے کو تو حسرت وصل کی اے نازنیں نکلی
مگر جیسی نکلنا چاہیے ویسی نہیں نکلی

تو آگے بیٹھے ہوئے ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا ''حضور، بخدا اس میں نازنین کا کوئی قصور نہ تھا۔'' یہ سُن کر ظریف جبلپوری تیزی سے مائک پر آئے اور یہ شعر پڑھا

سحر تک ان سے جھگڑا ہی رہا حسرت نکلنے کا
وہ کہتے تھے کہ ہاں نکلی؟ میں کہتا تھا نہیں نکلی

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج انور مسعود مزاحیہ شاعری کی آبرو ہیں۔انہیں ''مزاح کا ڈاکٹر عبدالقدیر خان'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا لیکن ان کے بعض اشعار دماغ سے زیادہ دل پر اثر کرتے ہیں۔اس بات کی وضاحت میں یوں کروں گا کہ لندن میں ایک شخص ایک ماہرِ نفسیات کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں ہر وقت اداس رہتا ہوں۔کسی کام میں دل نہیں لگتا، دنیا کی کسی رونق، کسی رنگینی میں لطف نہیں آتا۔ڈاکٹر نے اُسے مشورہ دیا کہ شہر کے ایک تھیٹر میں ایک ڈراما چل رہا ہے۔اُس میں ایک کامیڈین تماش بینوں کو اتنا ہنساتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے تمام غم بھول جاتے ہیں۔تم کبھی کبھار وہ ڈراما دیکھنے جایا کرو۔مریض نے کہا ''ڈاکٹر صاحب، میں وہی کامیڈین ہوں۔'' حاضرین کرام، اس پس منظر میں انور مسعود صاحب کا یہ شعر سنیے اور اندازہ لگائیے کہ تخلیق کا کرب کیا ہوتا ہے۔کہتے ہیں

بڑے نمناک سے ہوتے ہیں انور قہقہے تیرے
کوئی دیوارِ گریہ ہے ترے اشعار کے پیچھے

ادھر کچھ عرصے سے انور مسعود صاحب نے اردو/انگریزی مرکبات بنانے کا شوق پال لیا ہے۔گذشتہ ہفتے ایک محفل میں ان سے کئی ایک ایسے الفاظ سننے کو ملے، مثلاً ''بے Purpose'' (بے مقصد)، ''غیر Concerned'' (غیر متعلقہ)، ''نا Speakable'' (ناقابلِ بیان) وغیرہ۔ہمارے ایک بزرگ مختلف زبانوں میں متشابہات تلاش کرتے تھے مثلاً ان کا کہنا تھا کہ انگریزی میں Saint ہے۔ہندی میں اسے 'سَنت' بنالیا گیا۔مسلمانوں کے ہاتھوں میں آکر یہ لفظ ''سُنَّت'' ہوگیا۔انگریز کہتا ہے Decoration۔ہم کہتے ہیں ''دیکھو رے شان'' وغیرہ۔مقام شکر ہے کہ انور مسعود صاحب نے اپنے ''لا Number'' (لاتعداد) مرکبات زبانی گفتگو تک محدود رکھے ہیں۔اگر خدانخواستہ یہ کبھی اِن کی شاعری میں در آئے۔۔۔تو صورتِ حال بہت ''Tragedy ناک'' ہوجائے گی!

(یہ خاکہ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی آڈیٹوریم میں نافا اسٹاک فنڈ (NAFA Stock Fund) اور روٹری کلب کراچی کارساز کی جانب سے ممتاز مزاح گو پروفیسر انور مسعود کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کے موقع پر پڑھا گیا۔)

رشتوں کا نیلام

۱۔ عدنان خشوگی اور ثریا خشوگی آف سعودی عرب نے بیس سالہ رفاقت کے بعد ۱۹۸۰ء میں 2.3 بلین ڈالر کے عوض ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

۲۔ برنارڈ چارلس ایلکسٹن اور جوکولین ایلکسٹن آف برطانیہ کے درمیان طویل رفاقت کے بعد ۱۹۹۹ء میں 3.8 بلین ڈالر کی ادائیگی کے بعد طلاق ہوئی۔

۳۔ ریرٹ مارڈچ اور انا مارڈچ آف میلبرن کے درمیان اکتیس سالہ ازدواجی زندگی کے بعد ۱۹۹۹ء میں ہونے والی طلاق کی صورت میں 1.7 بلین ڈالر ادا کیے گئے۔

۴۔ بیرنی ایکلیسٹون اور سلاویکا آف برطانیہ کی تیئس سالہ ازدواجی زندگی کے بعد ۲۰۰۹ء میں ہونے والی طلاق کی صورت میں 1.2 ارب ڈالر ادا کیے گئے۔

۵۔ سٹیو وائن اور ایلنی آف لاس ویگاس کے درمیان ۲۰۱۰ء میں ہونے والی طلاق کی صورت میں 1.1 بلین ڈالر کی ادائیگی ہوئی۔

۶۔ سال ۲۰۱۲ء میں ہارنلڈ اور سوتی آرنسل آف اوکولوہاما کے درمیان شادی کے ۲۴ سال بعد ہونے والی طلاق کی مد میں 2.8 بلین ڈالر ادا کیے گئے۔

۷۔ جیف بیزوس اور میکنیزی بیزوس نے پچیس سالہ ازدواجی زندگی کے بعد اپریل ۲۰۱۹ء میں ریکارڈ پینتیس بلین ڈالر کی ادائیگی کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

ایک صدی کا قصّہ

مکیش

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

سولہ سال کی عمر میں دلی کا ایک خوب رو نوجوان بمبئی کی فلم نگری میں قسمت آزمانے آیا تھا۔ اُسکے پاس نہ کوئی ٹھور ٹھانہ ٹھکانہ۔ وہ ایک مڈل کلاس پریوار سے آیا تھا اسلئے کوئی بینک بیلینس بھی نہیں تھا۔ لے دے کے دو جوڑے کپڑے تھے۔ تقدیر سے اُس کے سر پر ایک نامی گرامی فلم اداکار کا ہاتھ تھا جو اُسے دلی سے بمبئی لے آیا تھا۔ اُسی کے نام کا سہارا لے کے اُسنے ایک فلم میں انٹری پالی۔ فلم میں بریک تو ملا پر فلم چلی نہیں۔ اسی دوران اُس کی ملاقات ایک کروڑ پتی گجراتی کاروباری کی بیٹی سے ہوئی جسکا نام سرل ترویدی رائے چند تھا جو کہ ترویدی رائے چند کی بیٹی تھی۔ وہ بڑودہ میں رہتی تھی اور اکثر بمبئی آیا جایا کرتی تھی۔ یہ نوجوان اُسکے بنگلے کے سامنے رہتا تھا۔ ایک بار اُن کی آنکھیں کیا ہوئی چار کہ دل میں آیا پیار۔ بہت جلد ان کا پیار پروان چڑھنے لگا۔ دیکھا جائے تو اس ٹھن ٹھن گوپال نے وہ کام کیا تھا جو کوئی خوش نصیب ہی کر پاتا ہے۔ اس کے ہاتھ ایک سونے کی کان لگی تھی۔ بات رائے چند تک پہنچی۔ گھر میں بھونچال آ گیا۔ اُنہیں جب پتا چلا کہ اُنکی بیٹی ایک پنجابی کاسٹھ سے پیار کرتی ہے جو کہ نہ صرف ماس مچھی کھاتا ہے بلکہ دارو بھی پیتا ہے۔ وہ کٹر برہمن تھے اور پیاز تک کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے اسلئے اُنکا برہم ہونا جائز تھا۔ جبکہ اُنکی بیٹی یہ ضد پکڑ کے بیٹھی کہ وہ اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے جس کے آگے ہاتھ اور پیچھے پات۔ ستم بالاستم یہ کہ لڑکا فلموں میں کام کرتا ہے۔ اُس زمانے میں فلموں میں کام کرنے والوں کو قدر کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اُنہوں نے لڑکی کو ایک کمرے میں قید کر کے رکھا۔ اُسے باہر جھانکنے تک کی اجازت نہیں تھی۔ بیچارا عاشق اپنے محبوب کے دیدار پانے کے لئے رات رات بھر اُنکے گیٹ کے سامنے کھڑا رہتا تھا۔ بھری برسات میں وہ محبوب کی ایک جھلک پانے کے لئے رات بھر بھیگتا رہتا تھا۔ ایسے جنون کی حد تک وہ اسکو چاہتا تھا۔ کہتے ہیں پریت نہ جانے جات کجات۔ لڑکی نوجوان کے پیار میں اس حد تک دیوانی ہو چکی تھی کہ جب ماں باپ نے اس رشتے کو سرے سے ہی ٹھکرا دیا تو اُس نے گھر سے بھاگ جانے کا من بنالیا۔ 22 جولائی 1946 جو کہ اس عاشق کا جنم دن تھا اور اتفاق سے سوموار کا دن تھا۔ اُس دن گھر والوں نے لڑکی کو مندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ مہندی لگا کر گھر سے نکلی اور ننگے پاوں مندر چلی گئی۔ وہاں سے وہ کاندیولی کے مندر پہنچ گئی جہاں اُسکا عاشق پہلے سے انتظار کر رہا تھا۔ اُنہوں نے چھپ کر ایک مندر میں شادی کی اور اس شادی میں بمبئی کے ایک نامی اداکار نے اُنکی مدد کی۔ سہاگ رات منانے کے لئے اُنکے پاس کوئی جگہ نہیں تھی کیونکہ یہ عاشق ایک چالی میں رہتا تھا۔ ایک مشہور کیمرہ مین نے اُنہیں اپنے گھر میں ایک رات کے لئے پناہ دی اور اسطرح اُنہوں نے اپنی پہلی سہاگ رات منائی۔

یہ قصہ ہے اُس شخص کا جس کا نام مکیش چندر ماتھر ہے اور جسے دنیا مکیش کے نام سے جانتی ہے۔ مکیش کا جنم 22 جولائی 1923 کو دلی کے ایک کاستھ پریوار میں ہوا۔ مکیش کے والد زورآور چند ماتھر پیشے سے انجینئر تھے جب کہ والدہ چندرانی ماتھر ایک گھریلو عورت تھی۔ مکیش ان کی چھٹی اولاد تھی جب کہ اُنکے کل ملا کر دس بچے تھے۔ سندر پیاری مکیش کی بڑی بہن تھی جسے سنگیت سکھانے کے لئے ایک میوزک ٹیچر گھر پر آیا کرتا تھا۔ اُستاد کو گمان بھی نہیں تھا کہ اُسکا ایک شاگرد مکیش دوسرے کمرے میں چھپ کر سنگیت سیکھ رہا ہے۔ دسویں پاس کرنے کے بعد مکیش نے پبلک ورکس محکمے میں بطور کلرک مختصر مدت کے لئے نوکری کی۔ ملازمت کے دوران اُسنے اپنی آواز کو پرکھنا شروع کیا۔ مکیش کی بہن کی شادی تھی جس میں اُس دور کے مشہور اداکار موتی لال کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ موتی لال مکیش کا دور کا رشتہ دار تھا۔ مکیش نے اپنی بہن کی شادی کی تقریب میں کئی گانے گائے۔ موتی لال اُسکی آواز سے کافی متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ اس لڑکے میں بے پناہ صلاحتیں ہیں۔ وہ مکیش کو اپنے ساتھ بمبئی لے آئے اور اسے سنگیت کی مزید ٹریننگ لینے کے لئے گورو پنڈت جگن ناتھ پرساد کے سپرد کر دیا۔ مکیش کافی پروجیہ نوجوان تھا۔ اُسوقت مکیش کی عمر محض سولہ سال تھی۔

ایک فلم ساز نے اُسے ایک فلم آفر کی جسمیں اُسے گانے بھی گانے تھے اور مرکزی کردار بھی ادا کرنا تھا۔ اس فلم کا نام ''نردوش'' تھا۔ یہ فلم 1941 میں ریلیز ہوئی۔ بحیثیت پلے بیک سنگر کے جو اُسے پہلا بریک ملا وہ فلم تھی ''پہلی نظر''۔ اس فلم کے موسیقار مشہور سنگیت کار انل بسواس تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن ریکارڈنگ ہونی تھی اُس دن خوب بارش ہو رہی تھی۔ مکیش وقت پر اسٹوڈیو پہنچ نہ سکا۔ انل بسواس غصے سے اُبل رہے تھے۔ جونہی مکیش نے ریکارڈنگ روم میں قدم رکھا انل بسواس نے اپنا آپا کھو دیا اور اُٹھ کر مکیش کو دیر سے آنے کے لئے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ اس تھپڑ نے مکیش کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ انل بسواس نے اُسے فوراً مائک کی طرف دھکیل دیا۔ ریکارڈنگ شروع ہوئی، گانا تھا۔ دل جلتا ہے تو جلنے دے۔ اس گیت کو آہ سلطانپوری نے لکھا تھا۔ یہ بڑا پرسوز گانا تھا۔ مکیش نے اس گانے کو درد میں ڈوب کے گایا۔ جب ریکارڈنگ مکمل ہوئی تو انل بسواس نے اُس سے معافی مانگی اور کہا کہ وہ اُسکی آواز کو سوز میں ڈوبا ہوا سننا چاہتے تھے اسلئے اُسنے یہ حرکت کی۔ مسرت کی بات یہ ہے کہ جو اُسے چاہیے تھا وہ اُسے مل گیا۔ اُسنے اُسے اتنا خوبصورت گانا گانے پر بہت مبارک باد دی۔

مکیش کے ایل سہگل کا اسقدر مداح تھا کہ جب اسکا گانا ریڈیو پر بجنے لگا تو سہگل صاحب نے اپنے سیکرٹری سے پوچھا کہ یہ گانا میں نے کب گایا مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا ہے۔ سیکرٹری نے کہا کہ یہ گانا آپ نے نہیں بلکہ ایک نئے گلوکار

مکیش نے گایا ہے۔اتنا زبردست اثر تھا سہگل صاحب کی آواز کا مکیش کی گائیکی پر۔سہگل صاحب نے مکیش کو اپنے گھر پر بلا کر اُسے نہ صرف آشیر واد دیا بلکہ تحفے میں اُسے اپنا ہارمونیم بھی بخش دیا۔یہ نوشاد صاحب تھے جنہوں نے مکیش کو سہگل صاحب کے اثر سے باہر نکال کر اُسے اپنا ایک اسٹائل پیدا کرنے پر اُکسایا۔فلم ''میلہ'' میں اُسنے اپنا اسٹائل پیدا کیا جسے کافی پسند کیا گیا۔اس فلم میں وہ دلیپ کمار کی آواز بنا تھا۔اُسکے بعد فلم ''انداز'' میں اُسنے دلیپ کمار کو پلے بیک دیا جب کہ محمد رفیع راجکپور کی آواز بنا تھا۔اپنے اسٹائل میں اُسنے نوشاد کے سنگیت میں کئی لافانی گیت دئے جیسے تو کہے اگر، جھوم جھوم کے ناچو آج، ہم آج دل کہیں کھو بیٹھے، ٹوٹے نا دل ٹوٹے نا۔ان چار گانوں نے مکیش کو ظفر یابی بخشی۔شروع شروع میں مکیش دلیپ کمار کی آواز بنا۔مکیش نے دلیپ کمار کے لئے کئی فلموں میں گیت گائے جیسے فلم ''انوکھی ادا'' 1948 فلم ''میلہ'' 1948، فلم ''انداز'' 1949۔اُسنے دلیپ کمار کے لئے کئی سپر ہٹ گانے دئے۔جیسے جیون سپنا ٹوٹ گیا۔فلم ''انوکھا پیار'' موسیقار انل بسواس، یہ میرا دیوانہ پن ہے۔فلم ''یہودی'' موسیقار شنکر جے کشن، سہانا سفر اور دل تڑپ تڑپ کے، فلم ''مدھومتی'' سنگیت کار شنکر جے کشن۔

راجکپور کے لئے شروعاتی ایام میں محمد رفیع نے پلے بیک دیا۔یہ فلم ''آگ'' تھی جب مکیش نے راج کپور کے لئے گانے گائے۔''زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں''۔اس گانے کے بعد مکیش راج کپور کی آواز بن گیا۔اُسنے مرتے دم تک راج کپور کے لئے گانے گائے۔دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم بن کے رہ گئے تھے۔ان دونوں کا جسم وجان کا رشتہ بن کے رہ گیا تھا۔مکیش کی آواز راجکپور پر اس طرح فٹ بیٹھتی تھی کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ راجکپور کی آواز نہیں۔ راج کپور کی فلم کے لئے جب کوئی گانا ریکارڈ ہوتا تھا تو سب سے پہلے چھ لوگ اس پر اپنی رائے دیتے تھے۔شنکر، جے کشن، شیلندر، حسرت جے پوری، لتا منگیشکر اور مکیش۔ان لوگوں نے گانا پسند کیا تو اُسکے بعد راج کپور کے گھر میں زبردست پارٹی ہوتی تھی۔پھر آدھی رات کو راج کپور صاحب مکیش کو ان کو اپنی گاڑی میں اُنکی چالی میں چھوڑ کے آتے تھے۔راج کپور کو دیکھتے ہی چالی کے سبھی لوگ اُن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔مکیش کی اہلیہ سرل مکیش فرش پر بچھا مٹرس لپیٹتی۔وہ جانتی تھی کہ راج کپور کمرے کے اندر آجائے گا۔راج کپور اندر آتے ہی سرل سے کہتے تھے کہ بھابی جی اُٹھئے میں کھانا کھاؤں گا۔مکیش نے شنکر جے کشن کے سنگیت میں بیشمار لافانی گانے دئے۔فلم ''برسات'' سے یہ سفر شروع ہوا۔اُسکے بعد فلم ''آوارہ'' کے گیتوں نے دھوم مچائی۔ان گیتوں کو آفاقی شہرت ملی۔یہ گانے ہندوستان کے شہروں سے نکل کر روس اور چین کی گلیوں میں گونجنے لگے۔پھر آئی فلم ''آہ''۔اُسکے بعد راج کپور کی سپر ہٹ فلم ''شری چار سو بیس'' آئی جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔اس فلم میں مکیش کے گیتوں نے دھوم مچائی۔میرا جوتا ہے جاپانی یہ پتلون انگلستانی، وغیرہ وغیرہ۔مکیش نے شنکر جے کشن کے ساتھ 133 گانے صدا بند کئے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔مکیش کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں شنکر جے کشن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

جب فلم ''سنگم'' کا گانا ریکارڈ ہوا۔دوست دوست نہ رہا، پیار پیار نہ رہا تو شنکر جے کشن نے ریکارڈنگ کے بعد ایک مشہور فلورسٹ سے کہا کہ وہ جتنے بھی پھول جمع کر سکتا ہے وہ سارے کے سارے پھول مکیش کے گھر پہنچا دو۔ایک کمرے میں کتنے پھول سما سکتے تھے۔وہاں پاؤں رکھنے کی جگہ بھی نہیں بچی۔رات کو راج کپور ریکاڈ اور سپول لے کے آئے۔دونوں دوست رات بھر پیتے رہے اور یہ گانا بار بار سنتے رہے۔کبھی تالیاں بجاتے رہے، کبھی ایک دوسرے کے گلے مل کر روتے رہے۔

مکیش نے اداکاری کے میدان میں بھی قسمت آزمائی کی۔ 1941 کی فلم ''نردوش'' میں اُسنے اُس دور کی اوّل درجے کی ہیروئن نلنی جیونت کے ساتھ کام کیا۔دوسری فلم تھی ''آداب عرض'' جو کہ 1943 میں ریلیز ہوئی۔ اُسنے راجکپور کی فلم ''آہ'' میں ایک مہمان کلاکار کی حیثیت سے کام کیا جو کہ 1953 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جسکا نام ''معشوقہ'' تھا۔اس فلم کی ہیروئن سریا تھی۔1956 میں اُسکی ایک اور فلم تیار ہوئی جسکا نام ''انوراگ'' تھا۔اس فلم کی ہیروئن اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن اوشا کرن تھی۔اس فلم میں وہ ہیرو کے علاوہ معاون فلم ساز اور موسیقار بھی تھا۔یہ فلم ڈبوں میں ہی پڑی رہی۔گو کہ اس کے گیت ریڈیو پر بجتے رہے جن کی رائلٹی مکیش کو ملتی رہی۔اس فلم کا ایک گانا ''کسے یاد رکھوں کسے بھول جاؤں'' آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے۔اسکے بعد مکیش نے بطور فلمساز پہلی اور آخری فلم بنائی جس کا نام ''ملہار'' تھا۔اس فلم کا ہیرو راجن تھا جبکہ ہیروئن شیاما تھی۔فلم بری طرح ناکام رہی۔فلم فلاپ ہوئی البتہ اسکا سنگیت صدا بہار رہا۔اسی فلم کا یہ گانا آج بھی مشہور ہے۔''بڑے ارمان سے رکھا ہے بلم'' مکیش نے اسکے بعد فلمسازی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔گو کہ ''آوارہ'' اور فلم ''چار سو بیس'' کے گانوں ''آوارہ ہوں'' اور ''میرا جوتا ہے جاپانی'' نے اُسے شہرت سے ہمکنار کر دیا تھا مگر فلمسازی نے اُسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔وہ اس حد تک کنگال ہو چکا تھا کہ اسکے پاس بچوں کی اسکول فیس جمع کرنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔فیس نہ ملنے کے سبب اُنکے دونوں بچوں کو امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا اور اُنہیں امتحان ہال سے نکالا گیا۔جب مکیش کے دونوں بچے روتے بلکتے گھر پہنچے تو مکیش اُنہیں دیکھ کے سن ہو کے رہ گیا۔اُن دنوں مکیش کا پریوار پیڈر روڈ کی ایک چال میں رہتا تھا۔مکیش کو پرنسپل کی اس حرکت پر غصہ تو آیا مگر جلد ہی اُسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ خطاوار پرنسپل نہیں بلکہ وہ خود ہے۔اُسکی بیوی سرل جو کہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی اس غربت وافلاس کے دور میں اسکا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔مکیش بڑا خوددار آدمی تھا۔وہ چاہتا تو اپنے سسرال والوں سے مدد مانگ سکتا تھا پر وہ اپنے سسر کے سامنے جھکنے کیلئے تیار نہ تھا۔اس چالی کے جو سبزی فروش تھے وہ گاہے گاہے مکیش کی مالی مدد کرتے تھے۔جب مکیش کے گانے ریڈیو سیلون کے مقبول پروگرام ''بنا کا گیت مالا'' میں بجتے تھے تو چالی میں جشن کا سماں ہوتا تھا۔انکے پڑوسی ان گانوں کو

سن کے مکیش کے بچوں کو اپنے گھر پر بلاتے تھے اور پھر آئس کریم سے نہ صرف انکی خاطر تواضع کرتے تھے بلکہ انہیں انعام میں کبھی ایک روپیہ اور کبھی پانچ روپے دے جاتے تھے۔اسی بیچ اُسنے لتا منگیشکر سے اُنکی پرانی گاڑی خریدی جسمیں اُسنے اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اپنی چالی کے بچوں کو بھی خوب گھمایا۔مکیش جب بھی اپنے بچوں کو بال کٹوانے کے لئے لے جاتا تھا تو وہ چالی کے بچوں کو بھی لے کے جاتا تھا اور انکے بال بھی کٹوا کے آتا تھا۔

فلمساز بننے کے سبب کوئی بھی مکیش کو کام دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔اُسنے سب سے بڑی حماقت یہ کی کہ گائیکی چھوڑ کے فلموں میں ایکٹنگ کی۔وہ ایک اچھا گلوکار تھا جب کہ وہ بہت برا ایکٹر تھا۔اسی طرح کی حماقت طلعت محمود نے بھی کی تھی۔وہ بھی ناکام رہا۔سوائے کشور کمار اور کے ایک سہگل کے جتنے بھی گلوکاروں نے ایکٹنگ میں قسمت آزمائی کی وہ ناکام رہے۔اُنہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔لتا منگیشکر نے بھی ابتدائی ایّام میں اداکاری سے شروعات کی تھی۔شوقیہ نہیں بلکہ گھر کی بدحالی کی وجہ سے۔اُسکا پہلا پیار تو گائیکی تھا۔اُسوقت کے فلمی پنڈت اُسکی گائیکی کا ہی نہیں مذاق اُڑاتے تھے بلکہ اُسے سنجیدہ رول نہیں بلکہ مزاحیہ رول ادا کرنے کی نصیحت دیتے تھے۔بعد میں اُسنے سبھی مخالفوں کی بولتی بند کردی۔یہی سب کچھ مکیش کے ساتھ ہوا۔سنگیت کاروں نے اُسکے بعد اُنہیں بلانا ہی بند کر دیا۔وہ بڑے ہی مشکل دور سے گزر رہا تھا۔ان حالات میں بھی اُسنے بچوں کی ہر فرمائش پوری کی۔ایک بار بچے سائیکل کی فرمائش کر بیٹھے۔مکیش اُن کے لئے ایک بدیسی سائیکل لے کے آگئے۔بعد میں پتا چلا کہ اس کے لئے اُس نے کسی سے رقم اُدھار لے لی تھی۔

کہتے ہیں بارہ برس کے بعد گُوڑی کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔مکیش کے دن بھی پھرنے لگے۔ایک دن اوپر والے نے مکیش کی سن لی۔شنکر جے کشن اُسکے لئے فرشتہ رحمت بنکر آگئے۔اُنہوں نے اُسے فلم ''یہودی'' میں گانا گانے کا چانس عطا کیا۔سو کے دانوں پانی پڑا۔طلعت محمود جو کہ سلیل چودھری کا پسندیدہ گلوکار تھا، جب اُسے فلم ''مدھومتی'' پیش کی گئی تو اُسنے سلیل چودھری سے معذرت طلب کی اور اُس سے درخواست کی کہ وہ یہ گانے مکیش سے گوائے کیونکہ وہ مالی پریشانی میں مبتلا ہے۔اس طرح مکیش فلم ''مدھومتی'' میں آگیا۔اسکے بعد دروازے کھلتے گئے۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''پرورش'' میں اُسے گانے کا موقع مل گیا۔سچن دیو برمن جس نے مکیش کی آواز کو کبھی استعمال نہیں کیا تھا، اُسنے بھی مکیش سے گانے گوائے۔فلمیں تھیں ''بمبئی کا بابو'' اور ''بندنی''۔اسطرح مکیش مالی بحران سے باہر آگیا۔

مکیش نے سونے کا دل پایا تھا۔ایک بار وہ سائیں بابا کے درشن کے لئے شری ڈی چلا گیا۔اُسنے ائیر پورٹ سے ایک آٹو رکشہ کرایے پر لے لیا۔رکشہ ڈرائیور مکیش کے گانوں کا مداح تھا۔مکیش جب رکھشے میں بیٹھ گیا تو اُس نے حسب عادت مکیش کے گانے بجائے۔مکیش نے کہا کیوں ایسے واہیات گانے سن رہے ہو۔رکشہ ڈرائیور برا فروختہ ہو کے مکیش سے بولا کہ اگر آپ نے میرے محبوب سنگر کے بارے میں اور کچھ بولا تو میں آپ کو رکھشے سے اُتار دوں گا۔مکیش نے اُسے ٹھنڈا کیا اور بتایا کہ اگر وہ مکیش کا اتنا زبردست مداح ہے تو وہ اُسے اُس سے ملا سکتا ہے کیونکہ وہ اُسکا دوست ہے۔وہ بڑا خوش ہوا۔باتوں باتوں میں مکیش نے اُس سے پوچھا کہ کیا یہ رکشہ اُسکا اپنا ہے تو جواب میں وہ بولا کہ میں یہ رکشہ بھاڑے میں لے کے آتا ہوں۔مکیش نے شری ڈی پہنچ کے اُسے رکنے کے لئے کہا اور مکیش درشن کرنے مندر میں چلا گیا۔وہاں سے فارغ ہو کر وہ رکشہ ڈرائیور کو اپنے ساتھ بمبئی لے آیا اور سیدھے اپنے بنگلے میں لے گیا۔وہ چالی سے نکل کے بنگلے میں آگیا تھا۔بنگلے پر پہنچ کر اُسنے اپنے بیٹے تن مکیش سے کہا کہ یہ میرا خاص مہمان ہے اسکی خاطر میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔یہ کہہ کر وہ خود نہانے چلا گیا۔رکشہ ڈرائیور نے دیوار پر ٹنگی مکیش کی تصویر دیکھی تو اُسنے تن سے پوچھا کہ یہ کس کی تصویر ہے تو بیٹے نے کہا کہ یہ اُسکے ڈیڈی مکیش جی کی تصویر ہے۔یہ سن کے رکشہڈرائیور کی حالت پتلی ہوگئی۔اتنے میں مکیش نہا دھو کے باہر آگیا۔رکشہ ڈرائیور بت بنا بیٹھا تھا۔مکیش نے اپنا رکشہ خریدنے کے لئے پوری رقم دے دی اور اُسے بذریعہ ہوائی جہاز واپس شری ڈی بھیج دیا۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ لتا منگیشکر کو نوشاد صاحب سے ملانے والا مکیش ہی تھا۔لتا منگیشکر کی آواز پتلی ہے اسلئے سنگیت کار اُسے کام نہیں دے رہے تھے۔نوشاد صاحب نے اُسے گانا سنانے کے لئے کہا۔وہ اُسکی آواز سے اتنا متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے اُسے فلم ''انداز'' میں گانا گانے کا موقع دیا۔محبوب صاحب لتا کو گوانے کے حق میں نہیں تھے۔اُنہوں نے نوشاد سے کہا کہ جس فلم میں دلیپ کمار، راجکپور اور نرگس ہوں اُس فلم میں یہ نئی گلوکارہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح نہیں لگے گی۔نوشاد نے کہا کہ نہیں لگے گی۔آپ مجھ پر بھروسہ رکھئے۔نوشاد صاحب نے ثابت کر کے دکھایا۔فلم ''انداز'' کے گانوں نے لتا منگیشکر کو شہرت کی معراج پر پہنچا دیا۔

اسی طرح جب راج کپور کی فلم ''میرا نام جوکر'' بری طرح پٹ گئی اور راجکپور عرش سے فرش پر آگیا۔اس فلم نے راجکپور کو اسطرح توڑ کے رکھدیا کہ وہ گھر میں محصور ہو کے رہ گئے۔مکیش کو راجکپور کا جنم دن یاد تھا۔راج کپور پوری طرح کنگال ہو چکا تھا ایسے میں وہ اپنا جنم دن کیا مناتا۔مکیش نے راجکپور کا جنم دن پورے تزک واحتشام کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا۔اُسنے اپنے خرچے پر بمبئی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا جسمیں انڈسٹری کے بڑے بڑے اداکار اور اداکارائیں شریک ہوئیں۔راجکپور مکیش کے اس خلوص کو دیکھ کے اپنے آنسو روک نہ سکے۔اُنہوں نے مکیش سے گلے مل کر کہا کہ مکیش میری جان ہے، میری آتما ہے۔

مکیش نے تیرہ سو گیت گائے۔اُسنے سبھی موسیقاروں کیساتھ کام کیا۔اُسنے سینکڑوں یادگار اور صدا بہار گانے دئے۔1974 میں اُسے پہلی مرتبہ فلم ''رجنی گندھا'' کے گانے ''کئی بار یونہی دیکھا ہے'' کے لئے نیشنل ایوارڈ سے نوازا

گیا۔اس سے قبل مکیش کو چار مرتبہ فلم فیر ایوارڈ سے سرفراز اگیا۔فلمیں تھیں۔''اناڑی'' گانا۔سب کچھ سیکھا ہم نے ، نہ سیکھی ہوشیاری۔ 1959 موسیقار شنکر جے کشن۔فلم ''پہچان'' گانا۔سب سے بڑا نادان۔1970 موسیقار شنکر جے کشن۔فلم ''بے ایمان'' گانا۔جے بولو بے ایمان کی۔1972 موسیقار شنکر جے کشن۔فلم ''کبھی کبھی'' گانا۔کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے۔موسیقار۔خیام سال 1976۔

مکیش ایک شریف النفس انسان تھا۔فلم انڈسٹری میں کسی بھی فرد کو اُس سے کبھی کوئی شکایت نہ رہی۔وہ محمد رفیع ،طلعت محمود، مناڈے اور کشور کمار کے ہم پلہ تھا۔ان چاروں چوٹی کے گلوکاروں کی خوبی یہ تھی کہ ان چاروں کی آواز مختلف تھی۔ان سبھی گلوکاروں کا اپنا اپنا اسٹائل تھا۔مکیش نے لگ بھگ سبھی اداکاروں کے لئے پلے بیک دیا۔اگست 1976 میں وہ لتا منگیشکر کیساتھ امریکہ کے ڈیٹروٹ (میچا گن) شہر میں ایک میوزیکل پروگرام کررہے تھے۔27 اگست کی صبح جب اُسنے شاور لیا اور وہ غسل خانے سے باہر آگیا تو اُسنے سینے میں درد کی شکایت کی۔اُسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔افسوس کہ وہ جانبر نہ ہوسکا۔وہ اپنے پیچھے پانچ بچے اور غم زدہ بیوہ کو چھوڑ کے چلا گیا۔لتا منگیشکر اُسکی لاش لے کے وطن لوٹی۔پورے ملک میں ماتم کی لہر دوڑ گئی۔راج کپور کو جب یہ خبر ملی تو وہ بچے کی طرح رونے لگا۔وہ بار بار سیاپا کرتے ہوئے کہہ رہے تھے جب جے کشن چلا گیا تو مجھے لگا کہ میں نے اپنا ایک بازو کھو دیا۔جب گیت کار شیلندر اس دنیا سے رخصت ہوا تو مجھے لگا کہ میں نے دوسرا بازو کھو دیا لیکن اب جب کہ مکیش چلا گیا تو مجھے لگ رہا ہے کہ میری جان ہی چلی گئی۔

مکیش کے انتقال کے بعد اُسکی کئی ساری فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں ''دھرم ویر''''امر اکبر انتھونی''''کھیل کھلاڑی کا''''درندہ'' ''آہوتی'' ''پرماتما''''تمہاری قسم''اور''ستیم شیوم سندرم''۔یہ فلمیں 1977 اور 1978 میں ریلیز ہوئیں۔ 1980 میں ''شیطان مجرم''''پریمیکا''اور''پتھر سے ٹکر'' ریلیز ہوئیں۔اسی طرح 1981 سے لے کے 1997 تک اُس کے گانے گونجتے رہے جن میں فلم''سانجھ کی بیلا''''میلا آنچل''''آروہی''''چور منڈلی''''نرنج''''لواینڈ گاڈ''''شبھ چنتک''اور''چاند گرہن'' قابل ذکر ہیں۔

سرل مکیش جس نے ٹھاٹ بھاٹ چھوڑ کے ایک فقیر کا ہاتھ تھام لیا اور مرتے دم تک وہ اُسکے ساتھ رہی۔اُسنے عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر تنگدستی میں جینے کو ترجیح دی مگر اپنے محبوب کا دامن نہیں چھوڑا۔وہ کئی سالوں تک چالی میں رہی مگر اُسنے کبھی اُف تک نہ کی۔سچ مچ پیار دیوانہ ہوتا ہے یہ سرل نے ثابت کر کے دکھایا۔سرل اور مکیش کے پانچ بچے ہوئے۔ایک بیٹی ٹلنی کا دیہانت ہو گیا جب کہ چار بچوں میں ریتا سب سے بڑی ہے۔اُسکے بعد نتن ہے جو کہ باپ کے نقش وقدم پر چل کر ایک گلوکار بن گیا۔اُسکے بعد بیٹا نیش اور سب سے چھوٹی بیٹی امرتا ہے۔نتن کا بیٹا نیل نتن مکیش ایک اچھا ایکٹر ہے اور اب تک کئی فلموں میں کام کر چکا ہے۔سرل 25 فروری 2008 کو اپنے محبوب سے ملنے کے لئے اس دنیا کو خیر باد کہہ کے چلی گئی۔

لتا منگیشکر اُسے اپنا بھائی مانتی تھی اور ہمیشہ مکیش بھیا کہہ کے اُس سے مخاطب ہوتی تھی۔مکیش تو چلا گیا مگر اپنے پیچھے ایک بیش بہا خزانہ اپنے گیتوں کی صورت میں چھوڑ کے چلا گیا۔کلاکار کبھی مرتا نہیں ہے۔وہ اپنے فن کی بدولت ہمیشہ زندہ وتابندہ رہتا ہے۔

''دَشت کی تصویر''

اَبر کے چاروں طرف باڑ لگا دی جائے
مفت بارِش میں نہانے پہ سزا دی جائے
سانس لینے کا بھی تاوان کیا جائے وُصول
سبسڈی دُھوپ پہ کچھ اور گھٹا دی جائے
رُوح گر ہے تو اُسے بیچا ، خریدا جائے
وَرنہ گودام سے یہ جنس ہٹا دی جائے
قہقہہ جو بھی لگائے اُسے بِل بھیجیں گے
پیار سے دیکھنے پہ پرچی تھما دی جائے
تجزیہ کر کے بتاؤ کہ منافع کیا ہو
بوندا باندی کی اُگر بولی چڑھا دی جائے
آئینہ دیکھنے پہ ڈگنا کرایہ ہو گا
بات یہ پہلے ، مسافر کو بتا دی جائے
تتلیوں کا جو تعاقب کرے، چالان بھرے
زُلف میں پھول سجانے پہ سزا دی جائے
یہ اُگر پیشہ ہے تو اِس میں رِعایت کیوں ہو
بھیک لینے پہ بھی اَب چنگی لگا دی جائے
کون اِنسان ہے کھاتوں سے یہ معلوم کرو
بے لگانوں کی تو بستی ہی جلا دی جائے
حاکمِ وَقت سے قزاقوں نے سیکھا ہو گا
باج نہ ملتا ہو تو گولی چلا دی جائے
کچی مِٹّی کی مہک مفت طلب کرتا ہے
قیس کو دَشت کی تصویر دِکھا دی جائے

(شاعر:نادر یافت)

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

برادرِ من گلزار جاوید صاحب! تسلیمات۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ جی خوش ہو گیا۔ خوشی کا ایک سبب سرورق پر چہچہاتا ہوا وہ چہرہ بھی ہے جسے آپ نے اپنے تخلیقی وفور اور فنی شعور سے اور بھی بامعنی اور جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ ذرّے کو آفتاب بنانے کا فن جانتے ہیں مگر یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ ذرّے کی تابانی کو پرکھنا اور اس کی چمک کو چہارسو تک لے جانے کا ہنر آپ کو خوب آتا ہے۔ میری خوشی کا ایک سبب آپ کا یہ خوبصورت اور بلیغ جملہ بھی بنا ''اپنے عصر کے روشن دماغ، روشن قلب اور روشن قلم پروفیسر غضنفر کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کیا گیا ہے۔''

آپ نے ایک گوشے میں بہت سارے گوشے جمع کر دیے ہیں۔ اچھی طرح دکھائی دیتا ہے کہ آپ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس گوشے میں موجود فن کار کن کن جہتوں میں جست لگاتا رہتا ہے اور اس کی تخلیقی زقندیں کتنی تیز رفتار اور ضیا بار ہوتی ہیں؟

خوشی اس بات سے بھی ہوئی کہ میری تحریروں کو زیرِ بحث لانے والی وہ تحریریں ہیں جو اقبال مجید، مہدی جعفر، مرزا خلیل احمد بیگ، پیغام آفاقی، علی احمد فاطمی، قدوس جاوید وغیرہ جیسے معتبر اور نامور قلم کاروں کی نوکِ قلم سے نکلی ہیں۔ اس انتخاب کا کریڈٹ بھی آپ کو جاتا ہے اور اس سے آپ کے حسنِ نظر اور ذوقِ ادب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی ادب شناسی، شعر فہمی، ابتلاذوقی، باریک بینی، زبان دانی، زباں دوستی، ادیب نوازی، قدر شناسی، محنت، لگن اور ادب وفن کے تئیں سنجیدہ روی کا ثبوت آپ کے سوالوں سے بھی منعکس ہوتا ہے۔ آپ کے سوالات مطالعۂ فن اور مشاہدۂ فن کار سے ابھرے ہیں۔ وہ آپ کے ذوق وشوق اور قدر و قیمت کی غمازی تو کرتے ہی ہیں تخلیق کار کے فکر وفن کے ترجمان بھی ہوتے ہیں مگر وہ صرف خوش ہی نہیں کرتے فنکار کو چرکے بھی لگاتے ہیں اور اسے امتحان میں بھی ڈالتے ہیں۔ محمد انعام الحق نے ''حصارِ رنگ'' بھی بڑی محنت اور محبت سے تیار کیا ہے میری خوشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ خدا آپ کو آپ کے اس رسالے کو ہمیشہ قائم ودائم رکھے۔ آمین

غضنفر (علی گڑھ)

برادرم گلزار جاوید صاحب

آداب

چہار سو کا قرطاسِ اعزاز پروفیسر غضنفر کے نام دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ غضنفر نے پی ڈی ایف بھیج دی تھی اب رسالہ بھی مل گیا۔ غضنفر ایک ہمہ جہت فن کار ہیں، ایسے فن کاروں کو شناخت بنانے میں دشواری ہوتی ہے۔ اب تو سب نے انھیں ناول نگار تسلیم کر لیا۔ 'پانی' اور 'دویہ بانی' کا شمار اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔ علی احمد فاطمی کا تاثراتی خاکہ اچھا ہے۔ میں بھی اگر غضنفر پر لکھتا تو بہت سی باتیں مشترک ہوتیں۔ ہاں اس پروگرام کا ذکر ضرور کرتا جو انھوں نے کان پور میں کیا تھا۔ ہماری نسل کے سارے افسانہ نگار اور نقاد اکھٹا ہوئے تھے۔ کسی دوستی کے مثلث کی بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں جب بھی دلّی جاتا غضنفر سے ملاقات ضرور ہوتی۔ اب تو ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ زیادہ تر علی گڑھ میں رہتے ہیں، بیٹی، بیٹا اور بہو تینوں ڈاکٹر ہیں۔ اس معاملے میں وہ بہت خوش قسمت ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم کا گوشہ ان کی شرافت کا آئینہ دار تھا۔ اپنے بھائی پر انھوں نے بہت ہی متاثر کن خاکہ لکھا۔ اب ایسے لوگ کہاں پائے جاتے ہیں۔ اقدار بدل گئے ایثار کرنے والے بیوقوف کہلاتے ہیں۔ شموئیل ان دنوں حیدرآباد میں رہتے ہیں لیکن ملاقات نہیں ہوتی۔ میرا ایک شاگرد ان کا معتقد ہے اسی سے خیر خیریت مل جاتی ہے۔ 'ظہار' اچھا افسانہ ہے۔ ماہیتِ قلب کی کیفیت کو انھوں نے خوب صورتی سے پیش کیا۔ دیپک کنول نے پریم ناتھ پر بھرپور مضمون لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے فلم انڈسٹری زوال پذیر ہو جائے۔ ویب فلموں کی مقبولیت کا فیچر فلموں پر برا اثر پڑا ہے۔ چہارسو ایک بھرپور رسالہ ہے جس میں تخلیقی ادب کے علاوہ طب اور فلم پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آپ اور آپ کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔

پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد، دکن)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

پروفیسر غضنفر علی نے شاعری، فکشن اور لسانیات وغیرہ کے موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ درجن کتب تحریر کی ہیں جو تخلیق کار ہونے کے حوالہ سے فکری، فنی اور لسانی پہلوؤں پر مزید غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات سے قارئین چہارسو کو روشناس کرنے اور ان کے نام سے خصوصی شمارہ شائع کر کے جو پذیرائی کی گئی ہے نہایت قابلِ تحسین ہے۔

شمارہ میں دلچسپ افسانے، مضامین اور شاعری شامل کی گئی ہے۔ شموئیل احمد کا افسانہ ''ظہار'' ایک بہترین تحریر ہے جو مذہبی اخلاقی اور ازدواجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قارئین کی اشاروں کی زبان میں رہنمائی کرتی ہے۔ خوشگوار اور پائیدار ازدواجی زندگی کے لیے فریقین کا ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کا احترام کرنا کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

نیئر اقبال علوی کے افسانے معاشرہ میں تلخ حقیقتوں کا منظر نامہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک تلخ اور دردناک تصویر ''گٹھڑی میں بندھی بے بسی'' میں نظر آتی ہے جو رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے اور دیر تک دل اداس رہتا ہے۔ غربت کی سطح سے نیچے رہنے والوں کی زندگی کتنی دشوار اور بے بسی کے عالم میں گزرتی ہے یہ کہانی ایسے بہت سے تلخ واقعات میں سے ایک کی جھلک ہے۔ اسلامی فلاحی

ریاست کے نظریہ پر عمل سے ہی اس صورتِ حال کا تدارک ممکن ہے۔

آغا گل کا افسانہ ''بولان کے آنسو'' بلوچستان کی سماجی زندگی کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ تحریر ہے۔ مقامی نوابوں، سرداروں اور مفاد پرست سیاستدانوں نے عرصہ سے جبر کا نظام قائم کر رکھا ہے اور غربت کے خاتمہ، تعلیم و تربیت اور صوبہ کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کے لیے سنجیدہ اقدامات نہیں کیے۔ امید ہے گوادر اور سی پیک کے منصوبوں کی تکمیل سے عوام کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گا۔ کچھ بیرونی طاقتیں ظاہری ہمدردی کے روپ میں عوام کو گمراہ کرنے کی مسلسل کوشش میں سرگرم رہتی ہیں لیکن بلوچستان کے غیور اور محبِ وطن عوام ہمیشہ سے ایسے عناصر کو رد کرتے چلے آئے ہیں اور آئندہ بھی انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔

شاعری میں اچھا کلام شامل کیا گیا ہے خصوصاً ناصر کاظمی، غالب عرفان، رؤف خیر، مہندر پرتاپ چاند، مسعود تنہا، رومانہ رومی، فرح کامران، ڈاکٹر نبیل احمد نبیل، شگفتہ نازلی اور مشیر طالب کا کلام متاثر کن تھا۔ ان محنت طلب ادبی خدمات کو ایک خوبصورت شمارہ کی صورت میں قارئین کی نذر کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

مدیرِ محترم، سلام مسنون۔

مئی جون کا قرطاس اعزاز بنام پروفیسر غضنفر صاحب موصول ہوا۔ ''حصارِ رنگ'' سے بالترتیب اُن کے تعلیمی و تدریسی مراحل سے آگہی پائی۔ ہمہ جہت ادیب ہونے کے ناطے اُن کی متنوع شعری، نثری، تنقیدی درسی موضوعات پر کتب سے اُن کی وسیع النظری جھلکتی ہے اور وسیع المطالعہ ہونا بھی بین السطور منعکس ہے۔

تدریس نامہ ایسے منفرد و انوکھے رسالے کے مدیر ہونے اور اس وقت غضنفر اکادمی برائے فروغِ استعدادِ اردو کے ڈائریکٹر ہونے کے اعزازات بھی انہیں حاصل ہیں جو نہایت مستحسن اقدام اور کثیر الجہتی تخلیقی، تہذیبی خدمات اور تحقیقی سرگرمیوں کے مظہر ہیں۔

پروفیسر صاحب پر لکھی کئی مختلف الموضوع کتب کے حوالے سے اُدبی اعترافات اور تحسینی تاثرات بھی نہایت اہمیت و وقعت کے حامل ہیں۔ شائقینِ علم وادب کے لیے ان سب کو یکجا کر کے حسنِ مطالعہ کو فروغ ملا ہے۔ ذہنوں کے لیے راہیں ابلاغ ہموار ہوئی ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار صاحب، سلام مسنون۔

ویسے تو ہمیشہ ہی قرطاسِ اعزاز کی شخصیت نابغۂ روزگار ہوتی ہے ادب کی کہکشاں سے جو بھی ستارہ آپ منتخب کرتے ہیں وہ لاجواب ہوتا ہے۔ فیروز عالم صاحب ایک باکمال ڈاکٹر تو ہیں ہی اس کے ساتھ وہ ادب کے درخشندہ ستارے بھی ہیں۔ ان کے افسانے ان کی آپ بیتی کے کچھ حصّے پڑھ کر ان کی اور بھی گرویدہ ہوگئی ہوں۔ ان کی تحریریں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ زندگی کے بہت سے نشیب و فراز میں سے گزرے ہیں۔ وقت اور زمانے کی کھٹالی نے انہیں پاسے کا سونا بنا دیا ہے۔

''دھنک کا آٹھواں رنگ'' بہت لاجواب افسانہ ہے۔ اس میں ان کی شخصیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ انہیں جو ساری زندگی خدا پر بھروسہ رہا اس افسانے میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ''قطرہ قطرہ زندگی'' بہت ہی کرب انگیز افسانہ ہے پڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ باقی افسانے بھی اچھے ہیں۔

''پر کٹے پرندے'' تقسیم کے وقت بچھڑ جانے والے بہت سے خاندانوں کی کہانی ہے۔ انسانی جذبوں کے لیے کسی رنگ، نسل، مذہب اور کسی زمین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا رب جب انسان کو پیدا کرتا ہے تو سب جذبے اسے ودیعت کرتا ہے۔ بہت دلگداز کہانی ہے۔ گلزار صاحب اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

سیما پیروز (لاہور)

گلزار بھائی، تسلیمات۔

موجودہ چہارسو بہت دلچسپ ہے۔ اگرچہ ''چہارسو'' دلچسپ ہونا اس کا معمول ہے اور آپ کی شب و روز محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مصروفیت کے باوجود آپ اتنے جاندار افسانے کیسے لکھ لیتے ہیں؟

آپ کے اخلاق و اخلاص اور وضعداری کی تو میں دل سے معترف ہوں اللہ رب العزت آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

سب سے پہلے ڈاکٹر فیروز عالم کا ''بھاچپ'' پڑھا۔ اس کے بعد ''براہِ راست'' میں آپ کے تیکھے سوالات اور ڈاکٹر موصوف کے نہایت سادگی سے جوابات سے لطف اندوز ہوئی۔ اسی دوران افسانوں کا مطالعہ کیا۔ سارے کے سارے افسانے پسند آئے۔ لیکن یہ خط جو میں لکھنے بیٹھی ہوں ڈاکٹر صاحب کا مضمون ''ہوا کے دوش پر'' پڑھ کر لکھ رہی ہوں۔ جس کے مطالعے کے دوران تین جگہ میں اپنے آنسو نہیں روک سکی۔ فیروز عالم صاحب کا شمار میں اپنے پسندیدہ مصنفین میں کرتی ہوں۔ ان کی تحریر کا سادہ لیکن انتہائی جاذب انداز ہے۔ وہ کہانی لکھیں یا طبّی مضمون بے حد دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ویسے ہی وہ سادہ مزاج انسان ہیں۔ اگرچہ ان سے میری صرف ایک ملاقات ہے مگر ان سے ملنے کا ایک خوشگوار تاثر ابھی تک موجود ہے۔ میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں کہ وہ اپنی نئی کتاب مجھ کم حیثیت لکھاری کو عنایت کرنا نہیں بھولتے۔ وہ ایسے مصنف ہیں جو ادب کی دنیا کے جادوگر کہے جاسکتے ہیں۔ اپنی من موہنی تحریر سے ہنساتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں۔ حسین خواب دکھاتے ہیں اور نیند میں اڑا بھی دیتے ہیں۔ کئی جگہ قاری بے اختیار مسکرا اٹھتا ہے اور کئی جگہ آنسو ضبط نہیں کر پاتا۔ خداوند کریم انہیں تاحیات شاد و آباد رکھے۔ آمین

رینو بہل کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ خوبصورت افسانہ

عنایت کرنے پر۔ ابھی چہارسو میں پڑھنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ مگر فیروز عالم صاحب کے مضمون نے مجھے خاصا جذباتی بنا دیا ہے۔ مضمون ختم کرتے ہی لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔ یوں لکھنے کو بھی بہت کچھ باقی ہے۔

آپا جمیلہ شبنم کو آپ نے جس احترام اور محبت سے متعارف کرایا ہے وہ آپ کا کمال ہے۔ محترمہ کے قلم میں بڑی طاقت ہے۔ لفظوں میں حُسن ہے۔ خوب لکھتی ہیں اور خوبصورت لکھتی ہیں۔ میں ان سے متعدد بار درخواست کر چکی ہوں کہ مرحومہ ثریا جبیں کی زندگی اور فن پر بھرپور مضمون لکھیں لیکن محترمہ خود کو قلم کار ماننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ لکھنے کے علاوہ بے شمار خوبیوں کی مالک ہیں۔ شاید ایسے ہی نفیس لوگوں کے دم سے دنیا قائم ہے۔

عذرا اصغر (بہاولپور)

پیارے گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو نو بہ نو موضوعات کا علم بردار ہر بار خوش اطوار مطالعوں سے سرشار کرتا ہے۔ اب کے پروفیسر غضنفر کے متعلقات دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انڈیا میں اردو ادب کی اچھی خدمت ہو رہی ہے۔ پروفیسر غضنفر کی نثر اور شاعری نے متاثر کیا۔ زہریلا انسان متنوع واقعات سے مزین ہے۔ پڑھ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ خدا جانے آگے کیا ہو۔ احساسات اور تصورات کا یہ ''ملفوفہ'' یکسر منفرد ہے۔ اس سے پہلے ایسا قصہ نہ سنا نہ پڑھا۔ نامعلوم خانزادہ یہ عجائبات کہاں سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ ''پریم ناتھ کتھا'' دل کو لگی۔ دیپک کنول نے پریم ناتھ کی شخصیت کے جملہ پہلو بڑے خلوص سے اجاگر کیے ہیں۔ فلم بادل کا گانا ''میں راہی بھٹکنے والا ہوں کوئی کیا جانے متوالا ہوں'' دھومیں مچانے والا تھا۔ مدھو بالا گھوڑے پر سوار تھی۔ پریم ناتھ باگیں سنبھالے آگے آگے۔ پریم ناتھ کی موت بھی ہو گئی افسوس ہے ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ نامی گرامی مر گئے۔ دلیپ کمار کا جانے کیا حال ہے۔ کوئی اطلاع نہیں پرتھوی راج، دلیپ کمار، اشوک کمار، راج کپور، دیو آنند اپنا اپنا دبستان رکھنے والے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور بھی کئی ہیں جو اداکاری کے معیارات قائم کرتے رہے ہیں۔ پاکستان میں محمد علی، سنتوش کمار، علاؤ الدین سدھیر، طالش۔۔۔ پرانی یادیں آج بھی تازہ ہیں۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

مکرمی گلزار جاوید جی، تسلیمات۔

آپ کی ہمت ہے کہ بغیر اشتہارات اور زرِ سالانہ کے ۲۸ برسوں سے باقاعدگی سے زندگی کے ساتھ ساتھ ''چہارسو'' شائع کر رہے ہیں۔ میری خواہش ہوگی کہ ''چہارسو'' کی ترسیل نہ رُکے۔ یہ واحد جریدہ ہے جو اس وقت تک میری ٹیبل پر پڑا رہتا ہے جب تک اسے ''رس رابطے'' تک پڑھ نہیں لیتا۔ بعض جریدے تو میں نے خط لکھ کر بند کرا دیئے ہیں۔ انہیں لکھا کہ ''اپنا پرچہ اور ڈاک خرچ بچائیں''

تین شمارے (چہارسو کے) جنوری تا فروری، مارچ تا اپریل اور مئی تا جون ۲۰۱۹ء میری میز پر پڑے رہے۔ تینوں شمارے پڑھ کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کا انٹرویو، ان کی تحریریں، بھاچپ، دھنک کا آٹھواں رنگ پڑھ کر بہت زیادہ متاثر ہوا۔ جنوری فروری کے شمارے میں ان کی تحریر ''پہیا ٹائی ٹس'' بھی معلومات افزا تھی۔ اس قسم کے انٹرویو اور تحریریں انسان کی زندگی میں تبدیلی لاتی ہیں۔ میرا مطلب مثبت تبدیلی سے ہے۔

تنویر ظہور (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (مئی جون ۲۰۱۹ء) اپنی ادبی روایت کے مطابق نظر نواز ہوا جس نے ہر شمارے کی طرح متاثر کیا۔ گلزار بھائی بھی کمال کی شخصیت ہیں ایک سے ایک باکمال فنکار کو نکال کر لاتے ہیں۔ پروفیسر غضنفر کی تخلیقات اور اُن کے فن کے متعلق پڑھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے گہرے سوالات اور پروفیسر صاحب کے مطالعے سے پُر تفصیلی جوابات پڑھ کر جدید اردو ادب کے حوالے سے (ہندوستان میں) مفید معلومات کا اضافہ ہوا۔ آپ نے اُن کے ناول ''پانی'' دو یہ پانی اور کہانیوں کے متعلق اہم گفتگو کی۔ میں اُن کی اس بات سے متفق نہیں کہ:

''نیا پن پیدا کرنے کے لیے پرانی نسل سے ناتا توڑنا اور نئی نسل سے رشتہ جوڑنا بھی ضروری ہوتا ہے'' (ص:۱۳۔۱۴)

پروفیسر صاحب نے غزل، مثنوی، ناول نگاری، افسانہ نویسی، خاکہ نگاری، تحقیق و تنقید اور بچوں کا ادب کوئی میدان نہیں چھوڑا۔ ان کی کتابیں، ان پر لکھی گئیں کتب اور مقالات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی پر لکھے گئے خاکے ''جس کا رنگ، رنگ بہار ہے'' ایک صاحبِ مطالعہ ادیب ہی لکھ سکتا ہے۔ غضنفر صاحب نے کمال کا خاکہ لکھا ہے۔ اُن کا افسانہ ''خالد کا ختنہ'' ایک کرب ناک کہانی ہے کہ خوف نسلوں میں بھی منتقل ہوتا ہے۔ ہندوستانی افسانہ نگار کے یہ جملے ایک خوف کی مسلسل کیفیت اور سماجی رویے کو ظاہر کرتا ہے:

''آپ ہی تو ایک دن کہا تھا کہ جن کا ختنہ ہوتا ہے بدمعاش انہیں جان سے مار دیتے ہیں۔'' (ص:۴۴)

پھر پاکستانی رشتے دار ''خالو'' کا مکالمہ:

''اگر تم ختنہ نہیں کراؤ گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ تمہارا ختنہ نہ دیکھ کر تمہیں ختنہ والے بدمعاش مار ڈالیں گے۔'' (ص:۴۴)

ظلم کرنے والوں کا کوئی مذہب اور ذات نہیں مگر مذہب کا سہارا لے کر ظلم کرنا اپنا حق تصور کرتے ہیں۔ اقبال مجید نے ''کڑوا تیل'' کا زبردست تجزیہ کیا ہے۔ مہدی جعفر نے مختلف کہانیوں ''طلبے پر کھڑی عورت'' رمی کا جوکر، منگول بچہ، خالد کا ختنہ، پنڈولم، کڑوا تیل، تیزابی محبت کا بڑی باریک بینی، غیر جانب داری اور تنقیدی

اصولوں کے تحت جائزہ لیا ہے۔علی احمد فاطمی نے غضنفر کی دوستی، شخصیت اور فکر وفن پر دلچسپ مضمون تحریر کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا:

''آپ بہ آسانی آج کے عہد کا پورا انسان اور ہندوستان دیکھ سکتے ہیں''

شموئل احمد مسلسل اچھے، اہم اور حساس موضوعات پر جرأت مندی سے افسانے لکھ رہے ہیں ''ظہار'' میں مذہب، نیک سیرت بیوی، جنس، ملائیت اور تصوف کو بڑے متوازن اور رواں اسلوب میں پیش کیا ہے۔نیئر اقبال علوی ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔''گٹھڑی میں بندی بے بسی'' بڑا کرب ناک افسانہ ہے۔دو ایک جگہ تو جھرجھری آ جاتی ہے۔''بھوک'' انسان کو کیا کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔افسانے کے کردار ''رسولاں'' اور ''گاما'' نے جس زبان میں مکالمے ادا کیے ہیں اس زبان کو دیکھنا پڑے گا؟ ڈاکٹر فیاض احمد اور آغا گل کے افسانے بھی متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے ''دلیشے نیاسیس'' بیماری کے متعلق اس بیماری کا پس منظر، جراثیم کی افزائش، بیماری کی علامات، اس کی قسمیں، تشخیص اور بیماری کا علاج اتنے آسان اور تفصیل سے بیان کیا ہے جو ایک عام آدمی کے لیے بہت مفید ہے یہ بڑی خدمت ہے۔دیپک کنول نے پریم ناتھ کی کامیابی کی جدوجہد، کامیابی، سخاوت، بیوی سے محبت اور رومان سے پُر شخصیت کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یونس شرر صاحب نے ظفر قریشی کی مختصر کہانیوں کے تراجم ''آئینہ حیرت کدہ'' میں ایسا تعارف پیش کیا ہے جس سے کتاب پڑھنے کا تجسس پیدا ہو گیا ہے۔

آصف ثاقب، غالب عرفان، رؤف خیر، واصف حسین واصف، شاہین مفتی، عارف شفیق، مسعود تنہا کی غزلیں اپنے عہد کی ترجمان ہیں۔ابراہیم عدیل، فرح کامران، رومانہ رومی، ڈاکٹر نبیل احمد نبیل کی غزلوں کے اشعار میں ایک عجیب سی لپک ہے۔ناصر کاظمی تو سدا بہار شاعر ہے۔علی محمد فرشی، محمود شام، تسنیم کوثر اور وشال کھلر کی نظمیں دل کے قریب محسوس ہوئیں۔جملہ متعلقین کو آداب ونیاز۔

نوید سروش (میر پور خاص)

برادرم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

چہارسُو سے میرا تعلق کئی دہائیوں پر محیط ہے، تاہم گذشتہ چند ماہ سے آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے کچھ شماروں پر تبصرہ بھی نہ کر سکا اور نہ کوئی منظوم بھیج سکا۔ اس کے باوجود تازہ شمارے میں دسمبر ۲۰۱۸ء میں اپنی بھیجی ہوئی حمدِ باری تعالیٰ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے یاد رکھا۔اس کے بعد سے میں آپ کو کوئی تحریر روانہ نہیں کر سکا تھا، تاہم اس خط کے ساتھ اپنی ایک نعت شریف اور ایک غزل بھیج رہا ہوں۔

تازہ شمارے میں قرطاسِ اعزاز پروفیسر غضنفر کے نام ہے اور بہت خوب ہے۔ان کا نام میرے لیے قدرے غیر معروف سہی، جس کی وجہ ہندوستانی جرائد تک میری عدم رسائی ہے، تاہم چہارسُو کے ذریعے ان کا کام دیکھ کر حیرت ہوئی۔شاعری اور نثر میں انہوں نے خوب لکھا ہے۔ان کی طویل نعت شریف کا یہ شعر تو بہت ہی اچھا لگا:

ہر اک دیدے میں پتلی مضطرب پھرتی ہے رو رو کر
کہ مل جائے کسی صورت کوئی کونا محمد ﷺ کا

براہِ راست میں ان کے جواب جتنے بھرپور ہیں اتنے ہی آپ کے سوال بھی، جو کہ موصوف کی تحریروں کے گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیے گئے ہیں۔آغاز ہی میں انہوں نے وہبی اور کسبی سخن آرائی کا نازک سا فرق خوبصورتی کے ساتھ واضح کر دیا ہے اور کسی بھی تخلیق میں ان دونوں کے عمل دخل کی جو وضاحت کی ہے وہ ہر تخلیق کار کے دل کی آواز ہے۔انہوں نے ''آنکھ کی لکنت'' کی جو بلیغ اصطلاح اپنی شاعری میں برتی ہے اس انٹرویو میں اس حوالے سے بھی بہت خوب لکھا ہے۔گیان پیٹھ، این سی ای آر وغیرہ کے ایوارڈز کے بارے میں آپ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے جو کہا ہے کہ ''انعام کے لیے تخلیقات کے علاوہ بھی آپ کے پاس کچھ ہونا چاہیے جو اتفاق سے میرے پاس نہیں ہے۔۔۔'' تو یہ صورتِ حال ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہے، آپ اخبارات اور میڈیا کی چکاچوند میں رہ کر دیکھتے دیکھتے بڑے ادیب بن جاتے اور کئی کئی ایوارڈز کے حقدار (یا غاصب؟) بن جاتے ہیں جبکہ تاحیات ادبی خدمات کرتے رہنے مگر پی آر پر یقین نہ رکھنے والے تخلیق کار کسی گنتی میں نہیں آتے۔برادرم گلزار جاوید، شاید اس بات کا احساس بطور افسانہ نگار آپ کو بھی ہوگا کہ آپ نے بھی تخلیق کاری میں ایک عمر گزار دی، مگر۔۔۔۔

آج کل مطالعہ بہت سست روی سے ہو رہا ہے چہارسُو کے تازہ شمارے میں تاحال جو چند تخلیقات پڑھ سکا ہوں ان پر مختصر تبصرہ کر کے اجازت چاہوں گا۔''خالد کا ختنہ'' پروفیسر غضنفر کا ایک ایسا افسانہ ہے جو قاری کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور بظاہر ایک بچے کے ختنے کے موقع پر خوف کی کیفیت کے بیان کے بعد ہندوستان کی مخصوص صورتِ حال میں اس خوف کی اصل وجہ یہ سامنے آتی ہے کہ ''جن کا ختنہ ہوتا ہے بدمعاش انہیں جان سے مار دیتے ہیں''۔اس کے بعد افسانے کا اینٹی کلائمیکس پاکستان والے خالو کے اس جملے پر ہوتا ہے: ''خالد بیٹے، اگر تم ختنہ نہیں کراؤ گو تو جانتے ہو کیا ہوگا تمہارا ختنہ نہ دیکھ کر تمہیں ختنہ والے بدمعاش مار ڈالیں گے۔۔'' ان دو رویّوں میں ہندوستان اور پاکستان کی انتہا پسندی کی جس عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے شاید یہ عکاسی کسی اور افسانے میں تاحال میری نظروں سے نہیں گزری۔

جناب تابش خانزادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کے بیسویں قسط بھی بڑی دلچسپ تھی اور ہر قسط پڑھنے کے بعد اگلی قسط کا انتظار ہوتا ہے، ایک اچھے ناول کی یہی خوبی ہے اور تابش خانزادہ صاحب تاحال اسے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

..... ورق ورق کہانی کائنات .....

(اردو افسانے کا تانیثی چہرہ)

۔ جلد دوئم ۔

افسانہ ایسی باکمال صنف ہے جس کے اندر زندگی کے اسرار و رموز پنہاں ہیں اور جب کوئی افسانہ نگار ان رموز کو افسانے کا حصّہ بنا کر قرطاس پر پھیلاتا ہے تو پڑھنے والے زندگی کے اتنے سارے چہرے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ جیسے زندگی کی کوئی سرحد نہیں ہوتی ویسے ہی افسانہ بھی سرحدوں سے ماورا ہے۔ اس لیے افسانے کو سرحد کے دونوں طرف ہمیشہ اچھے لکھنے والے میسر آئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے جو افسانے پر اعتبار کی علامت ہے۔ اردو افسانے کے سفر میں جہاں مرد افسانہ نگاروں نے افسانے کو نئی جہتیں عطا کیں وہاں خواتین افسانہ نگاروں نے بھی افسانے کو ایک بلند معیار عطا کیا۔ تب جا کے اردو افسانہ ادبی جہانوں میں اپنی معراج کو پہنچا اور عالمی سطح پر اردو افسانے نے خود کو منوایا۔

خواتین افسانہ نگاروں کے حوالے سے اردو افسانے کا انتخاب بعنوان ''ورق ورق کہانی کائنات'' ایک قابلِ تحسین اقدام ہے جو میرے نزدیک موجودہ عہد کا افسانے کے اعتبار سے ایک بھرپور تانیثی جائزہ ہے۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کتاب میں افسانہ لکھنے والی تمام اہم خواتین افسانہ نگاروں کو نمائندگی دی گئی ہے جو سوشل میڈیا کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا میں بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں اور ان کے کام سے ایک سنجیدہ ادبی حلقہ واقفیت رکھتا ہے۔ مجھے اس تصنیف سے ذاتی طور پر بہت خوشی ہوئی ہے کہ خواتین افسانہ نگاروں کے کام کو یکجا کر کے انہیں اہمیت دی گئی ہے اور سرحدوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دونوں اطراف کی خواتین افسانہ نگاروں کے کام کو سراہا جا کر انہیں کتابی شکل دی گئی ہے۔ جس کے لیے میں ڈاکٹر عشرت ناہید صاحبہ کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

..... نیلم احمد بشیر

قیمت:۵۰۰، دستیابی: کتابی دنیا، گلی نواب مرزا، ترکمان گیٹ، دہلی، 110006۔

..... مرزا صاحباں .....

پیلوتوں لے کے ہُن توڑی گھٹ ودھ 65 شاعراں ایس کہانی نُوں لکھیا اے۔ ڈاکٹر حفیظ احمد ہوراں دی کھوج مطابق اوہناں کول 50 قصے موجود نیں۔ جیہناں وچوں کُجھ قلمی نسخے وی نیں۔ چوکھیاں شاعراں ایس کہانی نوں مرزے دی بجروچ ای لکھیا اے جیہڑی کہ واراں دی بجروی اے تے اصلوں ایہ کہانی وی اک وارای اے۔ سی حرفی، ڈیوڑھ، کبت بند، چومصرعے تے مثنوی وچ وی ایس داستان نُوں الیکیا گیا اے۔

جسراں سائیں داس حسرتؔ ہوراں اپنی کہانی نوں اک وکھرے انگ نال شروع کیتا اے اوسراں ای اوہناں ایس دا انجام وی اپنے ای انگ وچ کیتا اے میں ایس نوں محاوراتی، تشبیہاتی تے تلمیحاں نال بھری داستان آکھنا کہ اوہناں ایس وچ اپنی شعوری کوشش نال گل کیتی اے گل سفیاں دی ہووے یاں چٹھیاں دی مرزے نوں متیں دیون وی ہووے یاں جنجاں دے ڈھکن دی ہر تھاں تے سائیں ہوراں ہر منظر نوں جیوندا کر کے وکھایا اے اوہناں اپنے اکھراں دی ورتوں نال کہانی نُوں اک نواں رنگ دتا ہے۔ موصوف کیوں جے پنڈ دے وسنیک سن زبان نوں جان دے ای نہیں سن۔ اوہدی ورتوں تے وی دسترس رکھدے سن۔

سائیں داس ہوراں دی کہانی دا، اوہدے پتر منگل سنگھ ناگرا دے ہتھوں چھپنا ایس گل دی گواہی اے کہ پتر وی پیو وانگوں پنجابی زبان تے ادب نال پیار رکھدا اے چڑھدے پنجاب چوں آ کے لہندے پنجاب وچ کتاب نوں چھاپ کے وچ وٹ لئی نہیں سگوں سیوالئی دنیا وی اک وکھری داستان اے۔ ساڈے نقاد تے محقق ہن ایسی کہانی نوں کتھے کھلا ردے نیں ایس گل نوں سمے دے فیصلے تے چھڈ دے آں۔

.....ڈاکٹر احسان اللہ طاہر

دستیابی: فروغِ ادب اکادمی۔ لاہور، گوجرانوالہ، اسلام آباد۔

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی